سر سید فہمی

مطبوعہ کتب کا تنقیدی محاکمہ

ڈاکٹر مجاہد حسین

سر سیّد فہمی

مطبوعہ کتب کا تنقیدی محاکمہ

ڈاکٹر مجاہد حسین

ابواب بندی

بابِ اوّل

سر سیّد احمد خاں:
حیات و خدمات اور ان کے سوانح کے
حوالے سے کتب کا تنقیدی جائزہ

سوانح کا مطلب ہے حالاتِ زندگی یا سرگزشت جس میں اچھے برے ہر طرح کے واقعات شامل ہوتے ہیں کیوں کہ زندگی اچھے برے، نرم و گرم، تلخ و شریں واقعات سے عبارت ہے۔ سوانح نگاران واقعات کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور پرکشش ہوتی ہے۔ وہ عام طور پر ایسے کردار کا انتخاب کرتا ہے جس نے اپنی زندگی میں شہرت حاصل کی ہو اور کسی حد تک قدر و قیمت کا حامل بھی ہو۔ غیر معروف اور گم نام شخصیت کو بالعموم سوانح عمری کا موضوع نہیں بنایا جاتا ہے۔ سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ زندگی کے حالات و واقعات کو پرکھے اور حسنِ انتخاب کے ساتھ انھیں قارئین کے سامنے پیش کرے۔

جب کسی شخص کی زندگی کے حالات کوئی دوسرا شخص لکھتا ہے تو اسے سوانح اور جب کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات خود لکھے تو اسے خودنوشت کہتے ہیں۔ سوانح نگار حقائق کو فن کارانہ انداز اور دل کش پیرائے میں بیان کرنے کی بساط بھر کوشش میں رہتا ہے۔ شاعر، مصور یا نقاش کی طرح تخیل سے کام لینے کی آزادی ایک سوانح نگار کو حاصل نہیں ہوتی۔ وہ دستیاب مواد کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شخصیت کے خد و خال پوری طرح ظاہر ہو جاتے ہیں۔ سوانح نگار صرف صاحب سوانح کے اعمال و افعال اور اس کے متعلق جو بھی باتیں ہوتی ہیں بیان کرتا ہے۔ روزنامچوں، یادداشتوں، مکاتیب، سفرناموں وغیرہ کا شمار خودنوشت سوانح عمری کے خام مواد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن سوانحی اصول کے اعتبار سے انھیں سوانح عمری کے ذیل میں شمار نہیں کیا جاسکتا مگر ان کی مدد سے سوانح عمری لکھی جاسکتی ہے۔ سوانح عمری کو تاریخ کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم دیانت داری کے ساتھ کسی فرد کی زندگی کے واقعات، حادثات اور مسائل کو پوری تفصیل کے ساتھ خوب صورت اور دل کش انداز میں، مواد کے اہم ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ایک خاص اسلوب میں پیش کرنا سوانح ہے۔

قوموں اور حکومتوں کا عروج و زوال یا افراد کی فتح و شکست تاریخ کا مسلسل عمل ہے۔ مغل حکم رانوں نے بھی سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے لے کر انیسویں صدی

کے نصف اول تک اپنے شاہانہ جاہ جلال، شان وشوکت اور عظمت کو کسی نہ کسی صورت قائم رکھا اور اس کے بعد قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے لیکن ان کی یہ سیاسی ہزیمت ان کی اعلیٰ تہذیبی اقدار اور روایات کو پامال نہ کرسکی۔ جو ہند ایرانی تہذیب کے اختتام کے نتیجے میں ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ بساطِ سیاست پر مات کے باوجود ان کے علوم وفنون کی قدر و قیمت کم نہ ہوسکی۔ یہ وہی تہذیب تھی جس میں سر سید نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔

سر سید کی سوانح پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ بیس کے لگ بھگ مشہور کتب راقم کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ سر سید کی پیدائش کے وقت دہلی میں اکبر شاہ ثانی حکمران تھا لیکن اس کی حکومت لال قلعہ تک محدود تھی۔ سلطنت کی معاشی صورتِ حال روز بہ روز خراب ہوتی جارہی تھی اور یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ حکومت کی اصل طاقت کہیں اور منتقل ہوچکی ہے۔ اس زمانے میں مغربی تہذیب کے زیر اثر جو تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں ان کے نتیجے میں قدیم اور جدید افکار و اقدار کی کش مکش بھی اپنے عروج پر تھی۔ تغیر و انقلاب کی ان علامتوں نے زندگی کے ہر شعبے کو بھی متاثر کیا تھا اور انتشار میں بھی مبتلا کردیا تھا لیکن جس طرح اندلس میں طوائف الملوکی کے زمانے میں فنونِ لطیفہ کو عروج حاصل ہوا بالکل اسی طرح دہلی بھی اس رنگ میں رنگ گیا۔ اس عہد میں علم وادب اور دیگر فنون کو جو عروج حاصل ہوا ان کی داستان بہت سی تاریخوں میں مل جاتی ہے۔ خود سر سید نے جو تاریخ کا ایک واضح اور سائنسی اندازِ فکر رکھتے تھے اور حقائق کی جستجو اور دریافت میں جذبات، مفروضات اور مبالغے سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتے تھے، آثار الصنادید کے چوتھے باب میں عہدِ مغلیہ کے آخری تاج داروں کی مختلف علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے لیے کی گئی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

سر سید کی ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی سر سید کے خاندان کا شمار اس وقت کے ممتاز خاندانوں میں ہوتا تھا اور حسب ونسب کی وجہ سے بھی یہ خاندان معزز ومحترم سمجھا جاتا تھا۔ سر سید کا شجرہ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت امام حسینؓ کے ساتھ

جاملتا ہے۔ سرسید کے آباؤ اجداد اگرچہ عرب کے باشندے تھے لیکن بعد میں ہرات اور پھر ہرات سے ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے۔ یہ اکبر اعظم کا دور تھا۔ تقریباً اڑھائی سو سال تک سرسید کے اسلاف نے مغلیہ حکومت کے لیے خدمات سرانجام دیں اور اس کا ہر دربار سے کسی نہ کسی نوع کا تعلق رہا۔ سید ہادی کو جو سرسید کے دادا تھے ۱۷۵۴ء میں شاہ عالم گیر ثانی نے جوادعلی خاں کا خطاب دیا۔ بعدازاں شاہ عالم نے انھیں مزید خطابات سے نوازا اور قاضی لشکر اور عہدۂ احتساب کا فریضہ بھی ان کے سپرد کیا۔ سید ہادی کے بیٹے سرسید کے والد تھے۔ سید متقی اور بادشاہ کے روابط کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سید متقی کو بادشاہ کی خواب گاہ میں بلا روک ٹوک کے آنے جانے کی اجازت تھی۔ بادشاہ انھیں بھائی متقی کہہ کر بلاتا تھا۔ درویش صفت اور صوفی منش ہونے کے باعث سید متقی کو امورِ مملکت سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ انھوں نے خانقاہِ مظہری کے مشہور بزرگ شاہ غلام علی سے بیعت تھی۔ چناں چہ سرسید کی رسمِ بسم اللہ شاہ صاحب نے کرائی تھی۔ سرسید کا بچپن ان کے ننھیال، ان کے خاندانی اثر و رسوخ کے علاقوں اور شاہ غلام علی کی صحبت میں بسر ہوا۔ حضرت شاہ غلام علی کی صحبت کا اثر سرسید کے قلب و ذہن پر آخر دم تک قائم رہا۔ سرسید کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جب کبھی ان کے سامنے حضرت صاحب کا ذکر چھیڑ دیا جاتا تو وہ بھی اس ذکر میں شامل ہو جاتے۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا۔

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد ایک مشہور عالم تھے اور خاص طور پر علمِ ریاضی میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ ان کے کتب خانہ سے سرسید نے بھرپور استفادہ کیا۔ خواجہ صاحب کو مغلیہ حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ انھوں نے دونوں کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ سرسید کی تربیت ان کے نانا اور ان کی والدہ دونوں نے کی۔ سرسید کی والدہ عزیز النساء بیگم دوراندیش اور دردمند دل رکھنے والی خاتون تھیں۔ ان کے زیر سایہ سرسید نے کامل تربیت حاصل کی۔ عنفوانِ شباب ہی میں والد کا سایہ سرسید کے سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کی تربیت نے ہی سرسید کو

اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے تلخ حقائق سے دوچار ہونے کا ڈھنگ سکھا دیا۔
سیرتِ فریدیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے فکر و عمل پر ان کی والدہ کا کس حد تک اثر تھا سرسید نے علوم متداولہ حاصل کیے۔ اگرچہ وہ ان علوم میں کامل دست رس نہیں رکھتے تھے مگر انھیں دہلی کے علما کی صحبت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ اپنی خاندانی وجاہت کے سبب دہلی کے اعلیٰ طبقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اگرچہ بہادر شاہ ظفر کی سلطنت قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لیکن اس کے دربار سے وابستہ شعرا میں مرزا اسداللہ خاں غالب جیسے نابغۂ روزگار شاعر موجود تھے جو قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے جن کی ہم سری کرنے والا شاہ جہان اور جہانگیر کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ قلعے سے باہر اہلِ کمال میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز سے فیض یافتہ اور ان کے خاندان کے لوگ موجود تھے جو دین کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔ اگرچہ اہلِ سیف کم یاب ہو گئے تھے لیکن علم و ادب کا میدان سج گیا تھا۔ ان باکمال شخصیات کے سرخیل سر سیّد احمد خاں تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کی تعمیری شخصیت اور ان کی مزاج استواری میں ہندوستان کی فضا کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

۱۸۳۶ء میں جب سرسید احمد خاں کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت سرسید کی عمر ۱۹ سال تھی۔ مغل سلطنت کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر نے سرسید کے دادا کے تمام خطابات سے سرسید کو نواز دیا۔ مزید برآں "عارف جنگ" کا خطاب بھی عنایت کر دیا۔ یہ صورتِ حال اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ سرسید کے مغل بادشاہ سے خوش گوار تعلقات تھے لیکن سرسید نے جلد ہی ہوا کا رخ بھانپ لیا تھا اور اپنی بصیرت اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے عزیز و اقارب کی مخالفت کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کے اس رویے کے باعث ان کے گھر کی ایک بڑی بوڑھی نے مرتے دم تک سرسید کی صورت دیکھنا گوارا نہ کی۔

سرسید نے اپنی عملی زندگی کا آغاز دہلی کے صدر امین کے دفتر میں سررشتہ دار کی حیثیت سے کیا۔ ۱۸۳۹ء میں ان کا تبادلہ نائب منشی کی حیثیت سے آگرہ ہو گیا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں فتح پور سیکری میں جو اپنے آثارِ عتیق کے لیے مشہور تھا اور اکبر کا دارالخلافہ بھی تھا، ایک سال تک کے لیے نائب جج ہو کر گئے۔ ملازمت کی ابتدا ہی سے سرسید نے اپنے علمی کاموں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں سر رابرٹ کا خط ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں لوگوں کا تعارف کراتا پھروں لیکن حاملِ رقعہ ملازمت کے لیے حصولِ علم میں لگا رہا۔ آپ اس کی محنت کا اندازہ اس کے اس مسودے سے کریں گے جو اس نے قوانین کی تشریح میں لکھا ہے۔ یہ ایک اچھے خاندان کا فرد ہے اور میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اس کو ایک جگہ دے دی جائے جس کا یہ مستحق ہے۔ مہربانی ہوگی اگر آپ اس کے لیے کچھ کریں۔ یہ بزدل تو ہے لیکن ہوشیار بھی ہے۔ اسے سید احمد کہتے ہیں۔ یہ وہ عہد تھا جس میں سب ججی کا منصب کسی ہندوستانی کے لیے بامِ عروج تک پہنچنے کے مترادف تھا۔ دورانِ ملازمت انھوں نے فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جب ان کی مشہور تصنیف آثارالصنادید ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اسے تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا۔ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ اس کارنامے پر انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا ''فیلو'' منتخب کر لیا گیا۔ اس سلسلہ میں سوسائٹی کے ناظم نے اپنے خیالات کا اظہار ایک خط میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی میٹنگ میں جو کہ ۴ جولائی کو منعقد ہوئی تھی اس میں متفقہ طور پر آپ کو سوسائٹی کا اعزازی فیلو بنایا گیا ہے۔ آپ کی ممبر شپ کا ڈپلومہ جلد ہی پہلی فرصت میں آپ کے پاس روانہ کیا جائے گا۔ اس موقع پر مبارک باد دیتے ہوئے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی آثار قدیمہ سے متعلق آپ نے جو تحقیقی کام کیا ہے اسے بڑی تحسین کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ اس ملک میں اور اس ملک سے باہر بھی۔

ملازمت کے دوران سرسید نے سرکشی ضلع بجنور، اسباب بغاوتِ ہند، قول متین در

ابطال حرکتِ زمین، تحفۂ حسن، احکامِ طعام اہلِ کتاب، تبیین الکلام، تسہیل فی جر الثقیل، جامِ جم اور دیگر تصنیف و تالیفات کیں۔ اسی دوران انھوں نے آئینِ اکبری کا مشہور ایڈیشن شائع کیا اور تاریخ فیروز شاہی اور تزکِ جہانگیری کی تصحیح و تدوین کی۔

سرسید کے ہاں علمی شغف اور انسان دوستی مسلم ہے۔ اس حوالے سے الطاف حسین حالی نے ایک واقعہ قلم بند کیا ہے کہ سازم نامی ایک یہودی جو یمن کا باشندہ تھا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لیے پھرا ہوں کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا کہ تنخواہ کتنی لوگے تو اس نے دس یا پندرہ کہے۔ سرسید نے کہا، میں تمھیں پچیس روپے ماہ وار دوں گا۔ مجھے عبرانی سکھا دو۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اس نے خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی ڈاڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اس کو نوکر رکھ لیا مگر چوں کہ وہ آوارہ مزاج تھا، اس لیے بہ قدر ضرورت دیتے رہے اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے جب وہ وطن کو جانے لگا تو الگ کر کے جمع کیے ہوئے پیسوں کا حساب کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کرنے کے سرسید کو کئی فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اس سے اہلِ فرنگ کی تہذیب کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا جس سے انھوں نے بعد میں بڑے بڑے کام لیے۔ دوسرا یہ کہ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن اور آئینِ اکبری کے حوالے سے یہی بصیرت ملی جس کے نتیجے میں سائنٹیفک نقطۂ نظر کا حصول ممکن ہوا۔ آئینِ اکبری میں انھوں نے مغربی آدابِ تحقیق کو مکمل طور پر استعمال کیا جسے انگریزوں کے زیرِ اثر کہا جا سکتا ہے۔ تیسرا اسباب بغاوتِ ہند اور اس کے بعد دیگر تصنیف میں جو حقیقت پسندی دکھائی دیتی ہے وہ بھی اسی ملازمت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ چوتھے، سرسید کے ہاں مشرقی علوم کی کم مائیگی کا جو شکوہ ملتا ہے وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے اور پانچویں یہ کہ غدر کے بعد جب سرسید ہمارے سامنے ایک قومی راہ نما کی حیثیت سے آتے ہیں تو اس میں بھی مغربی اثرات کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے تمدنی، سیاسی اور سماجی زوال کا وہ سفر ختم ہو جاتا ہے جس کا آغاز عہدِ اورنگ زیب عالم گیر کے آخر میں ہوا اور انجامِ کار اس تاریخی واقعے پر ہوا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا، قوم پرستوں نے آزادی کی جدوجہد اور سر سید نے فوجی بغاوت کا نام دیا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے جانشینِ اول سے بہادر شاہ تک کا عہد انحطاط اور زوال کا عہد جانا جاتا ہے، اس کے اثرات زندگی کے تمام تر شعبوں پر دکھائی دیتے ہیں، کسی پر زیادہ تو کسی پر کچھ کم۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے ہندوستانی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس وقت سر سید بجنور میں موجود تھے۔ اس واقعے نے بہت سے بے گناہ خاندانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹ دیا مزید کئی ایک کو مٹ دینا چاہا تو سر سید نے مداخلت کی۔ اس طرح وہ محفوظ رہے۔ جب بجنور کے کلکٹر نے سر سید کی خدمات کے اعتراف میں باغی امرا میں سے ایک کی ضبط شدہ جائیداد جس کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ تھی سر سید کو دینے کی سفارش کی تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک چیز جو ان کے کسی ہم وطن کی ملکیت تھی اسے ان کا ضمیر قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ان کا مزاج، حالات کی ابتری اور اپنے ہم کیشوں کی پستی اور بدحالی دیکھ کر مکدر ہو گیا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر انھوں نے مصر کی جانب ہجرت کا ارادہ کر لیا لیکن ملک وقوم کی محبت نے انھیں پابہ زنجیر کر دیا اور انھیں اس ہجرت سے باز رکھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے انھیں ہم وطنوں کو اس سخت مصیبت اور آزمائش کے وقت میں تنہا چھوڑنے نہ دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی عیش وعشرت کی زندگی کو قربان کر دیا اور مسلمانانِ ہند کی اصلاحِ احوال کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے اسبابِ بغاوتِ ہند، لائل محمڈنز آف انڈیا، تبیین الکلام، سائنٹیفک سوسائٹی اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کا سہارا لیا۔

سر سید نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور قیام کے دوران ایک علمی مجلس ''سائنٹیفک سوسائٹی'' کے قیام کا خاکہ تیار کیا۔ اس کام میں ان کے ایک انگریز دوست کرنل

جی۔ ایف۔ آئی گراہم نے ان کی معاونت کی۔اس سوسائٹی نے انگریزی زبان کی مشہور علمی اور تاریخی کتابوں کا ترجمہ کر کے اہلِ ہند کو نئے خیالات سے آشنا کیا اور اس انجمن کے ذریعے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں باہمی ارتباط کی فضا تیار کی۔اس مقصد میں سر سید بڑی حد تک کامیاب رہے کیوں کہ ان کی کاوشوں سے مشرق و مغرب میں ہم آہنگی کا عمل تیز ہوا اور مشرقی علوم کے مردہ جسم میں نئی روح دوڑ گئی۔مختلف علوم و فنون کی کتب کی اشاعت سے اہلِ ہند کے ذہنی دریچے وا ہونے لگے۔صرف یہی نہیں بل کہ اس وسیلے سے قوم کے جوہرِ قابل کی تربیت ہوئی۔

سر سید نے ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی ایک شاخ قائم کی جس کا مقصد اس کے ارکان کا انگلستان کی پارلیمنٹ سے رابطہ کرانا اور اس سے شناسائی پیدا کرنا تھا تا کہ وہ طرفین کے حالات و واقعات اور دیگر امور سے آگاہ رہ سکیں۔اس طرح سے اہلِ ہند کی بہت سی شکایات کا ازالہ ممکن ہوا۔اسی سوسائٹی کے ذریعے ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش ہوئی۔یہ دیکھ کر کانگریس کی جانب سے بنارس اور الہ آباد میں اردو زبان کی مخالفت کا آغاز ہو گیا جس نے سر سید کو رومانیت کی خیالی دنیا سے نکال کر تلخ حقائق کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے اپنے پرانے نظریے سے دست بردار ہو گئے اور وہ ایسے اقدامات کرنے پر مجبور ہو گئے جن سے مسلمانانِ ہند کے حقوق کی پاسبانی کی جا سکے۔

سر سید بھی بنارس میں تھے کہ سید محمود کو ولایت جانے کے لیے وظیفہ مل گیا۔اس طرح سر سید کو بھی ولایت جانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ولایت جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے سید محمود، سید حامد، مرزا خداداد بیگ اور چھجو عازمِ سفر ہوئے اور انگلستان پہنچ گئے۔سر سید کے سفرِ انگلستان کا مقصد ذاتی طور پر انگریزوں کے طور طریقوں، رسوم و رواج اور عادت، اخلاق و خصائل اور علمی و سیاسی معاملات کا جائزہ لینا تھا تا کہ سر ولیم میور کی لائف آف محمد کا تسلی بخش جواب دے سکیں۔سر سید نے لندن میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں کئی ماہ تک

تحقیق کی اور کتب کی ورق گردانی بھی کی۔ مصر، فرانس اور جرمنی سے عربی کتب منگوائیں، لاطینی اور انگریزی کی نایاب کتب حاصل کیں، محسن الملک سے آیات واحادیث کے سلسلے میں استفسارات کیے اور شبانہ روز ان تھک محنت کے بعد خطباتِ احمدیہ کا مسودہ تیار کیا اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اس کتاب کی تیاری میں سرسید پر جو کیفیت طاری تھی اس کا اندازہ محسن الملک کے نام اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جس میں سرسید لکھتے ہیں کہ ان دنوں میں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آپ ﷺ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کے تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ جواب میں کتاب لکھ دی جائے اور میور صاحب کے سوالات کا جواب دے دیا جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاوے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے نبی محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر ہو۔ ایک اور خط میں محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ مواعظِ احمدیہ (خطباتِ احمدیہ) کے لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد ظہور حسین کے پاس جایئے اور یہ میری درخواست ہے کہ دونوں صاحب مل کر کسی مہاجر سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔ مگر چوں کہ میں یہاں ہوں اس لیے کچھ بندوبست نہیں کر سکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دہلی خط لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظرف سے کچھ فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو انگلستان میں سرسید کا وقت خاصا مصروف گزرا۔ روزانہ انگریز علما کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور ان سے شناسائی پیدا کرتے۔ یہاں ان کی ملاقات کارلائل سے ہوئی تو ان سے ان کی کتاب اور سرسید کی خطباتِ احمدیہ کے بارے میں گفت گو ہوئی جس کا ذکر گراہم نے سرسید کی سوانح حیات میں کیا ہے۔ انگلستان میں ہی سرسید نے مدرسۃ العلوم کا خاکہ تیار کیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی

اصلاحِ احوال کے لیے تہذیب الاخلاق کے اجرا کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے اس معاملے پر بھی غور کیا کہ کس طرح مسلمانوں کے دلوں سے جدید علوم کے حصول کے حوالے سے پیدا ہونے والے منفی رجحان کو تبدیل کیا جائے؟

سرسید نے اپنے سفرِ انگلستان کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں قسط وار شائع ہوا۔ ان کا یہ سفر ان کی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جس کے سبب انھیں تہذیبِ انسانی کے نئے پہلوؤں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ۱۸۷۰ء کے اواخر میں سرسید ہندوستان واپس آئے تو اپنے تصورات کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ چناں چہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو انھوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ یہ رسالہ جلد ہی مسلمانانِ ہند میں مقبول ہو گیا اور مسلمانوں میں ایک نئی تحریک پیدا کر دی۔

رسالہ تہذیب الاخلاق کے جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں روشن خیالی کو فروغ دیا جائے اور انھیں علم و معرفت کے حصول کے لیے ترغیب دی جائے۔ اس رسالہ میں مذہبی، اجتماعی اور علمی مباحث پر مضامین شائع ہوئے۔ سرسید، محسن الملک، فرقلیط باللہ، وقار الملک اور مولوی چراغ علی نے پوری آزادی کے ساتھ اس میں مضامین لکھے۔ اس رسالہ نے مخالفین و موافقین دونوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ موافقین کی بہ نسبت اس رسالہ کے مخالفین کی تعداد زیادہ تھی۔ مخالفت میں بہت سے اخبارات میں مضامین شائع ہوئے اور بعض اخبارات صرف تہذیب الاخلاق کی مخالفت میں نکالے گئے جن میں لوحِ محفوظ، تیرھویں صدی، اشاعتِ السنہ اور کان پور کے نور الآفاق اور نور الانوار جیسے رسائل و جرائد بہت زیادہ شہرت کے حامل ہیں۔

کان پور میں حاجی عبدالرحمان خان، مالک مطبع نظامی کو مسلمانوں کا پیشوا سمجھا جاتا تھا۔ یہ مطبع اس عہد میں عروج پر تھا۔ اس میں متعدد علما ملازم تھے جو مشرقی علوم سے بہرہ ور تھے۔ حاجی صاحب نے کان پور سے مذکورہ بالا دونوں رسائل تہذیب الاخلاق کی مخالفت میں مطبع نظامی سے جاری کروائے۔

جس روز تہذیب الاخلاق شائع ہو کر آتا اس دن صبح سویرے مسلمان مطبع میں جمع ہو جاتے اور ایک بڑا کمرا شائقین سے بھر جاتا۔ ڈاکیے کے انتظار میں کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔ جب خدا خدا کر کے ڈاکیا دکھائی دے جاتا تو ایک نعرۂ مستانہ بلند ہوتا؛ وہ آگیا، وہ آگیا۔ مولوی امداد علی تہذیب الاخلاق کو اپنے ہاتھ سے کھولتے۔ سب سے پہلے عنوان پڑھتے جس کے ساتھ ہی نامہ نگاران کو خطابات ملنا شروع ہو جاتے۔ ان میں سے کوئی ملحد بنتا تو کوئی کافر اور کوئی ملعون ٹھہرتا۔ سرسید صاحب کے خطابات میں زندیق، شیطان، کرستان اور نیچری شامل ہوتے تھے۔ ان سب حاضرین میں عبدالرحمان خان صاحب کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور اس میں غیض و غضب کا اظہار کیا جاتا۔ بعض اوقات تو خان صاحب آستین چڑھالیا کرتے لیکن اس طرح کی مخالفت کے باوجود تہذیب الاخلاق کا حلقۂ اثر روز بہ روز وسیع ہوتا چلا گیا۔ یہ رسالہ جن حلقوں میں مقبول ہوا وہی زندگی کے دھارے موڑنے کا ہنر جانتے تھے۔

تہذیب الاخلاق کی مقبولیت کا اس بات سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں اس کے مضامین کی ندرت نے مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا وہاں یہ ہندوؤں میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوا۔ ہندوؤں میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ لالہ لاجپت رائے کے والد اپنے بیٹے کو یہ رسالہ تحفۃً دیا کرتے تھے۔

عوام کے اذہان وقلوب پر جتنے ہمہ گیر اثرات اس نے ثبت کیے ویسے اثرات ہندوستان سے شائع ہونے والے کسی اور رسالے نے ہندوستانی معاشرے پر مرتب نہیں کیے۔ اس رسالے کے اجرا کے ساتھ ہی جدید اردو ادب کی تاریخ کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کی بدولت اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا یہاں تک کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ممکن ہوا۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی مسلمان ادیب ہو جو تہذیب الاخلاق سے متاثر نہ ہوا ہو۔

لوگوں نے زوال وانحطاط کے اس دور میں مسلمانانِ ہند کی دینی، روحانی اور کسی حد تک مادی اصلاح کے لیے کوششیں کیں ان میں سرِ فہرست شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام

ہے۔کم وبیش ایک صدی تک شاہ صاحب اوران کے فرزندوں نے مسلمانانِ ہند کی اصلاح کا فریضہ خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا۔

.نیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سرسیّد احمد خاں اس سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جن کی اصلاحی کاوشوں کا مرکز ومحور تزکیہ نفس ،ایمان وعقائد کی درستی اورترکِ بدعت ورسوم تھا۔رفتہ رفتہ ان کے مضامین کے موضوعات کادائرہ اخلاق ومعاشرت،سیاست،معیشت،علوم وفنون اورادب وصحافت پر محیط ہوگیا۔

آلِ احمد سرور رقم طراز ہیں:

''سرسید نے اردو دان طبقے کوعموماًاور مسلمانوں کوخصوصاًجمود سے حرکت کی طرف،تنگ نظری سے وسعتِ نظر کی طرف،داخلی کیفیت سے خارجی واردات کی طرف،عالم اسلام سے مغرب کی طرف،تقلیدی علوم سے علوم جدیدہ کی طرف،حافظے کے ایجاز سے ذہن کی براقی اور جولانی کی طرف ورشرح وتفسیر اور توجیہ وتاویل سے تجزیہ واستدلال اور بحث ونظر کی طرف مائل کیا۔''[1]

۲۶دسمبر ۱۸۷۰ء کوسرسید نے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان بنائی۔جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا نواب محسن الملک کا کہنا ہے کہ اس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا تھا۔رات کوسرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔دو بجے کے قریب جو میری آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کوان کے پلنگ پر نہ پایا۔میں ان کو دیکھنے کو کمرا سے باہر نکلا۔دیکھتا کیا ہوں برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زاروقطار روتے جاتے ہیں۔میں نے گھبرا کر پوچھا کہ خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے یہ سن کراور زیادہ رونے لگےاور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید

نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی کہ دیکھیے کل کے جلسے کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں رینگتی ہے یا نہیں۔ نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کرسکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس بات کو دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں رواج نہیں پائے اور جب ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرے۔ اس کمیٹی نے سوانح پر مضامین لکھوائے۔ اس سلسلے میں بتیس (۳۲) مضامین موصول ہوئے جو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کمیٹی کے ساتھ ایک اور کمیٹی خزانۃ البضاعۃ التاسیس مدرسۃ المسلمین کی تشکیل ہوئی۔ سرسید کو اپنے مقصد اور اپنے خلوص پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ اپنے کسی کام کے لیے ارباب اقتدار سے معاونت کے طلب گار نہ ہوتے تھے۔ ان کا مطمعِ نظر یہ تھا کہ ضروری اصلاحات کا ذریعہ خود عوام ہوتے ہیں۔ لہٰذا مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کام انھوں نے خود اٹھایا اور نہایت ذوق وشوق سے اس سلسلے میں ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا اور سفر کے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کیے۔ بالآخر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ سرسید نے تعلیم کے ساتھ تربیت کا خواب بھی دیکھا تھا اس لیے مدرسۃ العلوم کے ساتھ دارالاقامہ بھی قائم ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ہندوستان بورڈنگ ہاؤس کی اہمیت سے ناواقف تھا اس مدرسے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو بھی داخلہ دیا گیا اور انھیں بھی ایسی ہی توجہ میسر آتی اور ان کے ساتھ بھی وہی توجہ روا رکھی گئی جس قدر

مسلمانوں کے لیے تھی۔ مدرستہ العلوم میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں قواعد کی پابندی کرنا پڑتی تھی اور دونوں میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ چناں چہ سرسید نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک سی تعلیم پاتے ہیں کالج کے تمام حقوق جو اس شخص کے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص کے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کے ساتھ بطور بورڈ کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ ایک اور موقعے پر سرسید نے کہا تھا کہ ہم لوگ آپس میں بھلے کسی کو ہندو اور کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ غیر ملکوں میں جب ہم لوگ جاتے ہیں تو ہندو در مسلمانوں کے نام سے نہیں پکارے جاتے ہیں۔ نیک دل لوگوں سے نیٹو یعنی ہندوستانی کا اور تنگ دل لوگوں کا نیگرو یعنی کالے منہ یا وحشی ہندوستانی کا لقب دونوں کو برابر ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں، ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا۔

۱۸۷۶ء میں سرسید ملازمت سے سبک دوش ہوئے اور علی گڑھ آ کر اپنا زیادہ وقت مدرستہ العلوم کے کاموں، گزٹ کی دیکھ بھال نیز تفسیر القرآن لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے انھیں وائسرائے کی کونسل کا ممبر نامزد کیا۔ غدر کے فوراً بعد سرسید نے ہندوستانیوں کی کونسل میں نمائندگی کی مانگ کی۔

لارڈ رپن نے سر سید کی معیاد ممبری میں مزید دو سال کی توسیع کر دی۔ انھوں نے اپنی زمانہ ممبری میں عوام کی فلاح و بہبود کے ہر معاملے میں نہایت دل چسپی لی۔ وہ کونسل کے بہت سرگرم رکن تھے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون، قانون تقرر قاضیان وغیرہ سر سید کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کونسل میں البرٹ بل، قانون مزارعان دکن، قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ فوج داری وغیرہ پر سر سید کی تقریریں حق گوئی و بے باکی اور جرأت کردار کی بہترین مثال ہے۔ ان تقریروں سے ان کی آزاد خیالی اور حب وطن کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کے حامی نہیں تھے بل کہ ہندوستان کی مختلف انواع سیاسی حالت کا انھیں صحیح اندازہ تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس کی بنیاد ۱۸۸۶ء میں پڑی، جو سر سید کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں روشن ضمیری اور روشن فکری کے آثار پیدا کیے۔ اس کانفرنس کا مسلک یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کے نمائندوں کی مشترکہ میٹنگ ہو اور اس میں مسلمانوں کے مسائل پر اظہار رائے ہو اور ان کے فلاح و بہبود کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی نہایت عظیم خدمات انجام دی۔ ایک اور اہم کام سر سید نے یہ کیا کہ ۱۸۸۶ء میں یعنی نیشنل کانگریس کے قیام کے ایک سال بعد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی حالت اس وقت تسلی بخش تھی لیکن ظاہر ہے کہ صرف ایک کالج قوم کی تعلیمی ضروریات پوری نہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ چھ کروڑ مسلمانوں کو جو مختلف صوبوں، مختلف ضلعوں میں پھیلے ہوئے تھے بیدار کرنے اور تعلیم کا شوق دلوانے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے قوم کا رونا رویا جائے اور حصول تعلیم پر زور دیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں کئی لحاظ سے ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کالج سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ مختلف اور دور دراز مقامات پر جہاں سے شاید علی گڑھ کالج میں صرف دو یا تین طلب تعلیم کے لیے آتے تھے۔ اس کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے، ان میں شبلی اور

حالی اپنی نظمیں پڑھتے اور مولانا نذیر احمد، نواب محسن الملک اور خواجہ غلام الثقلین درس دیتے اور وہاں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ اگر چہ حقیقت ہے کہ جدید اُردو شاعری نے لاہور میں جنم لیا لیکن اسے اپنی نشو و نما کے لیے علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ نئے انداز اور جدید اسلوب کی نظمیں اسی شہر کے ادبی ماحول کی پیداوار ہیں۔ پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اس اندازِ کلام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اُردو خطابت کی تربیت گاہ دراصل یہی کانفرنس ہے۔

نڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے تین سال بعد تک سرسید نے کانگریس کے اعمال وافکار کا غائر مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جماعت خاص طور پر شمالی ہند کے لوگوں کے لیے سخت نقصان دہ ہے جو تعلیم میں بنگالیوں وغیرہ سے بہت پیچھے ہیں۔ اس جماعت کے ساتھ شریک ہونے میں بھلائی کی نسبت زیاں کا اندیشہ زیادہ ہے۔ چناں چہ انھوں نے ان خطرات سے جو اس جماعت سے اشتراک کرنے میں تھا، آگاہ کیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت تو اور بھی خراب تھی، وہ شمالی ہند کے ہندوؤں کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہم خیالوں کو ان مضرات سے آگاہ کیا اور یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ مسلمان جو دیگر معاملات میں ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، اُن امور میں ان کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے کانگریس کی تحریک سے علاحدگی اختیار کرنے میں آمادہ ہوئے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہیے، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ اس تعلیم کے بغیر مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بل کہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ ہندو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ سرسید نے کانگریس کی مخالفت انگریزوں کو خوش کرنے اور مدرستہ العلوم کے پرنسپل مسٹر بیک کی تجویز پر کی۔ یہ بات سید طفیل احمد کے دماغ کی اختراع ہے لیکن اگر ہم حالات کا منصفانہ جائزہ لیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ طفیل احمد کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہاں

تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ یہاں شیخ عبداللہ بانی ویمن کالج مسلم یونی ورسٹی کی سرسید سے گفتگو کا اقتباس دینا بھی مناسب ہوگا۔ سرسید نے شیخ صاحب سے کہا کہ کانگریس سے جو میری مخالفت ہے، وہ میرے سچے خیالات پر مبنی ہے نہ کہ کسی کی خوشامد پر۔ میں کانگریس کے نظریے سے اس لیے اختلاف رکھتا ہوں کہ انگریزوں کے بعد اکثریت کی حکومت مسلمانوں کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوگی۔ یہ مخالفت ہندوؤں کی مخالفت نہیں بل کہ ہر اس شخص کی مخالفت ہے جو اکثریت اور اقلیت کے اصول پر ہندوستان جیسے ملک میں ملکی انتظام کا حامی ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کے خط کا یہ اقتباس بھی دل چسپی کا حامل ہوگا۔ سرسید نے یہ خط پائنیر کو لکھا تھا اور وہاں سے گزٹ میں نقل کیا گیا تھا کہ بنگالیوں کو ہرگز میں بد خواہ گورنمنٹ کا نہیں سمجھتا گو کہ انھوں نے نہایت بری طرح ہر کارروائی کی ہے۔ کانگریس والوں سے ہم کو کچھ عداوت نہیں ہے کہ ان کو فوج داری میں ماخوذ کرانے کی تدبیر کریں۔ ہم میں اور ان میں رائے کا اختلاف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے اور راج پوتوں کے لیے بالتخصیص ملک کے امن کے لیے نہایت مضر ہے۔ اس لیے ہم اس کے خلاف ہیں۔

اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تاکہ جو لوگ کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کی آرا سے انگلستان کی پارلیمنٹ کے ارکان کو باخبر رکھا جائے۔ اس جماعت میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ راجہ بھنگا (اودے پرتاپ سنگھ) نے اس سلسلہ میں ایک کتاب Democracy Not suited to India لکھی جو اس باب میں معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ اس کے علاوہ بریلی کے کنور ہرچرن ،جوگیندر ناتھ داس، راجہ شیو پرشاد، منشی نول کشور، کنور درگا پرشاد، نریدر بہادر اور راجہ بنارس وغیرہ نے بھی اس جماعت کے مقاصد کی ترویج و اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔ ضلع الہ آباد کے مقتدر ہندوؤں کی تقریروں کے اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو کانگریس کی مخالفت میں کتنے پر جوش تھے۔ یہ مرض نیشنل کانگریس کا ایسا ہوگیا ہے کہ اس کی تعریف بیان کرنے کی ضرورت اب باقی نہیں

رہی۔ لیکن اس کی خرابیاں جس قدر بیان کی جائیں وہ تھوڑی ہیں۔ جس قدر اس کے ریزولیوشن پاس ہورہے ہیں وہ خرابی سے بھرے ہیں۔ بڑی خوفناک یہ بلا ہمارے ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے گویا ایک کالی گھٹا اٹھی ہے جس میں بجائے پانی کے انگار برسنے والے ہیں اور فضائے ہندوستان کو جلا کر نیست ونابود کردینے والی ہے اور یہ بلا خاص اٹھائی ہوئی ہمارے بنگالی اور کشمیری بھائی کی ہے۔ اس جلسہ پر نظر ڈالنے سے مجھے بڑی مسرت اس امر کی ہے کہ اس خطہ کے ہندو مسلمان بھائی باہم شریک دیک دل ہیں اور دلی کوشش اس امر کی کرتے ہیں کہ ہمارے ممالک اس بلا سے محفوظ رہیں اور جن حضرات نے اس گھٹا کو اٹھایا ہے انھی کے وطن میں آکر انگارے برسائے تو ان کو زیب دے گا۔

۱۸۸۹ء میں سر سید کو سی۔ ایس۔ آئی کے اعزاز سے ممتاز کیا گیا۔ سر سید کی علمی خدمات کے اعتراف میں ایڈنبرا یونی ورسٹی نے ۱۸۸۹ء میں انھیں ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی سند دی۔ اس موقع پر ایڈنبرا کے ایک اخبار ایوننگ ڈسپیچ نے اپنے ۲۳ اپریل ۱۸۸۹ء کے شمارے میں سر سید کی تصویر شائع کی اور لکھا ہے کہ یہ امر مسلم ہے کہ سر سید تمام سلطنت متحدہ میں اپنی تصانیف سے مشہور ومعروف ہے اور خاص کر اس افضل کام سے جو ان کے فائدہ رساں زندگی کا سب سے بڑا نتیجہ ہے ہماری مراد مدرستہ العلوم سے ہے۔

جب مدرستہ العلوم کی مالی حالت تسلی بخش ہوگئی تو سر سید کو خیال ہوا کہ اب کالج کا انتظام کالج فنڈ کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اتفاق سے اسی دوران وہ علیل ہوگئے اور صحت کے بعد انھوں نے ضروری سمجھا کہ کالج اور اس کی جائیداد کے لیے ٹرسٹی مقرر ہوں اور کالج اس کے ماتحت کردیا جائے۔ چناں چہ ۱۸۸۹ء میں سر سید نے ٹرسٹیوں کے حسبِ ضابطہ تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے قواعد وضوابط مرتب کیے اور اسے تمام ممبرانِ کو رائے کے لیے بھیجا۔ مولوی سمیع اللہ خان جو ابتدا سے کالج کے قیام و بقا میں سرگرم تھے انھوں نے بعض دفعات سے اختلاف کیا جن میں سے ایک دفعہ وہ تھی جس

کی رو سے سید محمود کو جوائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا تا کہ سرسید کے بعد وہ کالج کے سیکرٹری ہو سکیں۔ یہ بل ممبران کی کثرت رائے سے منظور ہو گیا۔ لیکن مولوی سمیع اللہ خان اور ان کے ساتھی کالج کے انتظامی امور سے علاحدہ ہو گئے۔

سرسید کے آخری ایام بڑے تاب ناک تھے۔ انھیں پے در پے کئی صدمات سے دو چار ہونا پڑا۔ سید محمود جب کالج کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہو گئے تو اس سے کچھ ہی دن بعد انھیں الٰہ آبادہائی کورٹ کی ججی سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں ان کا مزاج اعتدال پر نہیں تھا۔ اس کیفیت کے ساتھ جب وہ علی گڑھ آتے اور کالج کے انتظامی امور میں دخیل ہوتے تو اس سے مشکلات پیدا ہوئیں اور اس کا اثر سرسید پر پڑا۔ پھر ۱۸۹۵ء میں کالج کے اکاؤنٹنٹ (منشی) شام بہاری لال نے ایک لاکھ روپیہ سے زائد سرسید کے جعلی دستخطوں سے بینک سے نکال لیے۔ یہ روپیہ پھر وصول نہ ہو سکا۔ اس بات کا سرسید پر گہرا اثر ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں ابنائے وطن نے اردو کے مسئلے کو تیسری بار ابھارا۔ سرسید نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ قومی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اپنے مقصد سے جیسی والہانہ شیفتگی سرسید رکھتے تھے اس نے سرسید کی پوری زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین کا اعلامیہ بنا دیا تھا۔ ان کی دردمندی، ان کا خلوص، ان کی کشادہ دلی اور وسیع النظری، ان کی لگن اور جہدِ مسلسل کی منزلِ مقصود جن اعلیٰ مقاصد سے عبارت تھی اس نے سرسید کو ہمیشہ توانا رکھا۔ وہ محض مصلح یا معمارِ قوم نہیں بل کہ عاشق تھے اس لیے عشق کی صعوبتوں اور رسوائیوں سے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ مذکورہ بالا حالات نے انھیں شدید ذہنی اور جذباتی صدموں سے دو چار کیا اور ان کی شخصیت جس نے اپنے سفر میں دشواریوں کو کبھی بھی حائل نہ ہونے دیا بالآخر ان صدمات سے نڈھال ہو گئی۔ کیوں کہ یہ تمام واقعات محض ذاتی نہیں بل کہ ان کے مقصد کی راہ میں دیوار بن گئے تھے۔

سرسید کی تصانیف و تالیفات

۱۔ جام جم (فارسی) چھاپہ خانہ مستقر الخلافہ۔ اکبر آباد ۱۸۴۰ء

۲۔انتخاب الاخوین مطبع سید الاخبار ۱۸۴۶ء (ن۔م)
۳۔جلاء القلوب بذکر المحبوب لیتھوگرافکس پریس۔دہلی ۱۸۴۳ء
۴۔تسہیل فی جر الثقیل آرفن پریس آگرہ۔۱۸۴۴ء
۵۔آثار الصنادید (طبع اول)۔مطبع سید الاخبار۔۱۸۴۷ء
۶۔آثار الصنادید (طبع دوم)۔مطبع احمدی۔دہلی۔۱۸۵۴ء
۷۔آثار الصنادید (طبع سوم) مطبع نول کشور لکھنؤ۔۱۸۷۶ء
۸۔آثار الصنادید (طبع چہارم)۔مطبع کان پور پریس۔۱۹۰۴ء
۹۔آثار الصنادید (طبع پنجم)۔سینٹرل بک ڈپو دہلی۔۱۹۶۵ء

10. *Prescription does Monomunts do* Delhi on 1852.

☆ آثار الصنادید (طبع اول) باب چہارم کو بعد میں ایک علاحدہ کتاب کے طور پر تذکرہ اہل دہلی کے عنوان سے انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۵۵ء میں شائع کر دیا تھا۔

۱۱۔فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، مطبع سید الاخبار۔۱۸۴۶ء
۱۲۔قول متین در حرکت ابطال زمین، مطبع سید الاخبار ۱۸۴۸ء
۱۳۔کلمۃ الحق مطبع (ن۔م)، ۱۸۴۹ء
۱۴۔راہ سنت در رد بدعت، مطبع (ن۔م)، ۱۸۵۲ء
۱۵۔نمیقہ در بیان شیخ مطبع (ن۔م)، ۱۵۸۲ء
۱۶۔سلسلۃ الملوک، اشرف المطابع دہلی۔۱۸۵۲ء
۱۷۔ترجمہ کیمائے سعادت ۱۸۵۳ء
۱۸۔سرکشی ضلع بجنور (غدر میں تلف ہوگئی)، مفصلائٹ پریس، آگرہ ۱۸۵۵ء
۱۹۔تصحیح آئین اکبری (ابوالفضل ابن المبارک) جلد اول دہلی مطبع اسماعیلی ۱۸۵۷ء
۲۰۔تصحیح آئین اکبری (ابوالفضل ابن المبارک) جلد سوم ۱۸۵۷ء
۲۱۔تاریخ سرکشی ضلع بجنور آگرہ: مفصلائٹ پریس، ۱۸۵۸ء
۲۲۔تاریخ سرکشی ضلع بجنور مرتبہ شرافت حسین مرزا، دہلی۔ ندوۃ المصنفین ۱۹۶۴ء

۲۳۔تاریخ سرکشی ضلع بجنور مرتبہ ڈاکٹر سید حسین الحق۔ناشر سلیمان اکیڈمی،۱۹۶۱ء
۲۴۔اسباب سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون۔آگرہ مفصلائٹ پریس،۱۸۵۹ء
۲۵۔اسباب بغاوت ہند (جدید ایڈیشن) آگرہ مفید عام پریس، ۱۹۰۴۔۶۶
۲۶۔(اسباب بغاوت ہند) علی گڑھ یونی ورسٹی پبلشر،۱۹۵۷ء

27. *Causes of the Indian Revolt,* First Published in Urdu in 1858 and translated by his two European Friends Benaras, Medica Hall press

۲۸۔اسباب بغاوت ہند تدوین ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔اکیڈمی سندھ ۱۹۵۷ء
۲۹۔رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول۔دوم۔سوم۔مفصلائٹ پریس میرٹھ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۱ء
۳۰۔تحقیق لفظ سازی مطبع (ن۔م) ۱۸۶۱ء
۳۱۔کتاب فقرات (فارسی)، مطبع مسز ایڈورڈ، میرٹھ،۱۸۶۰ء
۳۲۔تصحیح تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیا برنی۔کلکتہ: ایشاٹک سوسائٹی ۱۸۶۲ء
۳۳۔تبیین الکلام فی التفسیر التوراۃ الانجیل علی ملتہ الاسلام (جلد اول) غازی پور: پرائیویٹ پریس،۱۸۶۲ء
۳۴۔تصحیح تزک جہاں گیری (بادشاہ شاہ جہاں کی خودنوشت سوانح حیات)، علی گڑھ. سید احمد پرائیویٹ پریس، ۱۸۶۴ء
۳۵۔رسالہ احکام طعام اہل کتاب کان پور نول کشور پریس،۱۸۶۸ء، ۹۰ صفحات
۳۶۔تصانیف احمدیہ مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب

☆سفرنامہ مسافرن لندن اول انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۱۹۶۹ء سے قسط وار چھپا۔ جسے بعد میں تہذیب الاخلاق کے شمارہ میں یکجا کر دیا گیا تھا۔ چوں کہ سفرنامہ نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا اسماعیل پانی پتی نے مولانا حالی کی تحریر اور لندن سے محسن الملک کے نام خطوط اور سرسید کی متفرق تحریرات کی مدد سے بڑی حد تک مکمل کر دیا ہے۔

☆ الخطبات احمدیہ فی العرب (السیرت المحمدیہ انگریزی) لندن: ایس ٹروب اینڈ کمپنی، ۱۸۷۰ء

☆ ایضاً۔ منشی فضل الدین ککےزئی مطبع اسلامیہ۔ لاہور (س۔ن)

☆ ایضاً۔ سلسلہ تالیفات وکیل اینڈ ٹریڈنگ کمپنی۔ مطبع نول کشور۔ (س۔ن)

☆ ایضاً۔ نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۶۴ء

☆ ایضاً۔ مطبع فیض علی گڑھ (س۔ن)

☆ تصانیف احمدیہ (جلد اوّل) مشتمل کتب و رسائل مذہبی انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علی گڑھ

☆ تصانیف احمدیہ (جلد دوم) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس (س۔ن)

☆ تصانیف احمدیہ (جلد سوم) تفسیر القرآن جلد اوّل۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سنہ ۱۸۸۰

☆ تصانیف احمدیہ (جلد چہارم) تفسیر القرآن جد دوم۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۱ء

☆ تصانیف احمدیہ (جلد پنجم) تفسیر القرآن جد سوم۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۵ء

☆ تصانیف احمدیہ (جلد ششم) تفسیر القرآن جلد چہارم۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۸۸ء

☆ تصانیف احمدیہ (جلد ہفتم) تفسیر القرآن جلد چہارم۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۹۲ء

☆ تصانیف احمدیہ (جد ہشتم) تفسیر القرآن جلد ہشتم۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ۱۸۹۵ء

☆ تصانیف احمدیہ (جلد نہم) تفسیر القرآن جلد ہفتم۔ مفید علم پریس آگرہ۔ ۱۹۰۴ء

☆ سرسید کی وفات کے بعد مولوی جلال الدین حیدر کی تصحیحات اور قادر علی صوفی کے

اہتمام سے تفسیر القرآن کی جلد اول و دوم کو دوبارہ شائع کیا گیا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ تصانیف احمدیہ: جلد اول۔ تفسیر القرآن۔ اول مفید عام پریس آگرہ۔ ۱۹۰۳ء

☆ تصانیف احمدیہ: جلد چہارم۔ تفسیر القرآن جلد دوم۔ مفید عام پریس آگرہ، ۱۹۰۴ء

☆ ازالت الغین عن ذوالقرنین، مفید عام پریس۔ آگرہ ۱۸۸۹ء

☆ ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم مفید عام پریس۔ آگرہ ۱۸۸۹ء

☆ الدعا والاستجابہ مفید عام پریس۔ آگرہ۔ ۱۸۹۲ء

☆ تحریر فی اصول تفسیر مفید عام پریس۔ آگرہ۔ ۱۸۹۲ء

☆ ابطال غلامی مفید عام پریس آگرہ۔ ۱۸۹۳ء

☆ تبرئۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ ۱۸۹۵ء

☆ خلق الانسان علی مافی القرآن مفید عام پریس۔ آگرہ، ۱۳۰۹ء

☆ سیرت فریدیہ مفید عام پریس۔ آگرہ، ۱۸۹۶ء

☆ رسالہ تفسیر السمٰوات مفید عام پریس۔ آگرہ سنہ ۱۳۱۵ء

☆ النظر فی بعض مسائل امام الغزالی مفید عام پریس آگرہ (۱۸۶۹ء)

☆ جواب امہات المومنین سرسید کا آخری مضمون مرتبہ وحید الدین سیم۔ تجارتی پریس علی گڑھ (س۔ن)

تعلیم

۱۔ التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند۔ سید احمد پرائیویٹ پریس۔ غازی پور۔ ۱۸۶۳ء

۲۔ لیکچر در باب حب الوطنی و ضرورت ترقی تعلیم درمیان اہل ہند۔ بمقام مذاکرہ علمیہ اہل اسلام کلکتہ (بزبان فارسی) پرائیویٹ پریس ۱۸۶۳ء

۳۔ لیکچر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات اور جدید واقعات۔ پر مفید عام

پریس۔ آگرہ ۱۸۸۹ء

۴۔ لیکچر مدرستہ العلوم علی گڑھ کے تاریخانہ حالات اور جدید واقعات۔ پر مفید عام پریس۔ آگرہ ۱۸۸۹ء

۵۔ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ۔ تقاریر سید احمد خان و سید مہدی علی خان وغیرہ۔ مفید عام پریس۔ آگرہ ۱۸۹۴ء

۶۔ لیکچر اجلاس دہم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ مفید عام پریس آگرہ

۷۔ لیکچر متعلق اجلاس یازدہم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مفید عام پریس، آگرہ ۱۸۹۶ء

۸۔ مجموعہ ریزولیشن ہائے در سالہ من ابتدائے ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۵ء محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کانفرنس۔ مفید عام پریس۔ آگرہ ۱۸۹۶ء

9 *Structures upon the present educational system in India*, London, Henry S. King & Co. 1860

۱۰۔ التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند۔ درباب ترقی تعلیم مسلمان ہندوستان (اردو۔ انگریزی) لندن۔ ۱۸۷۰ء

قانون

۱۔ لیکچر بر ایکٹ ۱۹۔ ۱۸۶۳ء کے یعنی متضمن بٹوارہ۔ محالات مال گذاری سرکار کے جو دیا گیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۴ء کو سائنٹیفک سوسائٹی میں مطبوعہ پریس۔ علی گڑھ ۱۸۶۵ء

۳۔ لیکچر بر ایکٹ ۱۶۔ متضمن رجسٹری دستاویزات پرائیویٹ پریس علی گڑھ ۱۸۶۴ء

سیاست

۱۔ لیکچر بمقام لکھنؤ ہماری قوم کو نسبت پولیٹیکل امور سلطنت کے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

۲۔ انڈین نیشنل کانگریس مدارس پر سید احمد خان کا لیکچر۔ ناشر محمد رحمت اللہ۔ نامی پریس

کان پور (س۔ن)

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سائنٹیفک سوسائٹی یہ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی کے ایک شعبے کے طور پر ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو جاری ہوا اور سر سید کی وفات تک پابندی کے ساتھ چھپتا رہا۔ یہ اخبار اردو اور انگریزی میں ساتھ ساتھ چھپتا تھا۔ جس میں خبروں یا مضامین کے مخاطب صرف اہل وطن ہوتے تھے۔ وہ صرف اردو میں چھپتے تھے۔ اردو میں اس کا نام اخبار سائنٹیفک سوسائٹی لکھا جاتا تھا۔ جو چند سال بعد حذف کر دیا گیا اور انگریزی دونوں میں دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ لکھا جانے لگا۔ وقتاً فوقتاً اس اخبار میں ضروری اور معنوی حیثیت میں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ مثلاً شروع میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ جون ۱۸۷۷ء سے ہفتے میں دوبارہ شائع ہونے لگا۔ ٹائپ کا حسن اسی اخبار کی انفرادی خصوصیت تھی۔ یوم اجرا سے سر سید کی وفات تک پابندی سے چھپتا رہا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب مدرستہ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) مسلم یونی ورسٹی میں تبدیل ہوگیا تو اس کا نام مسلم یونی ورسٹی گزٹ ہوگیا۔ ان دنوں اسی نام سے شائع ہوتا ہے۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا دور: شوال ۱۲۷۷ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۰ء تا رمضان ۱۲۹۳ھ مطابق جولائی ۱۸۷۷ء چھ برس ساڑھے سات مہینے پر محیط اس دور میں ۲۲۶ مضامین شائع ہوئے۔ جن میں چھوٹے بڑے کل ۱۱۲ مضامین خود سر سید کے تحریر کردہ ہیں۔ اس دور کی ادارت سر سید نے ہی انجام دی۔

دوسرا دور: آخر جمادی الاول ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۳ اپریل ۱۸۷۶ء تا ۱۲۹۸ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء ہے۔ یہ دور برس پانچ مہینے پر مشتمل ہے۔ ان دنوں سر سید کی توجہ زیادہ تر تفسیر القرآن اور مدرستہ العلوم کے مسائل پر رہی۔ اکثر معاونین بھی عدیم الفرصت رہے اس لیے اس میں صرف ۶۷ مضامین چھپے۔ جن میں تیں مضامین سر سید کے تھے باقی مضامین دیگر معاونین تھے۔

تیسرا دور: شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء تا ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور محسن الملک کی تحریک پر سر سید نے اسے تیسری بار جاری کیا تھا لیکن اس دور

میں بھی تہذیب الاخلاق تنہا سرسید کے رحم وکرم پر رہا کسی طرح تین سال تک چلا پھر ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔اس دور میں بھی زیادہ تر مضامین خودسرسید کے ہی تحریر کردہ ہیں۔

انتخابات ومجموعات

ا۔انتخاب تہذیب الاخلاق۔رسالہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کا انتخاب انور احمدی پریس۱۹۲۴ء،۱۹ اصفحات
۲۔انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق مرتبہ ابوالخیر کشفی ،کراچی :اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۴ء،۱۳۸ صفحات
۳۔انتخاب مضامین سرسید۔کراچی :اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۵۴ء۔۱۳۸ صفحات
۴۔انتخاب مضامین سرسید۔علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس (س۔ن) ۱۲۸ صفحات
۵۔انتخاب مضامین سرسید مع تبصرہ نسیم قریشی۔مرتبہ عزیز الدین اختر۔مسلم ایجوکیشنل پریس، (س۔ن)
۶۔آخری مضامین سرسید مرتبہ مولانا امام الدین گجراتی و مولوی بابا صاحب مخدومی لاہوری۔،لاہور:منصور پریس، (س۔ن)
۷۔انتخاب مضامین سرسید مرتبہ عتیق احمد صدیقی۔علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، مسلم یونی ورسٹی، (س۔ن)
۸۔مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خویشگی۔علی گڑھ :مطبوعہ نیشنل پرنٹرس کمپنی، (س۔ن)

خطوط سرسید

ا۔سرسید کے خطوط مرتبہ حیدرالدین سلیم۔پانی پت : حالی پریس سنہ ۱۸۹۶ء،۱۰۴ صفحات
۲۔سرسید خطوط مرتبہ سرراس مسعود نظامی پریس بدایون۔۱۹۲۴ء۔۴۳ صفحات
۳۔سرسید خطوط (طبع دوم) مرتبہ سرراس مسعود۔نظامی پریس بدایون ۱۹۳۱ء،

۲۶۳صفحات

۴۔انتخاب مکاتیب (سرسید، شبلی، اقبال) مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔اے (طبع اول)۔
لاہور: مطبع قریشی کتب خانہ ریلوے روڈ، ۱۹۵۸ء

۵۔مکتوبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔لاہور، مجلس ترقی ادب، جون سنہ۱۹۵۹ء

۶۔مکتوبات سرسید احمد خان مرتبہ مشتاق حسینی۔علی گڑھ: فرینڈس بک ہاؤس، ۱۹۶۰ء

۷۔مکتوبات سرسید احمد خان مرتبہ مشتاق حسین (اشاعت دوم) لاہور اسٹار بک ڈپو۔
نامی پریس لاہور، ۱۹۶۰

خطبات وتقاریر کے مجموعے

۱۔ لیکچروں کا مجموعہ مع سوانح عمری مرتبہ سراج الدین احمد۔لاہور۔ اسلامیہ پریس،
۱۸۹۰ء

۲۔مجموعہ لیکچر ہائے سرسید احمد خان مرتبہ منشی سراج الدین۔ساڈھورہ، ضلع انبالہ۔ بلالی
پریس دسمبر سنہ۱۸۹۲ء

۳۔مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز آف سید احمد خان مرتبہ مولوی محمد امام الدین گجراتی۔
لاہور۔ مطبوعہ نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس، فروری ۱۹۰۰ء

۴۔خطبات سرسید مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پت۔لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۰ء

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے ادبی کام کا جائزہ لینے کے بعد ہم ان کے سوانح اور احوال آثار کے حوالے سے لکھی گئی کتب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ذیل میں سنین وار ان کتب کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے جن میں غالب موضوعات سرسید کے احوال وآثار، معاشرتی وادبی خدمات ہیں۔

سوانح سر سید پر مطبوعہ کتب

حیات جاوید، (۱۹۰۲ء) از مولانا الطاف حسین حالی

سر سید شناسی کا نقشِ اوّل حیات جاوید سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا سر سید کو اپنی سوانح عمری کا بڑا اشتیاق تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ سر سید ایک مستقل مزاج اور آہنی عزم کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ صرف خود اردو نثر کے فروغ کے لیے کام کیا بل کہ اپنی سحر انگیز شخصیت کے حصار میں اور بھی کئی رفقا کو لیا اور اردو نثر کے دامن کو وسعت بخشی۔ سر سید احمد خاں نے اپنی مختلف کتب مضامین اور تقاریر وغیرہ کے ذریعے یہ کوشش کی کہ انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے مابین فاصلے کم ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ سر سید احمد خاں نے اپنے دور کے حالات کا جائزہ بہ نظرِ عمیق لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانانِ ہند کی حالت میں اس وقت تک بہتری نہیں آ سکے گی جب تک کہ مسلمان جدید مغربی علوم حاصل نہ کر لیں۔ سر سید احمد خاں کے زمانے ہی میں بہت سے لوگ انھیں ایسے میسر آئے جو ان کے ممد و معاون بنے اور ان کے نظریات کے فروغ میں ان لوگوں نے سر سید کا ساتھ دیا۔ بہت سے صاحبان ایسے بھی تھے جنھوں نے سر سید احمد خاں کا اس لیے ساتھ دیا کہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور دنیاوی ترقی کی بات کرتے تھے لیکن جب انھوں نے سر سید کے خیالات و نظریات کو پوری طرح سمجھا اور خصوصاً ان کے مذہب سے متعلق نظریات کو جانا تو ان سے گریز پا ہو گئے۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ابتدا ہی سے سر سید احمد خاں کے کام، ان کے طریقہ کار اور ان کے نظریات سے اختلاف کیا اور سختی سے اپنے موقف پر آخر تک قائم رہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کو تینوں طبقوں کا سامنا رہا۔ ایک وہ جنھوں نے عزت و توقیر کے اونچے بانس پر بٹھایا۔ دوسرے وہ جنھوں نے بعض اقدامات کی تائید و حمایت کی اور بعض اقدامات کی مخالفت کی اور ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے اول تا آخر سر سید احمد کے اقدامات کی

مخالفت کی اور ان کے مشن اور ان کے نظریات کو نہ صرف تسلیم نہ کیا بل کہ کھلے لفظوں میں اس کی مذمت بھی کی۔ یہ تینوں طبقے آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔

سرسید کے حوالے سے اظہار خیال کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جہاں ان کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا وہاں انھیں ان کے نظریات کی وجہ سے ہدفِ تنقید بھی بنایا گیا۔ ایک طرف حالی تھے تو دوسری طرف اودھ پنچ سے وابستہ لکھنے والے تھے۔ ایک اور رخ علامہ شبلی نعمانی بھی تھے جنھوں نے غلط مذہبی نظریات پر سرسید کی گرفت بھی کی، مگر دلائل کے ساتھ سرسید کی ذات، ان کے مقصد اور ان کے نظریات کے حوالے سے اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر ایک مفصل کتاب حیاتِ جاوید کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک طرف تو سرسید احمد خاں کی شخصیت کے متعلق لکھا اور دوسری طرف ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ ناقدین نے اسی کتاب کو سرسید کی مدلل مداحی بھی قرار دیا۔ اس کتاب کے حوالے سے تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> "حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے انھوں نے حیاتِ ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور کثیر الاشغال زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔۔۔۔۔۔ ہر ایک مہتمم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے"۔[۲]

اس کتاب میں مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے ہم پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی تھا کہ انھوں نے یہ سبق دیا کہ اب ہمیں دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اس لیے وہ لیاقتیں اور صلاحیتیں جو دنیا میں کشور کشائی اور حکومت

وسلطنت کے لیے درکار ہیں ہمارے لیے بے سود ہیں لہٰذا اب ہمیں محکوم بن کر رہنا سیکھ لینا چاہیے۔ مولانا حالی کے خیال میں یہ سر سید احمد خاں کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ محکوم بن کر رہنے کا یہ درس کیا واقعی مثبت طرز ہے۔۔؟

مولانا حالی گو سر سید کے بڑے خیر خواہ تھے لیکن انھوں نے سر سید کے مذہبی نظریات پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ خصوصاً انھوں نے سر سید احمد خاں کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر پر اعتراضات اٹھائے۔ مولانا حالی کے ان اعتراضات کی جھلک حیات جاوید میں بھی موجود ہے اور مقالاتِ حالی میں بھی۔ اس حوالے سے مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

> ''آخر میں سر سید کی خود آرائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ عتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے'' [۳۵]

حالی نے سر سید احمد خاں کی لکھی ہوئی تفسیر کے حوالے سے اپنے مقالات میں بھی اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

> ''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیوں کہ ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیوں کہ ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں!'' [۳۶]

علامہ شبلی نعمانیؒ کا نام اردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ سوانح نگار، نقاد، شاعر، عالمِ دین، ماہرِ تعلیم، سفرنامہ نگار، خطیب، معلم، مکتوب نگار، مقالہ نگار، سیرت نگار اور مورخ ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کا بھی سر سید احمد خاں کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا۔ ابتدا میں وہ بھی سر سید کی طرح جدت پسند تھے اور عقلیت کا ان پر غلبہ تھا لیکن سر سید احمد خاں کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ

سر سید کے خیالات سے اختلاف کرنے لگے اور بعد ازاں یہ اختلافات بڑھتے گئے۔ نواب وقار الملک نے سر سید کے نام ایک خط میں سر سید کے مذہبی نظریات پر اعتراض کیا اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں سر سید کے بعض جملوں پر سخت اختلاف کیا اور یہ بات لکھی کہ میں ایسی ہستیوں پر تبرا سننے کو تیار نہیں ہوں۔ مگر حالی نے مذہبی عقائد کی پروا کیے بغیر سر سید سے وفا کی اور اپنے اسلوب کا وہ جادو جگایا کہ اردو ناقدین کہنے لگے یہ حالی کی وہ تصنیف ہے جو ہماری زبان میں اعلیٰ اور مکمل سوانح نگاری کی مثال ہے۔ حالی کے دل کش اسلوب کے باعث ہم کہ سکتے ہیں حیاتِ جاوید حالی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

سر سید احمد خان حالات وافکار، مولوی عبدالحق (۱۹۵۹ء)

یہ کتاب ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کی تھی۔ اس کتاب کا انتساب مولوی عبدالحق نے صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے نام کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ”میں اپنی یہ ناچیز تالیف عالی قدر صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے نام معنون کرتا ہوں، جنھوں نے پاکستان کو سیاہ کاروں اور غداروں سے نجات دلائی اور خوش حالی وترقی کی راہ دکھائی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء کا انقلاب بر رحمت بن کر آیا، جس نے پاکستان کی سوکھی کھیتی میں نئی جان ڈال دی۔ یہ نقلاب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی بے نظیر جرأت و ہمت اور ان کی بے مثال دور بینی و مال اندیشی کا مبارک نتیجہ ہو۔ حقیقت میں یہ تکملہ ہے اس ذہنی انقلاب کا، جس کے اوّلین محرک اس برصغیر میں سر سید احمد خاں تھے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتاب کا انتساب جو سر سید احمد خاں کے حالات وافکار پر مشتمل ہے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے نام نامی پر کیا، جو ہمارے اس دور میں سر سید احمد خاں کے ذہنی انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور

نقیب ہیں۔“ ۵؎

اس کتاب کو فاضل مصنف نے سات عنوانات میں ترتیب دیا ہے جن میں

(۱) سرسید احمد خاں
(۲) سرسید مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونی ورسٹی
(۳) سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ
(۴) ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتے ہیں
(۵) سرسید احمد خاں کی مجوزہ اُردو لغات کا نمونہ
(۶) مصلح اعظم سرسید احمد خاں
(۷) سرسید بہ حیثیت مفکر اعظم

اس کتاب میں سب سے زیادہ سرسید احمد خاں کی شخصیت اور تعارف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سرسید کی مدح سرائی میں مولوی صاحب نے ۹۶ صفحات لکھ دیے ہیں۔ سرسید کا خاکہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں

”تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کیے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کیے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریا کار بھی۔ خودغرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل

حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔''[۶]

مولوی صاحب نے سر سید احمد خاں کی خدمت کے اعتراف میں کھلے دل سے کام لیا ہے۔ میرے خیال میں انھوں نے اپنی کتاب کی تشکیل میں حیاتِ جاوید اور مقالات سر سید احمد خاں کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں اسلوب اور نگارشات دونوں مولانا حالی کے بہت قریب ہیں۔ علاوہ ازیں زندگی کے حالات اور واقعات تو جیسے ہو بہو حیات جاوید سے لیے گئے ہیں، ملاحظہ ہو:

> ''زندہ دلی ان کی فطرت میں تھی۔ اگر چہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بہ روز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور واقعات ان پر ہجوم کر کے ٹوٹ پڑے تھے لیکن ان کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض ہم عمر بے تکلف دوستوں سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بل کہ چھوٹوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی ان کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔''[۷]

پہلے باب میں جا بہ جا مولانا حالی سے منسوب اقتباسات پیش کیے ہیں۔ مولوی عبدالحق کا کہنا ہے:

> ''لوگوں میں یہ ایک عام خیال ہو گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خوشامدی ہیں۔ بعض مخالفوں نے تو انھیں ابن الوقت تک کہہ دیا۔ جس شخص نے ان کی زندگی اور سیرت کا بہ غور مطالعہ کیا ہے وہ کبھی ایسا خیال نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ عالی مرتبہ انگریزوں کو اپنے کالج میں بلاتے، جلسوں میں مدعو کرتے، لیفٹیننٹ گورنر، وائسرائے اور بڑے بڑے انگریز آتے۔ کالج کا معائنہ کرتے، ان کو ایڈریس دیے جاتے وہ جواب دیتے، اسی طرح ہندوستانی روسا، عالی مقام حکام اور والیانِ ریاست کو بھی مدعو کیا جاتا۔''[۸]

ورنیکلر یونی ورسٹی اور دیسی زبان کی تعلیم کے لیے سر سید کی خدمات کو عمدہ انداز میں

خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''دہلی کالج جس نے اس عظیم الشان کام کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جہاں اس کے کارفرما اور کارکن بڑے شوق اور جوش سے یہ خدمت ادا کر رہے تھے۔ بے وقت نشانہ اجل ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے اسے ایسا دھچکا لگا کہ پھر نہ پنپ سکا اور اس کی ساری کوششوں اور محنتوں پر پانی پھر گیا۔ اس کے بعد سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کا ڈول ڈالا تھا اور کام چھا خاصا نکلا تھا اور ورنیکلر یونی ورسٹی کی تجویز اس کے بانی کا نتیجۂ فکر تھی۔''۹

مولوی عبدالحق قیام پاکستان کے بعد پہلے سرسید شناس تھے جنھوں نے اپنی ایک مکمل تصنیف سرسید احمد خاں اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے تحریر کی تھی اس کا انداز تحریر توصیفی و تحسینی اور یک رُخہ ہے۔ وہ ان لوگوں کی قبیل سے ہیں جنھوں نے سرسید احمد خاں کو سب سے پہلے دو قومی نظریے کا خالق مانا تھا۔

سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، (۱۹۶۰ء)

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے اردو نثر کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ تالیف کل سات ابواب پر مشتمل ہے جس میں صرف دو ابواب میں سرسید احمد خاں اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے اور باقی پانچ ابواب میں ان کے رفقا جس میں مولانا حالی، موںوی چراغ علی، نذیر احمد اور شبلی نعمانی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان مشاہیر کی سوانح عمریاں اور تاریخی کتب کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ چھٹے باب میں انھوں نے ادبی تنقید اور دوسری اصناف جن میں صحافت اور مکتوب نگاری کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو ابواب میں سرسید احمد خاں کا تعارف اور ان کی چند کتب کا ذکر کر کے سرسید کے اسلوب کو بیان کیا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

''سر سید کے اہم کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ ہمیں اس موقع پر سب سے زیادہ ان کی خدمات سے دل چسپی ہے جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بل کہ اس کو غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کی نشوونما و ارتقا میں بھی نمایاں حصہ لیے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نثر اردو کو اجتماعی مقصد سے روشناس کیا، اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی مقصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے زمانے تک نثر میں عموماً مضمون و معنی کو ثانوی اور طرز بیان کو اوّلین اہمیت دی جاتی تھی مگر انھوں نے مضمون کو اوّلیت دی۔''(۹)

سید صاحب نے سر سید احمد خاں کے دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ان کی دل چسپی تاریخی اور مذہبی کتب کی تحقیق میں تھی، دوسرے دور میں سر سید کا رجحان علم الکلام سیاسی اور عقلی تصورات کی حامل کتب کی طرف رہا جب کہ تیسرے اور آخری دور میں نظریہ تمدن اور فطرت کے مداح ہو گئے۔ الغرض اس دور کی تصانیف میں مذہب، سیاست اور معاشرت کے ہر مسئلے میں ان پر کسی وکٹورین صاحب قلم اور صاحب فکر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ تہذیب الاخلاق اس بات کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''غدر کے بعد سید صاحب کے خیالات میں واضح تبدیلی پیدا ہو گئی تھی مگر اس دور میں پہنچ کر اس رجحان نے نمایاں انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ان کے پہلے اور آخری دور میں اتنا کھلا تفاوت نظر آتا ہے کہ ہم یک کو دوسرے کی ضد قرار دے سکتے ہیں۔ تیسرے دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ اس دور میں ان کی طبیعت میں ایک طرح کا تشدد نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے ان کے لہجے میں نرمی اور

ملائمت تھی، اب وہ اظہارِ خیال میں نڈر اور بے خوف معلوم ہوتے ہیں اور پبلک کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ سر سید کی زندگی کا ایک دور وہ تھا جس میں وہ تصورِ شیخ کے دقیق اور نازک خیالات میں گہری دل چسپی لیا کرتے تھے مگر اس نئے دور میں انھیں معراجِ رسولﷺ کا جسمانی امکان بھی ناممکن معلوم ہونے لگا۔"[11]

سر سید میں تعلیم کے خیالات تجدد کی ہمہ گیر شہرت کے باوجود کچھ زیادہ جدید نہ تھے۔ سائنس کی ترغیب اور انگریزی زبان کی تعلیم اگرچہ اس زمانے کے اعتبار سے بڑے انقلاب انگیز خیالات تھے مگر حق یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سر سید احمد خاں کے تعلیمی افکار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سر سید انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور ملک کے بعض دوسرے عناصر خصوصاً علما انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے مگر یہ رائے منصفانہ نہیں۔ انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علما کو اختلاف سر سید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا۔ ان کو انگریزی تعلیم سے اختلاف نہ تھا لیکن چوں کہ سر سید انگریزی تعلیم پھیلانے والے تھے، اس لیے یہ معاملہ الجھ کر رہ گیا اور بہت سے مغالطے پیدا ہو گئے۔ سر سید انگریزی تعلیم پھیلانے میں حق بہ جانب تھے مگر انگریزی تمدن کے متعلق ان کے خیالات تعلیمی منصوبوں سے کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ اختلاف بالکل قدرتی تھا۔"[12]

اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے کچھ ضمیمے بھی شامل کیے ہیں دراصل یہ ان کے مضامین ہیں یا ان کے جز و ہیں جو انھوں نے پہلے کبھی لکھے تھے۔ مگر اس کتاب کے موضوع سے مماثلت مناسبت کے باعث شامل ہو گئے۔ ان میں "سر سید کا اثر، ادبیات اردو پر" خاصے کی چیز ہے۔ یہ سر سید کی ادبی خدمات کا حاصل ہے۔

تذکرۂ سر سیدؒ (۱۹۶۴ء) از مولوی محمد امین زبیری

تذکرۂ سر سید، مولوی محمد امین زبیری کی تالیف ہے، جس کی اشاعت ۱۹۶۴ء میں پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ انارکلی، لاہور سے ہوئی۔ یہ کتاب چار سو پینتیس (۴۳۵) صفحات پر مشتمل ہے۔

اس تالیف کی فہرستِ مضامین میں انتساب، حکایتِ دل، پیغامِ قائدِ اعظم، تعارف (محمد محمود علی خاں، نقد و نظر (جناب غلام رسول مہر، پیش لفظ (ڈاکٹر معین الحق اور تمہید کے بعد باب اول میں ولادت، نسب، تربیت، تعلیم، ابتدائی حالات، ملازمت، غدر ۱۸۵۷ء، مصائب وخطرات، مسلمانوں کی بریت کی کوشش، کمیشن تحقیقاتِ جائیدادہائے منضبطہ کی ممبری، قحط و محتاج خانہ کا انتظام، ایک مدرسہ کا قیام وقف وجلسہ شکریہ اعلان معافی، سرسید پر غدر کا اثر، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، وجہ تالیف، رسالہ کی مخصوص ومحدود اشاعت اور اس کا اثر، رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا کا اجرا اور رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ شامل ہیں۔

باب دوم اشاعت تعلیم کی تدابیر، غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی اور مدرسہ کا قیام، علی گڑھ میں سوسائٹی کی منتقلی، ترقی وعمارات، ہومیو پیتھک طریقہ علاج کی عمومیت کی کوشش، انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا، زبردست نکتہ چینی، سوسائٹی کا تنزل، ورنیکلر یونی ورسٹی کی تحریک، نقطۂ نظر کی تبدیلی اور انگریزی تعلیم کی تائید، پنجاب والہ آباد یونیورسٹیوں میں مشرقی تعلیم کے خلاف مضامین جیسے موضوعات پر محیط ہے۔

باب سوم، سفرِ انگلستان، ارادۂ سفر و آغاز، لندن میں قیام و مصروفیات، خطاب ستارۂ ہند اور مراجعت پر مشتمل ہے۔ باب چہارم میں اسلامی کام و تہذیب الاخلاق کا اجرا، مذہبی مضامین، مضمون نگار، آخری نمبر، حصولِ مقصد پر دو تبصرے، تبصرہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب، تبصرہ شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب اور اجراء بار ثانی وثالث جیسے موضوعات شامل ہیں۔ باب پنجم، سرسید کا غور اور قومی تعلیم کی مساعی،

کمیٹی خواست گار تعلیم مسلمانان کی تاسیس، ایک تعلیمی سکول، سرسیّد کے نظریات، تعلیم و تربیت، تاسیسِ دارالعلوم کے اقدامات، مشکلات اوران کا مقابلہ، مدرسۃ العلوم کا افتتاح، امید افزا کامیابی، صیغہ علوم مشرق، پینشن، کالج فاؤنڈیشن کی تقریب، اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کا نظریہ اور امدادی وظائف جیسے موضوعات کا حامل ہے۔ باب ششم میں نظم تعلیم، مذہبی تعلیم کے امتحان کا انعامی جلسہ اور سرسیّد کی تقریر، کالج کے تعلیمی نتائج، نظم اقامت اور سوسائٹیاں وغیرہ، انجمن تحیۃ الصلوۃ، بیوت الاطفال الصغار، ظہور وارڈ، قومی لباس، اقامتی نظام کی خوبی ایک قدیم طالب علم کی نظر میں اور طلبا کو ایک نصیحت جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب ہفتم میں فراہمی سرمایہ، دورے، دیگر تدابیر، مسلم ریاستوں سے امداد، ایک تھیٹر کا خیال، علی گڈھ میں تھیٹر، غیر قوموں کی امداد، حقِ تصنیف سے امداد، سرسیّد کا نتائج کے متعلق ایک بیان سرمایہ میں غبن اور سرسیّد پر اثر، سرمایہ کی مقدار اور آمد و خرچ، عمارات کالج اور یادگاریں اور فاؤنڈیشن ڈے جیسے موضوعات شامل ہیں۔ باب ہشتم، مخالفتیں اور مخالفین، سرسیّد کے خلاف استفتا، سرسیّد کے جواب، سیّد جمال الدین افغانی کے حملے، طبقۂ شعرا، یورپین حکام کی مخالفت اور انتظامی اختلافات جیسے موضوعات کا حامل ہے۔ باب نہم میں محمڈن کانگرس وآل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، نتائج، نواب عمادالملک بلگرامی اور نواب زادہ لیاقت علی خاں، کے بیانات، مسلم سیاسیین کی توجہ، بعض علما کی مخالفت، تعلیمِ نسواں اور پردہ پر سرسیّد کی رائے اور حقوقِ نسواں اور پردہ جیسے موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب دہم میں کالج کی سیاسی و تعلیمی اہمیت، انگریزوں کی نظر میں کالج کی عظمت، عالمِ اسلامی میں سب سے بہتر مدرسہ۔ اخلاقی نتائج، آغا خاں کا ایک بلیغ فقرہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ باب یازدہم سرسیّد کی کامیابی کے اسباب، مثبت اور دیگر صفات، رفقائے کار، اعلیٰ حکام کی اخلاقی تائید، یورپین سٹاف اور ہندوستانی سٹاف جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔

فصلِ دوم میں باب اوّل کے موضوعات میں سیاسی جذبات۔ قومی نظریہ، برٹش

انڈین ایسوسی ایشن کا قیام اور کام، جہاد اور وہابیت کے مسائل، اخبار ہندو پیٹریٹ کا تعصب، علمائے مکہ کے فتوۂ جہاد کی حقیقت، سرسید کا سیاسی عقیدہ، وفاداری اور اس کا موازنہ، امپیریل کونسل کی ممبری، کونسل میں چند بلوں کی پیشی، البرٹ بل پر بحث، لوکل سیلف گورنمنٹ کے بل پر بحث اور تقریروں کی تعریفیں شامل ہیں۔ باب دوم میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام اور اس کے بعض مقاصد سے اختلاف، بنگالی پریس کے اعتراضات اور جوابی بیانات، سرسیّد کا جواب، سرسید کا اعلان، ایک گشتی خط، ایک ہندو مسلم ایسوسی ایشن کا قیام ایم۔اے۔او ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تاسیس اور اغراض، سرسیّد کی پالیسیوں سے جمہور مسلمانوں کا اتفاق اور مولویانہ محاذ مخالفت جیسے موضوعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب سوم میں سرسیّد اور سلطنت ترکی، کالج کے پرچم میں ہلال وصلیب، سفیر خصوصی ترکی کی کالج میں دعوت، ترکی مجروحین اور یتیموں کا فنڈ، کالج میں ایک ترکی مشن کا استقبال، ترکی و آرمینیا کی جنگ ۱۸۹۷ء کے تردادات، ترکی کی فتح پر مسلمانوں کی مسرت، خطرناک شہرت، سرسیّد کے مضامین، لارڈ ایلگن وائسرائے ہند کا علی گڑھ آکر اعتماد کا اظہار کرنا جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ باب چہارم میں سرسیّد کی پالیسی کے متعلق غلط پروپیگنڈہ، اسلام میں جمہوری حکومت کی بحث، ایک غلط شہرت اور سرسیّد کا توضیحی بیان، ایڈیٹر پائیر کے نام خط، جسٹس سیّد محمود کے استعفیٰ پر سرسیّد کا بیان اور بیسویں صدی میں مخالفت اور غلط شہرتوں کی حقیقت پر تبصرہ شامل ہے۔

باب پنجم سرسیّد کی سیاسی پالیسی کی اہمیت، سرعلی امام صدر مسلم لیگ ۱۹۰۹ء کا بیان، صدر اجلاس کانگرس ۱۹۲۹ء مولانا محمد علی کا بیان، اخبار ہمدرد کے ایک اداریہ کا اقتباس اور وقیع ترین ثبوت جیسے موضوعات کا حامل ہے۔ باب ششم میں تصنیف وتالیف اور علمی مشاغل۔ آغاز مشاغل، دور اوّل۔ رسائل وتراجم، جلاء القلوب بذکر المحبوب، آثار الصنادید اور اس میں محنت وانہماک، مضامینِ کتب، کتاب کی اہمیت، نظر ثانی، فرانسیسی زبان میں ترجمہ، فیلوشپ، حالی کے تسامح، مذہبی وتاریخی رسائل، تصحیحِ آئین

اکبری، دورِ ثانی، تبیین الکلام، جسٹس شاہ دین کا تبصرہ، ایک طبی رسالہ، تصحیحِ تاریخ فیروز شاہی، رسالہ طعامِ اہلِ کتاب، دورِ ثالث، سفرِ لندن، سیرت وتفسیر، الخطبات الاحمدیہ فی سیرۃ المحمدیہ، سلطان ترکی کو ہدیہ، خطبات کی فہرست، دیباچہ کا اقتباس، اردو ایڈیشن کے خاتمے پر ایک تصریح، جسٹس شاہ دین کا تبصرہ، عبدالماجد بی۔اے دریا بادی کی رائے، تفسیر القرآن اور غرض وغایت، تفسیر کے غیر مکمل رہنے کی وجہ اور اس کا بدل، چند تعلیم یافتہ اصحاب کے تبصرے اور تاثرات، جسٹس شاہ دین کے تبصرے کا مفاد، شیخ اکرام کا تبصرہ، ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ، ڈاکٹر اقبال کی رائے، ایک ولندیزی مستشرق کا ریسرچ، آخری تصانیف، قدیم نظام دیہی، الدعا والاستجابت، ازواجِ مطہرات، مصنف کا رویہ اپنی کتابوں پر، کتب خانہ، تصانیف کے تراجم، مجموعہ مضامین، مجموعۂ خط، اردو لغت، جدید علم کلام کی تدوین کا خیال، مسلمان حکومتوں اور بادشاہوں کی صحیح تاریخ کی آرزو، ادب وسخن کا مذاق، فارسی ادب، اردو ادب اور اس کی ترقی واصلاح، تشبیہ واستعاروں کی مثالیں، روئدادوں کی دل کشی، خطوط، شاعری، فارسی نظم، اردو نظم، اردو نظم سے دل چسپی اور اس کی اصلاح کی خواہش، خطابت اور انگریزی دانی جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب ہفتم میں عقائد واعمال، مذہب اور سیرت ومعاشرت، عقائد وفرائض منصوصہ، اپنے عقائد کے متعلق ایک خط، افاضۂ قرآن کی برکت پر عقیدہ، ادائے فرض، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، عقیدت اور شعائر اللہ کا ادب، احترامِ انبیا، زیارتِ مزارات، آثارِ قدیمہ کی عظمت، تأثر کا یک واقعہ، علما وفضلا سے عقیدت اور ان کا احترام، معاشرت و تعلقات اور بعض خصوصیات، قدیم معاشرت کی تبدیلی، انگریزوں کا تعصب، سرسیّد کا ایک مضمون، انگریزوں کے ساتھ خورونوش، ایک دعوت، طرز ماند و بود اور نظام الاوقات وغیرہ، تعلقات کا پاس ولحاظ، انگریزوں کے ساتھ تعلقات، انگریزوں کی سماجی برتری سے نفرت، ہندوؤں سے تعلقات، اختلاف رائے، سفارش، شخصی امداد، احباب اور اعوان وانصار، سرسید کا فیضِ صحبت، سنجر طہرانی کا بیان، زندہ دلی، کرنل گریہم

کا بیان اپنی کتاب کے دیباچہ میں، اپنی رائے پر وثوق اور آمریت، پوتے کے ساتھ والہانہ شفقت، تقریب بسم اللہ، طلبا پر شفقت، انجمن الفرض پر تقریر، مجلس الاخوان کی ممبری، ڈاکٹر مولوی حاجی حبیب اللہ خاں کا ایک مضمون، سر سیّد کی حیات کا طلبا پر شفقت کا پہلو، طلبا کی عملی عقیدت، سرکاری و عملی خطابات و اعزازات اور خانگی زندگی کی تلخیاں، پر بحث شامل ہے۔

باب ہشتم میں بیماری و رحلت اور ماتمی مضامین اور سر سیّد میموریل فنڈ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ باب نہم میں سر سیّد و علی گڑھ پر تبصرہ، مولوی ڈاکٹر عبدالحق کا بیان اور مولوی ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم بھارت کا بیان جیسے موضوعات شامل ہیں۔ باب دہم سر سیّد سے متعلق حدیث دیگراں، مسٹر ایچ۔ اے۔ آر گب، ایچ جی رالنسن۔ سر سیّد پر ایک مضمون، ولفریڈ کنٹویل سمتھ۔ ایک سوال، سر سید احمد خاں اور جمال الدین افغانی، رام بابو سکسینہ، شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد، حسام الملک، نواب سید علی حسن خان، عبدالرحمان صدیقی ایم۔ اے عیگ بارایٹ لاء، سابق گورنر مشرقی بنگال، پروفیسر آرنلڈ سابق پروفیسر ایم۔ اے او کالج اور جے کینڈی۔ بی۔ ایس سی ریٹائرڈ کمشنر جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سیّد احمد خاں ۵ ذی الحج ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد اُموی اور عباسی خلافت کے دور میں ایران اور ہرات میں آباد ہوئے۔ بعد ازاں شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آ گئے۔ عالم گیر ثانی نے ان کے دادا سید ہادی کو پہلے جواد علی خاں کے خطاب کے ساتھ ساتھ منصبِ ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ وسہ اسپہ سے نوازا پھر جواد الدولہ کا اضافہ کر کے مختلف مناصب عطا کیے۔ ان کے والدِ محترم میر متقی کا تعلق بھی دربار سے رہا۔ ان کی والدہ محترمہ عزیز النسا بیگم، خواجہ فرید، جو ریاضی کے عالم اور زبردست مدبر تھے، ان کی دختر عزیز تھیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں، اس لیے اپنے بیٹے کی تربیت اسلامی اخلاق اور اصول پر کی۔ سر سیّد احمد خاں نے فارسی عربی متداولہ درسیات کے

علاوہ ریاضی اور طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ دہلی کے ہم عصر علما و فضلا مولوی امام بخش صہبائی، آزردہ اور غالب وغیرہ کی علمی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے۔ عنفوانِ شباب میں رنگین صحبتوں میں رہے، میلے، ٹھیلے، رگ رنگ کی محفلوں اور نمائشوں میں بھرپور شرکت رہی۔ اسی دوران مطب بھی چلتا رہا۔ ۱۸ یا ۱۹ سال کی عمر میں خالہ کی بیٹی سے نکاح ہو گیا۔

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد انگریزی دفتر میں ملازمت کر لی۔ تین سال کے بعد منصف کے عہدے پر براجمان ہوئے۔ قلعہ و دربار کے موروثی تعلقات کی بنا پر دربارِ شاہی میں آئے تو جواد الدولہ عارف جنگ کے خطاب سے نوازے گئے۔ خطاب کی قیمت نہ ہونے کے باوجود عوام میں وقعت ضرور تھی۔ غدر کے دوران سر سیّد احمد خاں بجنور میں تھے۔ محمود خاں اور مقامی جاٹوں نے بجنور کا محاصرہ کر لیا تو سر سیّد احمد خاں جیس یورپین کے ساتھ محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور میرٹھ پہنچ گئے، لیکن یہاں گھر بار لٹ گیا۔ ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ دو ماہ بعد والدہ محترمہ اس صدمے سے جاں بر نہ ہو سکیں اور خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ہنگامۂ غدر کے اختتام پر ہندوؤں نے غدر کا ذمہ دار مسلمانوں کو ثابت کر کے اپنی جان بچالی۔ سر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ ضلع کے تمام تر اختیارات پاس ہونے کے باوجود کسی سے انتقام نہ لیا۔ سر سیّد اپریل ۱۸۵۸ء میں صدر الصدوری پر ترقی پا کر یہیں متعین ہوئے تو انگریز حکومت نے انھیں بھی مراد آباد جائیداد ضبطی کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا۔ قحط اور محتاج خانے کا نظم و نسق بھی سنبھالا۔ اسی عہد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ ہنگامۂ غدر سے متاثر ہو کر رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند تحریر کیا اور مسلمانانِ ہند کو انگریز سرکار کے عتاب سے بچانے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۰ء میں رسالہ محمڈنز آف انڈیا جاری کیا اور مسلمانوں کی سچی خیر خواہی کی۔

۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی اور مدرسہ قائم کیا۔ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلے کے باعث سوسائٹی کو علی گڑھ منتقل کر دیا۔ ۱۸۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ

کا اجرا کیا تو اس میں ہومیو پیتھک طریقہ علاج کی ترویج کے لیے مہم شروع کردی۔ اناوہ وربنارس سے اردو مخالفت کے آغاز اور سفرِ انگلستان کے باعث سوسائٹی کی ترقی رک گئی۔ انگلستان میں قیام کے دوران انھیں ستارۂ ہند کے خطاب سے نوازا گیا۔

۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان لوٹنے کے بعد تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو سوسائٹی پریس سے شائع کیا گیا۔ اسی شمارے میں سرسیّد نے اس کے مقاصد کا تعین بھی کردیا:

> ''اس پرچے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سول لائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلاسکیں۔''[۳۱]

تہذیب الاخلاق میں مذہبی مضامین شائع تو کیے گئے، لیکن بہ امر مجبوری، کیوں کہ اس کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ جن غلطیوں کے سبب مذہب پر الزام آتا ہے، ان کی تصحیح کی جاسکے۔ کالج کی مصروفیات کی بنا پر ساتویں سال اسے بند کردینا پڑا۔ ان سات سالوں کی اشاعت کے ثمرات اور نتائج سامنے آئے، ملاحظہ ہوں:

۱۔ مغربی خیالات کو مشرقی زبان میں اس خوبی سے بیان کیا گیا کہ ان کی حسانت اصل سے بھی زیادہ ہوگئی۔ بعض اہلِ فضل کے خیال میں اردو زبان اتنی قابل ہی نہ تھی کہ مغربی خیالات اس میں سماسکیں۔

۲۔ اس پرچے نے لفظ ''قوم'' کا مطلب واضح کرتے ہوئے قومی ہمدردی، قومی عزت، قومی محبت و مودت، قومی بھلائی اور قومی خوشی کا احساس پیدا کر دیا۔

۳۔ نیچر یعنی فطرت کے مضامین اس پرچے میں درج ہوئے۔ جس سے لوگوں نے جانا کہ مضمون نگاری اس کا نام ہے کہ جو بیان کہ دل کے اندر تاثیر پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ یہی ہے۔ انسان کے خیالات کے

مخرج کو اور ان سے جو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، ان کے فرق کو بھی بتلاتا ہے۔

۴۔ باہمی ارتباط اور اتحاد اور ملاقات اور معاشرت میں موجود برائیوں کو بیان کیا اور سمجھایا کہ سچی محبت اور موانست اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی، جب تک باہمی ہم سری اور آزادی نہ ہو۔

۵۔ زمانہ گزشتہ کی سرگزشتوں کو خوب دکھایا، حال کی بدیوں کو اجاگر کر کے شرم دلائی اور مستقبل کی فلاح و بہبود سے دل و جان کو تقویت دی۔

۶۔ مذہبی مسائل کے پیش نظر تہذیب قومی کے مضامین لکھے گئے، لیکن بحث طویل ہونے کی بنا پر انھیں ترک کر دیا گیا۔

۷۔ بعض اکبر علما اور حکما کی تعصب کے سبب رائے تھی کہ اسلام ایسا مذہب ہے، جس کے باعث اہلِ اسلام میں اعلیٰ درجے کی شائستگی پیدا نہیں ہوسکتی، ان کے دلائل کو جواں مردی اور عمدہ دلائل سے رد کیا۔

۸۔ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی زبان کے بارے میں بسی وحشت اور تعصب کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

سرسیّد نے لندن سے واپسی کے بعد بنارس میں ''مجلس خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' کی تاسیس کا اعلان کر کے اس کے مقاصد بھی بیان کر دیے۔

مجلس اس بات کی تفتیش کرے کہ:

۱۔ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں؟

۲۔ علومِ قدیمہ مسلمانوں میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے؟

۳۔ جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرے۔[۶]

۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو کمیٹی کا پہلا اجلاس بنارس میں ہوا، جس میں سرسید سیکرٹری

منتخب ہوئے۔ مدت کا تعین کرتے ہوئے مقاصدِ مشتہرہ پر عمدہ مضامین لکھنے والوں کے لیے تین انعام مقرر کیے گئے۔ اس کارروائی کو مشتہر کیا گیا تو ۳۲ مضامین موصول ہوئے، جن کا خلاصہ سرسید نے مرتب کیا اور نتائج اخذ کیے۔ ان میں سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے علومِ قدیمہ کو محفوظ رکھنے اور علومِ جدیدہ سے استفادہ کرنے کے لیے اپنی ضرورتوں کے مطابق تعلیم و تربیت کا خود انتظام کریں۔ رپورٹ کا ترجمہ انگریزی صوبائی اور مرکزی حکومت کو بھی بھیجا گیا، جس کا حوصلہ افزا جواب ملا۔

سرسید نے ایک دارالعلوم کا منصوبہ مرتب کیا، جس کے مطابق:

۱۔ اپنی قومی و مذہبی تعلیم میں عام تعلیم، جس میں دینیات، ادب، ریاضی، طبیعات تھی۔

۲۔ خاص تعلیم میں سائنس اور فنی تعلیم انجینیری، حیوانات، نباتات، کیمیا، طبقات الارض کو رکھا۔

۳۔ دارالعلوم میں تین مدارس انگریزی، اردو، عربی و فارسی کے تجویز کیے وردہ اصول و ضوابط بیان کیے، جن پر مدارِ تعلیم تھا۔

کمیٹی نے یہ منصوبہ کی منظوری دے دی تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مساعی تیز کر دی گئیں۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مولوی کریم الدین (ڈپٹی کلکٹر و رکن اسمبلی) نے اس کا افتتاح کیا۔ دارالعلوم نے امید افزا کامیابی حاصل کی، جس کے سبب ۱۸۷۶ء میں صیغہ علوم مشرقی بھی قائم ہو گیا۔ طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف اور میڈل رکھے گئے، یوں اس کے ثمرات عوام تک پہنچائے گئے۔

۱۸۳۷ء میں سررشتہ دار کی ملازمت سے سرسید کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں منصف کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۸۵۸ء میں صدر امین کا عہدہ ملا؛ ۱۸۶۷ء میں عدالتِ خفیفہ کی ججی پر ترقی ملی اور ۱۸۷۶ء میں اپنی قومی مصروفیات کی بنا پر درخواست کر کے پنشن حاصل کر لی۔

مدرسہ اور کالج کا نصاب تو سرکاری سررشتہ تعلیم اور یونی ورسٹی کے تابع تھا، لیکن

ابتدا سے مذہبی تعلیم کا نظام و نصاب مخصوص تھا۔ ترتیب نصاب، نگرانی اور امتحان کے لیے سنی و شیعہ اصحاب کی جداگانہ کمیٹیاں تھیں، جن میں ان فرقوں کے علما بھی تھے۔

۱۸۷۸ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک کے تعلیمی نتائج کے مطابق مسلمانوں میں ۱۳۶ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ، ۱۴، ایل ایل بی اور پانچ وکیل ہوئے، جب کہ ہندوؤں میں ۲۲ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ، ۸، ایل ایل بی اور ۷ وکلا بنے، یعنی کل ملا کر ۱۵۸ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ، ۲۲، ایل ایل بی اور ۱۲ وکلا کامیاب رہے۔

فنڈز کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے سر سید نے قرب و جوار کے دورے کیے۔ ایسے دوروں کی ابتدا ۱۸۷۳ء میں پٹنہ عظیم آباد سے ہوئی۔ اسی سال پنجاب کا دورہ بھی، جہاں اہلِ پنجاب نے سر سید سے دلی عقیدت کا اظہار کیا۔ ۱۸۸۴ء میں ایک بار پھر پنجاب کا دورہ کیا تو بہت سی رقم عطیات کی صورت انھیں موصول ہوئی۔ اسی سلسلے میں نیشنل والنٹیر اور بیلیفیکٹر بنائے، جنھوں نے گلے میں جھولیاں ڈال کر جو بھی ممکن ہوا، جمع کیا۔ سر سید خود بھی ایک والنٹیر بنے۔ پانچ سو روپے کا عطیہ دینے والوں کے نام کے سنگی کتبے اسٹریچی ہال میں بہ طور یادگار نصب کیے گئے۔ کالج کے احاطے کی تعمیر کے لیے بیس روپے کا چندہ دینے والوں کے نام کا پتھر احاطہ کی جالی پر لگایا گیا۔ مسلم ریاستوں سے بھی وقتاً فوقتاً امداد ملی اور اضافہ بھی ہوا، لیکن اخراجات بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے پورے نہیں ہوتے تھے، جس کے لیے ۱۸۹۰ء میں ''سر سید تھیٹر اور ممتاز اصحاب کا ایکٹنگ'' کا چونکا دینے والا اشتہار دیا گیا۔ ۶ فروری چہار شنبہ تاریخ مقرر کی اور ٹکٹ کی شرح پانچ، تین، دو اور ایک روپیہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر قوموں نے بھی فیاضی کا ثبوت دیا۔ مسلم مگر متعصب نوابوں کا تعصب سر سید کی زندگی میں تو ختم نہ ہو سکا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی تجوریوں کے تالے بھی کھل گئے، کیوں کہ قوم کا دردان کے دلوں میں عود کر آ گیا۔ محنتِ شاقہ سے جمع کی گئی امدادی رقم میں سے ایک لاکھ سترہ ہزار روپے کا غبن ہوا۔ دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال نے سر سید کے اعتماد سے مطمئن ہو کر یہ غبن کیا۔ معلوم ہونے پر حوالات میں ڈال دیا گیا تو اس نے خودکشی کر لی۔

سرسید کے مخالفین کی کوئی کمی نہ تھی۔اس کے پیچھے خاص طور پر مذہبی تعصب کارفرما تھا۔ان مخالفین میں شاید سب سے بڑا نام سید جمال الدین افغانی کا ہے، جنھوں نے سرسید کو سرسید احمد خاں کو انگریزوں کا مفد حاصل کرنے والا نیچر پرست اور دہریہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔اس مخالفت میں شعرا کا ایک طبقہ بھی شامل تھا۔اسی کے ساتھ ساتھ سول سروس کے انگریز مخالفین بھی موجود تھے جو خفیہ یا علانیہ طور پر سرسید کی مخالفت کرتے تھے۔اس کے باوجود سرسید اپنے مشن سے پیچھے نہ ہٹے اور اپنی زندگی وقف کر دی۔

''محمڈن کانگرس (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)'' نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں آبِ حیات کا سا کام کیا۔سرسید اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانوں کے دلوں میں غیرت، جذبہ، حوصلہ اور قومی تعلیم میں امداد اور اپنی پس ماندگی کا احساس پیدا کیا۔اس کے علاوہ اردو ادب نے بھی فروغ پایا۔۱۸۸۲ء میں حکومتِ ہند کے تعلیمی کمیشن کے صدر ڈاکٹر ہنٹر نے کالج کا معائنہ کیا تو تعریف کیے بنا نہ رہ سکے اور کہا کہ اپنی مدد آپ کے تحت اسی طرح کے چند اور ادارے قائم ہو جائیں تو ہندوستان میں تعلیمی کمیشن کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سرسید کی اس کامیابی کے پیچھے ان کی مثبت سوچ اور رویہ، ان کے قابل ترین رفقائے کار، اعلیٰ حکام کی اخلاقی تائید، یورپین اور ہندوستانی سٹاف کی لگن اور محنت کارفرما رہی۔

سرسید کا سیاسی نظریہ بالکل واضح اور دوٹوک تھا۔چناں چہ ۱۸۸۲ء میں جب وہ امپیریل کونسل کے ممبر تھے، لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ مسلم قومیت کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی۔بعد ازاں موت سے پہلے ایک بیان میں صاف بتا دیا کہ مسلمانوں میں بہ لحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے، بل کہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور کل مومن اخوۃ کا خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے۔[8]

انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد جب سرسید مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی طرف متوجہ تھے، جہاد اور وہابیت کے مسائل نے جنم لیا۔ اگرچہ سرسید نے مضامین لکھ کر انگریزوں کو کچھ رام کرنے کی کوشش کی، لیکن ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی تحقیق کے ذریعے ثابت کر دیا کہ مسلمان عیسائیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہو سکتی، بل کہ انگریزی حکومت کے قبول کرنے میں ان سے سرد مہری کی توقع زیادہ ہے۔

کانگرس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں سول سروس کے ایک پنشن یافتہ رکن مسٹر اے۔ او۔ ہیوم نے ڈالی تھی، جس کے لیے اس نے لارڈ ڈفرن کی تائید حاصل کی تھی، مگر اس کے پہلے ہی اجلاس میں ابتدائی تقرر بہ جز چپڑاسیوں کے مقابلہ سے کیے جائیں اور مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں انتخابی طریقہ رائج ہو۔ آغاز میں حکومت کی حمایت اور بعد از اں نکتہ چینی نے زور پکڑا تو لارڈ ڈفرن نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سرسید نے دو سال تک کانگرس کے مطمحِ نظر اور کارروائی کا بہ غور مطالعہ کیا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت اختیار کرنے سے علی الاعلان روک دیا۔

سرسید سلطان ترکی کو بھی اموی اور عباسی خلفا کی طرح بہ طور ایک بادشاہ یا سلطان کے ایک خلیفہ مانتے تھے، لیکن ان کے دل میں ترکوں اور ترکی کے ساتھ محبت اور اس کی عظمت کا نقش قائم تھا۔ ۱۸۷۷ء میں ترکی سفیر کا علی گڑھ کالج میں پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اسی سال ترکی اور روس کی جنگ میں زخمیوں اور یتیموں کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا، جس کے سیکرٹری خود سرسید تھے۔ پھر ترکی اور آرمینیا کی جنگ میں انھیں یہ خدشہ لاحق رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودیوں کی طرح مسلمانوں کا اپنا کوئی بھی ملک اس دنیا میں نہ رہے، لیکن ترکی کی فتح نے مسلمانانِ ہند کو مسرور کر دیا۔

سرسید نے جس پالیسی کا اظہار کیا، وہ ان کے مکمل غور و خوض کے بعد پیش کی گئی لیکن سر ولیم ویڈربرن نے ۱۸۸۸ء میں ایک مضمون کے ذریعے اس امر کو ہوا دینے کی کوشش کی کہ سر آکلینڈ کالون لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ اور لارڈ ڈفرن نے مل کر سرسید

احمد خاں کو مخالفت پر آمادہ کیا۔ سر اے ہیوم نے سر آکلینڈ کالون کے نام ایک کھلی چٹھی کے طور پر سلسلہ مضامین شائع کیا اور یہ الزام لگایا، جس کی سر آکلینڈ کالون نے پر زور تردید کی۔

کانگرس ایک جمہوری حکومت کا قیام چاہتی تھی، لہٰذا اس نے مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ ایسی حکومت اسلام کے عین مطابق ہے۔ الہ آباد کے ممتاز کشمیری پنڈت وکیل اجودھیا ناتھ کا ایک مضمون ملاحظہ ہو

> ''چوں کہ مذہب سلام کے پہلے چار خلفا موروثی قاعدہ کے علاوہ ایک دوسرے قاعدے سے منتخب کیے گئے تھے، اس لیے اس زمانہ میں ایک ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ تھی، لہٰذا وہ تمام مسلمان جو کانگرس کی مخالفت کرتے ہیں یزید کے پیرو ہیں۔''[۱۴]

۱۸۹۳ء جسٹس محمود اور چیف جسٹس کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ جس کے باعث سید محمود مستعفی ہو گئے۔ کانگرس نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ سرسید نے اپنی سیاسی پالیسی تبدیل کر کے اس بات کے حامی ہو گئے ہیں کہ ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان ہو کرے اور یہ کہ وہ انگریز حکام اور ان کے کاموں کے مخالف ہو گئے ہیں، جس کی سرسید نے سختی سے تردید کی، جب کہ مولانا شبلی نعمانی نے مسلم لیگ کے سرسید کے خلاف پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کی کوشش کی۔ بعض معاملات میں سرسید کی بے بسی اور چند واقعات کے حوالے سے ان کی جرأت کی طرف اشارہ کیا:

> ''ایسے بہادر کو گردوپیش کے واقعات نے اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام سلامی پبلک کو سیاست سے روک دیا، یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا، کس چیز نے یہ اختلاف پیدا کر دیا۔ ان سوالات کا آج جواب دینا غیر ضروری بل کہ مضر ہے۔''[۱۵]

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کر کے شبلی کی وہ ترجمانی کی جو ان کے بھی وہم و گمان میں نہ تھی۔ ۱۹۱۹ء میں میثاقِ لکھنؤ کے نتیجے میں مسلمانوں اور

کانگرس میں اشتراکِ عمل ہوا۔۱۹۲۰ء میں کانگرس کی ترکِ موالات کی تحریک میں اکثر بااثر مسلمان رہنما شریک ہو گئے، لیکن فریب ظاہر ہونے پر کش مکش جاری ہو گئی۔

تصنیف و تالیف اور علمی مشاغل کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دور میں سر سید نے ۱۸۴۰ء میں جامِ جم مرتب کی، جس میں امیر تیمور صاحبقراں سے بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کی ۱۷ خانوں میں جدولی تاریخ درج ہے۔ دیگر کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ آثار الصنادید مرتب کرتے رہے، جو ۱۸۴۷ء میں مطبع سید الاخبار سے شائع ہوئی۔ یہ ایک لاثانی تصنیف ہے۔ یہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں تاریخی عمارات کے احوال پر مشتمل ہیں۔ چوتھے باب میں چند تاریخی عمارات کا حال شامل کرنے کے بعد آب و ہوا، زبانِ اردو اور ۱۱۷ مشاہیر کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی خواہش پر ایک انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹس آمادہ ہوا تو سر سید نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس کا ترجمہ کر دیا۔۱۸۶۱ء میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اسے فرانسیسی زبان کا پیراہن عطا کیا۔

دوسرے دور میں ۱۸۵۷ء میں ایک اور معرکتہ الآرا کتاب سر سید نے تالیف کی، جس کا پورا نام تبیین الکلام فی تفسیر التوریت والانجیل علیٰ ملتہ الاسلام ہے جو بعد میں تبیین الکلام کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی اشاعت شہر غازی پور سے سر سید کے ذاتی مطبع سے ہوئی۔ ایسے مضمون کے انتخاب کا محرک اسلام کی عظمت کا احساس تھا۔ چوں کہ عیسائی مشنریوں کی تبلیغ سے بہت سے مسلمان مرتد ہو رہے تھے لہٰذا سر سید نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو اسلام کی حقانیت اور عظمت کا یقین دلایا جائے۔

تصنیف و تالیف کا تیسرا دور سفر نامہ لندن سے شروع ہوتا ہے، جو ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ سر ولیم میور ایک مشہور مستشرق تھے جنھوں نے لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھی تھی، جو تعصب اور ضعیف روایات پر مبنی تھی۔ اسی کو دیکھ کر سر سید نے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مستند کتاب لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جب کتاب کی اشاعت ہوئی تو

اس میں مستند روایات کے ذریعے سر ولیم میور کے تعصّبات اور ضعیف روایات کا توڑ کیا۔ایک نسخہ سلطان المعظم ترکی کو بھی ارسال کیا گیا۔

تفسیر القرآن پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔تیرہ سورتوں کی تفسیر تو سرسید کی زندگی میں ہی شائع ہو گئی تھی، جب کہ تین سورتوں کی بعد میں شائع کی گئی۔

آخری تصانیف میں قدیم نظام دیہی، الدعا والاستجابۃ اور ازواجِ مطہرات شامل ہیں، جن میں سے آخرالذکر نامکمل رہی۔

سرسید کو فارسی اور اردو ادب میں کافی دل چسپی تھی۔انھوں نے مضمون نویسی کی ابتدا ۱۸۳۶ء میں ہوئی تو یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری ہفتہ مارچ ۱۸۹۸ء تک جاری رہا۔مضمون نگاری انگریزی صنفِ ادب ہے، جس کے اردو ادب میں اجرا کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ان کے خطوط اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔سرسید شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔۱۸۴۷ء سے ۱۸۸۹ء تک ان کے متفرق اشعار، مثنوی، قطعہ اور بیت وفرد فارسی زبان میں نظر آتے ہیں۔آثار الصنادید بھی ایک مدحیہ مثنوی ملتی ہے۔جب کہ اردو نظم کا صرف ایک حوالہ تذکرۂ شعرا خمخانہ جاوید (مؤلفہ لالہ سری رام) میں دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے اردو نظم کے اصلاحِ احوال کے لیے تگ و دو کی۔مسدسِ حالی کو اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر قیامت کے روز خدا نے پوچھ کہ تُو اپنے نامۂ اعمال میں کیا لایا تو کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ حالات کے پیشِ نظر سرسید مصلحت کا شکار تو ضرور تھے، لیکن دین سے غافل ہرگز نہ تھے۔

سرسید کے عقائد میں پندرہ امور بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، جو ان کے ایک خط سے مترشح ہیں۔اس کے مطابق اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے، نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں، قرآن مجید کلام الٰہی ہے، کوئی ایک آیت بھی خلافِ واقعہ نہیں، کسی ایک حرف کی کمی نہیں، نبی کریم ﷺ کی مانند کسی شخص کا قول وفعل بہ طور سند پیش نہیں کیا جا سکتا، سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی لازم ہے، احکامِ دین بالیقین اور

باقی مسائل اجتہادی اور قیاسی سب ظنی ہیں، انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں پہنچ سکتی، اوامر ونواہی حسن وقبح کے بتانے والے ہیں، تمام احکام مذہب اسلام کی فطرت کے مطابق ہیں، انسانی قویٰ کسی فعل کے ارتکاب کے محرک اور کسی کے مانع ہوتے ہیں، دین ان مجموعۂ احکام کا نام ہے، جو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، احکامِ دین دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک احکامِ اصلی، جو عین فطرت ہیں اور دوسرے وہ جن سے اصل احکام کی حفاظت مقصود ہے اور یہ کہ مصلحت نبی کریم ﷺ کی ذات سے خارج تھی، اس کی نسبت آپ کی طرف کرنا موجبِ کفر ہے۔

دائے فرض میں وہ جمع بین الصلاتین کو جائز سمجھتے ہیں۔ نماز قضا ہونے پر ندامت محسوس کرتے ہیں۔ جب تک طاقت رہی، روزے رکھتے رہے۔ حج کے لیے استطاعت نہ ہوئی تو حجِ بدل کے طور پر ۱۹۰۳ء میں مولوی مشتاق حسین نے اپنے حج کے موقع پر کرایا۔ جو بھی حاصل ہوا اعزہ وغربا میں تقسیم کیا۔ جمع نہیں کیا، اس لیے گور و کفن دوسروں نے کیا۔ جہاد بالسیف تو نہ کر سکے، لیکن جہاد بالقلم کیا۔ آپ ﷺ کی عقیدت ومحبت کو اپنا ایمان سمجھا اور شعائر اللہ کا ادب بھی کرتے رہے۔ انبیائے کرام کا احترام ان کے دل میں بہت زیادہ تھا۔ اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت کو مستحسن گردانتے تھے۔ آثارِ قدیمہ کی عظمت کے ویسے ہی قائل تھے، جیسے اسلاف کی عزت وحرمت کے۔ علما کو عقیدت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مسلمانوں کا طرزِ معاشرت ایران وعرب سے زیادہ ہندوانہ تھا، جس میں وہ تبدیلی کے خواہاں تھے۔ انھیں انگریزوں کے متعصبانہ رویے سے سخت نفرت تھی۔ قیامِ بنارس کے دوران انگریزوں کے ساتھ خورد ونوش کی محفلیں رہیں تو ان کے ساتھ حلال چیزیں کھانے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ شان وشوکت سے رہنا پسند کرتے تھے۔ تعلق کا پاس اور لحاظ رکھتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ مساویانہ اور ہندوؤں کے ساتھ معاندانہ تعلقات رکھتے تھے۔ اختلافِ رائے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ احباب کی قدر کرتے تھے۔ اپنی رائے سے پیچھے نہ ہٹتے تھے، اس سلسلہ میں وہ قدرے آمرانہ

طبیعت رکھتے تھے۔ پوتے سے خاص انس تھا اور طلبہ پر شفقت کرتے تھے۔۱۸۹۲ء میں ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) کے نام سے ایک سوسائٹی بنی۔ کسی کانفرنس کے موقع پر ریسٹورنٹ کے طور پر لگائی جانے والی دکان کی آمدن سوسائٹی فنڈ کے لیے مخصوص کردی۔ اسی سال مجلس الاخوان کے ممبر بھی بنے، جس کا مقصد طلبا کی اپنی آمدن سے حاصل سرمایہ کالج میں امداد کے طور پر دینا تھا۔

۱۸۹۸ء ہی وہ سال تھا، جس میں سرسید کی طبیعت ناساز ہونا شروع ہوئی، جو بالآخر ۲۷ اور ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کی درمیانی شب دس بجے ان کی رحلت پر منتج ہوئی۔ دوسرے دن غسل دیا گیا۔ مغرب سے ذرا پہلے آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ن کا صندوقچہ کھولا گیا تو صرف پانچ روپے برآمد ہوئے۔

زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے معروضی اندازِ تحقیق استعمال کیا ہے۔ انھوں نے سر سید کے سوانح کے حوالے سے عمیق مطالعہ کیا ہے، ور سرسید کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کیے ہیں جو دوسرے مصنفین کے ہاں کم نظر آتے ہیں۔ یہی اس کتاب کا خاصہ بھی ہے۔ بہ ہر حال یہ کتاب سرسید شناسی کی روایت میں اہم اضافہ کہی جا سکتی ہے۔ مؤلف نے سرسید احمد خاں کی زندگی اور کارناموں کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔

سرسید کی تعزیتی تحریریں (۱۹۸۹ء) از اصغر عباس

سرسید کی تعزیتی تحریریں ۱۹۸۹ء کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ وہ تحریریں ہیں، جو سرسید نے مختلف مذہب وملت کے افراد کی وفات کے موقع پر لکھ کر ارساں کیں۔ اصغر عباس نے اسے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا۔ یہ تالیف ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست میں مؤلف کے مقدمہ کے بعد ''علما اور مبلغین''، ''اہلِ علم وفن''، ''طلبائے کالج''، ''احباب ومعاصرین''، ''اہلِ صحافت''، ''ملازمین مدرسۃ العلوم'' اور ''روسا و اہلکارانِ حکومت'' کے عنوانات کی ذیل میں تعزیت نامے ترتیب دیے گئے ہیں۔

''علما اور مبلغین'' کے عنوان کے تحت جناب مولوی قاسم، جناب مولوی احمد علی صاحب، دیانند سرتی کی وفات، بابو کیشب چندر سین، مولوی محمد مظہر صاحب، جناب حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب، مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی فرنگی محل، شمس العلماء مفتی میر عباس صاحب مرحوم، پنڈت گوردت صاحب ایم اے، وفات نواب صدیق حسن خاں، بھوپال، ہائے! شمس العلماء مولوی محمد حسن صادق پور، وفات مولوی حافظ محمد اسماعیل صاحب، نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی اور حضرت شاہ فضل الرحمٰن ''کے لیے تعزیتی تحریریں شامل ہیں۔

''اہلِ علم وفن'' کے عنوان کی ذیل میں ہنری فرڈیننڈ بلوک مین کی وفات، نواب ضیاء الدین خاںؒ اور حکیم محمود خاں صاحب کے لیے تعزیت نامے درج ہیں۔

''طلبائے کالج'' کے عنوان کے حوالے سے مولوی محمد ایوب، افسوس صد افسوس، خلیفہ سید مہدی حسن اور خیفہ سید عنایت حسین کے لیے تعزیتی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔

''احباب و معاصرین'' کا عنوان حافظ عبدالرحمٰن صاحب، ہائے منشی محمد رمضان اور مولوی مرزا فتح محمد بیگ، سید میر ظہور حسین، خان بہادر قاضی سید رضا حسین اور خان بہادر مولوی محمد کریم کے لیے تعزیت ناموں پر محیط ہے۔

''اہلِ صحافت'' کے عنوان کے تحت مولوی سید رونق علی صاحب، افسوس صد افسوس اور انتقال پُر ملال شمس العلما خان بہادر مولوی کبیر الدین احمد صاحب کے لیے تعزیت ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

''ملازمین مدرسۃ العلوم'' کے عنوان کی ذیل میں حافظ عبدالرزاق، وفات منشی ذوالفقار خاں وفات احمد حسین خاں بی اے اور لالہ گلاب رائے کے لیے تعزیت ناموں کو شامل کیا گیا ہے۔

روسا و اہلکارانِ حکومت'' کے عنوان کے تحت واقعۂ جانکاہ (کرنل جی۔ ڈبلیو۔ ہیملٹن)، واقعۂ جانکاہ (اے۔ ایس۔ رابرٹس)، وفات دیوان مولوی سید اعظم الدین خاں، وفات دیوان کرپا رام، افسوس صد افسوس ہزار افسوس، حاجی فیض احمد خاں، ڈبلو۔ ایچ

سمتھ صاحب، نواب مرزا فیروز حسن خاں، جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب، وفات شیخ اعتقاد علی، حاجی الحرمین الشریفین نواب کلب علی خاں بہادر، مہاراجہ بہادر بنارس مرحوم، انتقالِ پُرملال نواب سر سالارِ جنگ، وفات مولوی عبدالقیوم صاحب، دہلی وردو نامی اور لائق شخصیتوں کی وفات، نواب منیر الملک، جنرل اعظم خاں، بابو ابھیناش چندر، نواب احمد اللہ خاں، میر ضامن علی صاحب، نواب عبداللطیف خاں، میر محمد حسین، وفات وزیر الدولہ خلیفہ محمد حسن خاں بہادر، راجہ شیو پرشاد، زندگی اور موت، مرثیہ مصائب اندلس، حواشی اور آخر میں مآخذ و مصادر شامل ہیں۔

جب علی گڑھ تحریک کا ظہور ہوا تو اس کا محرک اور روحِ رواں سرسید احمد خاں تھے۔ چوں کہ وہ یک دردمند دل رکھنے والے شخص تھے، لہٰذا پس ماندہ مسلمانانِ ہند کی راہ نمائی کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی آواز اثر پذیر تھی، جس کے باعث ان کی آواز برصغیر میں گونجنے لگی۔ مختلف طبقات، مختلف حلقہ جات اور مختلف اقوام میں ان کے روابط وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ شاید ہی کوئی طبقہ، حلقہ یا قوم ایسی ہو، جس تک سرسید کی آواز نہ پہنچی ہو۔ محبت کا مادہ سرسید میں معمولی افراد کی نسبت کچھ زیادہ ہی پایا گیا تھا، اسی لیے تمام تعلقات میں محبت کا عنصر بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ محبت تھی، جس نے ان کے تعلقات ان کے رفقا سے مضبوط اور دیرپا رکھے۔ وہ اس مقولہ پر مکمل طور عمل پیرا تھے کہ اگر ساری دنیا میرے قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کا نعم البدل ایک دوست مل جائے تو ارزاں ہے۔ ان کی یادداشت اور حافظہ بہت تیز تھا۔ جب بھی کسی شخصیت کی وفات پر اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اس کی سیرت کے نمایاں پہلو، وضع قطع اور عادات واطوار کی نمایاں جھلک ہمیں دکھا دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحئی لکھنوی فرنگی محل کی سراپا نگاری کا انداز کتنا دل کش ہے دیکھیے:

> ''دبلے پتلے اور پست قد مگر نہایت پاکیزہ رُو اور متناسب الاعضا تھے۔ رنگ نہایت صاف تھا اور چہرے سے ملاحت ٹپکتی تھی۔ مزاج میں نفاست تھی، خوش لباس اور خوش وضع تھے۔ گفتگو نہایت فصیح اور اخلاق از بس وسیع

تھا۔ علم و فن کو اپنا خاص کام سمجھتے تھے۔''[۲]

مولوی عبدالحئی تو ایک زندہ حقیقت تھے، جن کی سراپا نگاری سرسید نے کی، لیکن مجرد کیفیات کو مجسم صورت میں پیش کرنے کا ہنر بھی سرسید خوب جانتے تھے، اس لیے انھوں نے زندگی کا جو حلیہ پیش کیا اور زندگی نے موت کے اصرار پر جو اپنا خول اتارا، وہ محلِ نظر ہے:

''اندر سے کبڑی، ہونق، بے ڈول چڑیل، ننگی سیاہ رو، چہرہ اترا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری۔''[۷]

سرسیّد احمد خاں شخصیت کی تعمیر کے لیے عادات وخصائل میں فضائل اور اخلاق کو معیار سمجھتے تھے:

''عنایت اللہ خاں صاحب ان سب کے سرکردہ اور ایک فرشتہ صفت و رباعثِ افتخار اس قوم کے تھے۔ سچائی، صفائی، طینت، محبت اور دوستی کا برتاؤ ان پر ختم تھا۔ اپنی رائے اور اپنے نیک ارادوں پر ایسے مستقل تھے کہ کسی طرح اس میں ڈگمگاتے نہ تھے۔''[۸]

سرسید کے خطوط میں کہیں کہیں واقعہ نگاری، خاکہ نگاری کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے ذریعے نا صرف ہم مرحومین کی زندگی کے نقوش دیکھتے ہیں، بل کہ سرسید کی افتادِ طبع کا پتا بھی چلتا ہے کہ وہ کتنے کشادہ ذہن، وسیع القلب، روادار اور غیر متعصب شخص تھے۔ ان کی تعزیتی تحریریں خشک منطق پر مبنی نہیں، جو ان کے دیگر مضامین کا خاصا ہے، بل کہ ان میں پُرسوز اور کرب انگیز جذباتی فضا پائی جاتی ہے۔ کہیں خود کلامی تو کہیں بات چیت کا انداز، یہ تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ اثر آفرینی دیرپا ہے۔

ن کے بعض تعزیت نامے ایسے ہیں، جن پر مرحومین کا نام درج نہیں، بل کہ تحریر کے اندر نام موجود ہیں اور بعض تحریریں ایسی بھی ہیں، جن میں مرحومین کے نام پر تحریر کے اوپر یا تحریر کے اندر کہیں بھی روشنی نہیں ڈالی گئی، لیکن اندرونی شواہد سے یہ اندازہ

لگانا مشکل ہوتا ہے کہ سر سید کس شخصیت کی وفات پر اس کی تعزیت کر رہے ہیں۔اس مجموعے میں نہ صرف وفات کو شامل کیا گیا ہے،بل کہ یہ ایک تمثیلی مضمون ''زندگی اور موت'' اور سید یحیی قرطبی کے عربی مرثیے کے ترجمہ ''مرثیہ مصائبِ اندلس'' پر مشتمل ہے۔

حواشی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، احمد علی، کیشب چندر سین، مولانا محمد مظہر، حافظ محمد اکبر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، مفتی میر عباس، پنڈت گوردت، سید صدق حسن، مولوی محمد حسن صادق پوری، مولانا محمد اسماعیل، چراغ علی، ایچ۔ ایف بلوک مین، حکیم محمود خاں، حافظ عبدالرحمن، مرزا فتح محمد بیگ، سید ظہور حسین، سید رضا حسین، محمد کریم، مولوی رونق علی، منشی وجاہت علی، حافظ عبدالرزاق، منشی ذوالفقار خاں، احمد حسین، لالہ گلاب رائے، دیوان کرپارام، چوبے دھنپت رائے، حاجی فیض احمد خاں، عنایت اللہ خاں نواب کلب علی خاں، میرزا فیروز حسن خاں، میر لائق علی، مرزا سلیمان جاہ، جنرل اعظم الدین خاں، نواب عبداللطیف خاں بہادر، خلیفہ سید محمد حسن اور شیو پرشاد جیسی شخصیات کے مختصر حالاتِ زندگی شامل کیے گئے ہیں، جن سے وفیات کے چند پہلو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

س تالیف کے آخر میں مآخذ و مصادر کے زیرِ عنوان انھیں کتب و رسائل کا حوالہ شامل ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جامع اندازِ تحقیق اپنایا ہے۔انھوں نے سر سید کے سوانح کے حوالے سے عمیق مطالعہ کیا ہے اور سر سید کی زندگی کے ایسے واقعات پیش کیے ہیں جو دوسرے مصنفین کے ہاں کم نظر آتے ہیں۔یہی اس کتاب کا خاصہ ہے۔یہ کتاب سر سید شناسی کی روایت منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

سر سید احمد خاں کا اصلی روپ (۲۰۱۳ء) از علامہ مولانا مفتی محمد راشد محمود قادری رضوی

علامہ مولانا مفتی محمد راشد محمود قادری رضوی کی تالیف جسے مکتبہ نور بصیرت

لاہور نے فروری ۲۰۱۳ء کو شائع کیا۔ اس کتاب مین ان کا رجحان فرحاندانہ ہے۔ یہ تالیف ایک سواٹھائیس (۱۲۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست میں، وجہ تالیف (راشد محمود رضوی)، مقدمہ (راشد محمود رضوی)، ''باب: سرسید احمد خاں کا تعارف'' کے ذیلی عنوانات میں، ۱۔ تعلیم، ۲۔ بچپن کی عادات، ۳۔ عنفوانِ شباب، ۴۔ سرسید اور اس کی شرارتیں، ۵۔ سرسید، ناچ مجرے اور کبوتر بازی، ۶۔ سرسید کے خاندان مذہبی حالات، ۷۔ سرسید انگریز کا تنخواہ خوار، شامل ہیں۔ باب. کیا سرسید دو قومی نظریے کا حامی تھا؟'' کے زیرِ عنوان، ۱۔ جذبہ جہاد سرد کرنے اور مسلمانوں کو انگریز بہادر کی چوکھٹ پر جھکانے کا عظیم منصوبہ، ۲۔ یہود و نصاریٰ کے بارے میں قرآنی فیصلہ، ۳۔ سرسید احمد خاں کی انگریز نوازی، ۴۔ انگلش گورنمنٹ سرسید کے لیے خدا کی رحمت، ۵۔ غلام کذاب اور سرسید کی مماثلت، ۶۔ سرسید اور اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم، ۷۔ انگریزی نظامِ تعلیم کا مقصد کیا تھا؟ ۸۔ لارڈ میکالے، جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ باب علی گڑھ کالج اور انگریزی نظامِ تعیلم علمائے امت کی نظر میں'' ۱۔ امام المتکلمین مردحر مجاہد حق پرست علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ، ۲۔ امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ کی نظر میں علی گڑھ کالج اور انگریزی نظامِ تعیلم، ۳۔ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی علیہ الرحمۃ کی نظر میں انگریزی نظام تعلیم، ۴۔ فقیہ ملت جلال الدین احمد امجدی علیہ ارحمۃ کی نظر میں، ۵۔ حکیم الامت مفسر قرآن مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی علیہ الرحمۃ کی نظر میں، ۶۔ فاضل شہید علامہ مولانا عبدالحکیم اختر شاہ جہان پوری علیہ الرحمۃ کی نظر میں، ۷۔ مولانا ابوالبشیر محمد صالح صاحب رحمت اللہ عیہ کی نظر میں، ۸۔ دیوبند مکتبہ فکر کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی کی نظر میں، ۹۔ دیوبندی شیخ الحدیث مولوی ادریس کاندھلوی کی نظر میں انگریزی نظامِ تعلیم، ۱۰۔ ڈاکٹر اقبال کی نظر میں، ۱۱۔ معروف شاعر اکبرالہ آبادی کی نظر میں انگریزی نظامِ تعلیم جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ غرض کہ مصنف نے سرسید احمد خاں کے خلاف لکھنے اور کہنے والوں کا جم غفیر لگایا ہے۔

''سر سید احمد خاں کی اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں'' کے زیرِ عنوان ا۔مسئلۂ تقدیر کا انکار ۲۔خدا نہ ہندو ہے نہ عرفی ۳۔صحابہ، تابعین، تبع تابعین کی شان میں گستاخیاں ۴۔خدا تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں ۵۔وجود جبریل اور قرآن مجید (وحی) کے کلامِ الٰہی ہونے کا انکار ۶۔جنت کا انکار اور جنت کی نعمتوں سے مذاق ۷۔فرشتوں کے وجود کا انکار ۸۔جنات اور شیطان کے وجود کا انکار، ۹۔معجزاتِ انبیا کا انکار ۱۰۔قدرتِ خداوندی کا انکار ۱۱۔حجرِ اسود کی عظمت سے انکار ۱۲۔ارکانِ حج وحشی قوموں کی عبادت ہیں ۱۳۔احرام زمانہ جاہلیت کا لباس، بڈھے خدا پرست (ابراہیم) کی عبادت ہے (معاذ اللہ) ۱۴۔کعبہ شریف میں کوئی برکت نہیں اور نہ طوافِ کعبہ سے کچھ حاصل ہوتا ہے ۱۶۔حیاتِ شہداء سے انکار، ۱۷۔جن پرندوں کو عیسائیوں نے گلا گھونٹ کر مار دیا وہ حلال نہیں، جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔''باب' سر سید احمد خاں اپنوں اور غیروں کی نظر میں'' کے عنوان کے تحت ا۔اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ۲۔مصنف تفسیرِ حقانی جناب مولوی عبدالحق دہلوی صاحب کا فتوی ۳۔غیر مقلد مکتبہ فکر کے علامہ ثناء اللہ امرتسری کا فتویٰ ۴۔غیر مقلد عالم عبداللہ روپڑی کا فتویٰ ۵۔غیر مقلد مفسر صلاح الدین یوسف کا فتویٰ ۶۔وہابی مولوی عبدالرحمن کیلانی کا فتویٰ ۷۔وہابی مولوی فیض عالم صدیقی کا فتویٰ ۸۔غیر مقلد مولوی فضل الرحمن بن میاں محمد ۹۔دیوبندیوں کے حکیم الامت اشرف علی تھانوی کا فتویٰ ۱۰۔یوسف بنوری دیوبندی کا فتوی ۱۱۔وہابی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا فتویٰ ۱۲۔مولوی عبدالحی لکھنوی کا فتویٰ ۱۳۔ہندوستان کے علماء کا سر سید کے کفر پر اجماع ۱۴۔مکہ شریف میں مذاہبِ اربعہ کے چاروں مفتیوں کا فتویٰ اور ۱۵۔مدینہ شریف کے شیخ محمد امین مفتیِ احناف کا فتویٰ، کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس تالیف کے اسباب میں مؤلف نے ا۔سر سید کو قوم کا وفادار نہیں بل کہ غدار ثابت کرنا ۲۔علما کا سر سید کے نظریات بارے لاعلم ہونا اور ۳۔امام احمد رضا بریلوی کو اس الزام سے بری الذمہ ثابت کرنا کہ وہ تو مسلمان کو کافر کہہ دیتے تھے۔بیان کیے ہیں۔

انگریزی نظامِ تعلیم کے حوالے سے مؤلف نے جن مفکرین کی آرا شامل کی ہیں ان میں سب سے زیادہ سخت رائے دیوبندی شیخ الحدیث مولوی ادریس کاندھلوی کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

''قرآن و حدیث میں جہاں لفظ علم آیا ہے۔ اس سے مراد محض اور فقط علمِ دین ہے نہ کہ دنیاوی علوم وفنون وغیرہ۔ آج کل کے بعض سکولوں اور کالجوں کی نمایاں دیواروں پر حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ لکھی جاتی ہے۔ میرے استاذ ومربی شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک اس حدیث کو سکولوں اور کالجوں پر لکھنا اور اس سے دنیاوی علوم مراد لینا اندیشہ کفر ہے۔''[19]

''قدرتِ خداوندی سے انکار'' کی ذیل میں چند مثالیں مؤلف نے پیش کی ہیں تاکہ ثابت کرسکیں کہ کس طرح سرسید نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کردیا تھا؟ ان میں سے ایک مثال طورِ سینین کے حوالے سے انھوں نے سرسید کی تفسیر القرآن سے لی ہے اور اس کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''مطلب یہ ہوا کہ یہ نہ کوئی معجزہ تھا نہ قدرتِ الہیہ کا کوئی خارقِ عادت نشان تھا بلکہ اگرچہ اس زمانہ میں طورِ سینا کوہِ آتش فشاں نہیں ہے مگر اس وقت طورِ سینین ضرور کوہ آتش فشاں ہوا ہوگا جب بنی اسرائیل نے احکام تورات قبول کرنے سے انکار کیا ہوگا تو موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام نے ان کو لے جا کر طورِ سینا کی آتش فشانی کا تماشا دکھایا ہوگا۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔''[20]

''ارکانِ حج وحشی قوموں کی عبادت ہیں'' کے زیرِ عنوان مؤلف نے سرسید کی ارکانِ حج کی تکفیر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور تفسیر القرآن کے جن اقتباسات کا حوالہ دیا ہے انھیں مختصراً ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

''تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں نماز کے جینہ یہی ارکان تھے جو اب مذہب اسلام میں ہیں، نہ یہ ثابت ہے کہ اس نماز میں جیسے کہ وہ ہے اسی طرح پر رکوع وسجدہ تھ، جیسا کہ ہماری نماز میں ہے بل کہ اگر اس زمانہ کے حالات اور اس زمانہ کی وحشی قوموں کی عبادت پر خیال کریں، تو بہ جز اس کے اور کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ لوگ آپس میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور کودتے اور اچھلتے تھے اور وہ سارے کا سارا حلقہ اسی طرح چکر کھاتا جاتا تھا اور اسی جوش وخروش میں کھڑے ہو جاتے تھے اور سر ٹیک دیتے تھے اور اس کا نام پکارتے تھے یا اس کی تعریف کے گیت گاتے تھے جس کی وہ عبادت کرتے تھے اسی نماز کا نشان اسلام میں طریقہ ابراہیمی پر موجود ہے جس کا نام مذہب اسلام میں طواف کعبہ قرار پایا ہے۔''[۲۱]

مؤلف نے سر سید تفسیر القرآن سے ایک اقتباس کے حوالے سے احرام کی اس حیثیت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق سر سید نے اسے ایک وحشیانہ لباس قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لباس ابراہیمی دور کی یادگار ہے جسے نبی مکرم ﷺ نے تہذیب کے آغاز کے ایام میں اسی وحشیانہ صورت اور وحشیانہ لباس کو ہمارے بڑھے دادا کی عبادت کی یادگار میں قائم رکھا۔[۲۲]

سر سید کے عہد کے بیش تر علمانے سر سید پر کفر کے فتوے جاری کیے تھے، اس لیے سر سید کو کافر، ملحد، بے دین وغیرہ کے القابات سے بھی نوازا گیا۔ علمانے ان کے کفر کے حوالے سے جو فتوے دیے تھے ان میں سے سب سے زیادہ سخت اور جامع فتویٰ وہابی مولوی فیض عالم صدیقی کا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

''اسی ذہنی بے راہ روی نے ان سے قرآن ورسالت ومعجزات حدیث، فقہ، یمان، ملائکہ، جنت، دوزخ، نماز، حج، زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ کے متعلق عجیب عجیب باتیں کہلوائیں جن لوگوں کی نظر سے تفسیر احمدیہ یا خطبات احمدیہ

گزرے ہوں گے وہ جانتے ہیں کہ ان باتوں کی تاویلات میں آپ نے کیا کیا ٹامک ٹوئے مارے ہیں۔ میں یہاں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں سرسید نے کس قدر گستاخی اور بے باکی سے قرآنی مفہوم نہیں بل کہ صاف ترجمہ کو غلط طور پر بیان کرنے میں کتنی بددیانتی دکھائی ہے۔ باقی امور کی تاویلات کا احاطہ کرنا تو ایک طویل فہرست کا متقاضی ہے۔''۴۲

سرسید کے لیے کفر کے اجتماعی فتووں میں شدید ترین فتویٰ مکہ مکرمہ سے مذاہب اربعہ کے چاروں مفتیوں کا دیا جانے والا فتویٰ ہے جس کا متن مؤلف نے حیاتِ جاوید سے لے کر ان الفاظ میں درج کیا ہے:

''فتویٰ کا ماحصل یہ کہیے کہ''یہ شخص ضال اور مضل ہے بل کہ وہ ابلیسِ لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے خدا اس کو سمجھے واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا اس کو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آئے تو بہتر ہے ورنہ ضرب وحبس سے اس کی تادیب کرنی چاہیے۔ گر ولاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو نہیں تو خدا اس کو سمجھے اور اس کی ذلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا۔''۴۳

حاصلِ مطالعہ تالیف کا انتہائی مختصر انداز میں یہ ہے کہ مؤلف نے سرسید اور اس پر لکھی گئی تحقیقی و تنقیدی کتب کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید نے انگریزوں کی محبت میں پڑ کر اپنا ایمان داؤ پر لگایا، کفر کیا ہے اور اپنے لیے جنت کے بدلے جہنم کا سودا کر لیا ہے۔ مصنف کا اسلوب بہت سخت اور معاندانہ ہے۔

ذوق وشوق از مختار مسعود 2017ء

مختار مسعود 15 دسمبر 1926ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ دراصل مختار مسعود صاحب نے خود اپنی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ

ایک طرح سے ان باتوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ مقامِ پیدائش کے مغالطے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مختار مسعود کے والد، معروف اقبال شناس اور معاشیات کے استاد پروفیسر شیخ عطاء اللہ کا تعلق ضلع گجرات کے شہر جلال پور جٹاں سے تھا، وہ وہیں 1896ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شیخ عطاء اللہ 1929ء میں علی گڑھ میں معاشیات کے پروفیسر بنے تو علی گڑھ میں سکونت پزیر ہو گئے۔

مختار مسعود کی اس کتاب سے قبل کی دو کتابیں ''سفر نصیب'' اور ''لوحِ ایام'' کے ناموں سے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے اسلوب سے قارئین ادب خوب واقف تھے۔ تحریک پاکستان اور پاکستانی عصری مسائل ان کی کتب کے غالب موضوعات ہیں۔ وہ بہت پرانے لکھاری ہیں ذوق وشوق کی اشاعت سے قبل مصنف کی بہ طور ایک مستند اور مقبول لکھاری کے شناخت بن چکی تھی۔ خوش قسمتی سے ان کی اس کتاب کی مقبولیت کا گراف بھی کم وبیش وہی رہا جو آوازِ دوست کا تھا۔ جولائی 2017 میں مصنف کی ''حرفِ شوق'' اس فٹ نوٹ کے ساتھ مارکیٹ میں آئی ہے کہ جب نہ مصنف اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ ان کے بہت سے چاہنے والے۔ یہ کتاب قارئین میں کتنی پزیرائی پاتی ہے، یہ تو چند ہفتوں یا مہینوں کے بعد پتہ چلے گا مگر یہ المیہ کتاب کے ساتھ ہی قارئین تک ضرور پہنچے گا کہ اب مصنف اپنی آخری تحریر کی مقبولیت یا عدم مقبولیت سے بے نیاز اس رب کے حضور پہنچ گئے ہیں جہاں کتابوں کی مقبولیت کا نہیں اعمال کی قبولیت کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ رب رحیم وکریم اس مرحلے میں سرخرو فرمائے۔ آمین

کتاب شروع کرتے ہی آپ کو یہ احساس زیادہ شدت سے ہوتا ہے کہ مصنف اور ان کے بہت سے مداحین کے علاوہ وہ لوگ بھی نہیں رہے جن کی تحریک پر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ مگر مصنف کے مطابق انھیں ابتدا ہی سے یہ مسئلہ درپیش رہا ہے۔ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

میں دیر سے سر جھکائے لکھ رہا تھا۔ انہماک کا یہ عالم کہ اپنا ہوش نہ کسی دوسرے کی

خبر۔ خدا خدا کر کے تحریر مکمل ہوئی۔ میں نے پنسل کو میز کے اس دراز میں رکھ دیا جہاں پہلے ہی آدھی ہونے والی استعمال شدہ پنسلوں کا ڈھیر لگا تھا اور لکھنے والے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اس شخص کی تلاش میں ہوں جس کی خاطر میں نے اپنا طویل ترین مضمون لکھا ہے۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، میں نے لکھنے میں دیر کر دی۔ اسے جانے کی جلدی تھی۔ میری تحریر اپنے ایک مُحرِک اور قاری سے محروم ہو گئی میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک دن والد محترم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر سے فرمائش کی کہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیں اور دعا کریں کہ اسے بھی تصنیف و تحقیق کا شوق اور ہنر عطا ہو۔ اس واقعے کے کوئی دس بارہ برس کے بعد 'آوازِ دوست' شائع ہوئی۔ اتنا عرصہ کون کسی کی تحریر کا انتظار کرتا ہے۔ وہ دونوں بزرگ اس وقت تک اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ وقار عظیم اور ملا واحدی نے 'سفر نصیب' کا انتظار نہیں کیا۔ محمد طفیل (نقوش)، ابو الفضل صدیقی، جمیلہ ہاشمی اور ابنِ حسن برنی نے 'لوحِ ایام' کا انتظار نہیں کیا۔ محترم رشید احمد صدیقی نے 'آوازِ دوست' پڑھ کر مجھے دعا دی۔ اس کے بعد میری تحریر ان کی مزید دعاؤں سے محروم ہو گئی۔ ان حالات میں اگر توفیق احمد خاں نے 'حرفِ شوق' کا انتظار نہ کیا تو کیا ہوا!

مطالعہ کے دوران تاریخ کا ایک سفر بھی جاری رہتا ہے۔ مصنف اپنے قاری کو کبھی فردوسی کے ایران، کبھی مغل دور کے فتح پور سیکری، کبھی ملکہ الزبتھ کے انگلستان اور کبھی آرمینیا کے کوہ ارارات لے جاتے ہیں۔ کتاب واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس کا ہر پیرا سوچنے سمجھنے اور سیکھنے کا ایک دفتر ہے۔ کتاب میں علی گڑھ کی درس گاہ میں طویل ترین قیام کے دعویدار مسعود زیدی (مصنف علی گڑھ کی باتیں، علی گڑھ کی یادیں) کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں جب کہ خورشید الاسلام کا تذکرہ فخریہ انداز میں کیا گیا ہے جن کے شبلی نعمانی پر لکھے گئے تنقیدی مضمون کی داد مولانا ابو الکلام آزاد نے دی تھی۔ کتاب میں بمبئی کے ایک اخبار کے حوالے سے یہ تکلیف دہ واقعہ بھی درج ہے کہ تقسیم ہند کے چند سال بعد علی گڑھ یونی ورسٹی کے کچھ طلبا بمبئی یونی ورسٹی کے ہندو وائس

چانسلر سے ملے تو انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سرسید کون ہیں۔ یہ واقعتاً لاعلمی تھی۔۔۔ تجاہل عارفانہ تھا یا تعصب میں ڈوبے ہوئے بھارت کے اصل چہرہ تھا۔ اس پر قارئین کو غور کرنا ہوگا۔ انھوں نے سرسید کو جو سمجھا اور پایا لکھ ڈالا۔ ایک واقع تحریر کرتے ہیں۔

سرسیّد کی 1885 کی اپیل پر بیک کہنے والوں میں پنجاب کے ایک اسکول ماسٹر بھی شامل تھے جنہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جو پانچ سو روپے جمع کیے تھے وہ انہوں نے اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لیے چندے میں دے دیے۔ سرسیّد نے اس مخدوم کا نام سنہری حروف میں کندہ کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں جب تک علی گڑھ میں رہا مجھے وہاں کوئی نام آبِ زر میں لکھا ہوا نظر نہیں آیا۔ شاید اس وعدہ خلافی کی وجہ سے اب کوئی شخص اپنی بیٹی کا جہیز چندے میں نہیں دیتا۔

کتاب کے آخر میں وہ اختتامیہ ہے جسے آپ روانی میں پڑھ جائیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ خود مصنف کی تحریر نہیں بلکہ ان کی اہلیہ محترمہ کے قلم سے نکلے ہوئے جملے ہیں۔ کسی ادبی جوڑے کی تحریر میں اس قدر مماثلت کم از کم میری نظر سے اس سے پہلے نہیں گزری۔ یہ تحریر بھی اتنی ہی پختہ اور پراثر ہے جتنی پوری کتاب۔ اصلاً اختتامیہ کتاب کے دیباچے کا تسلسل ہے جو یقیناً مصنف کی موت کے بعد ان کی اہلیہ نے لکھا ہے۔ اختتامیہ میں بھی وہی موضوع آگے بڑھایا گیا ہے جس کا نوحہ مصنف نے دیباچہ میں کیا ہے۔ یہاں بھی علی گڑھ کے اس پار اور علی گڑھ کے اس پار کا تذکرہ ہے۔ یہاں بھی جدی اور دیر کا وہی دائرہ ہے جو تکمیل اور ادھورے پن کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ مصنف کی رفاقت میں 60 سال گزارنے والی ان کی رفیقہ حیات محترمہ عذرا مختار مسعود لکھتی ہیں:

''ایک دن، کم از کم دو نسلوں کے حائل ہو جانے کے بعد، میں نے بچپن کے ایک ساتھی سے اپنے عہد کے علی گڑھ کی سب سے اہم اور منفرد عمارت کا قصہ سنانے کا وعدہ کیا تھا یہ کتاب اسی وعدے کی تکمیل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بفضلہ یہ وعدہ وفا ہو سکا۔ آج وہ دوست جس کی فرمائش پر میں نے یہ کہانی سنائی مجھے کہیں بھی نظر نہیں آ رہا، غالباً

میں نے لکھنے میں دیر کر دی یا اسے جانے کی جلدی تھی۔۔۔۔؟''

کتاب کے جملہ حقوق یہ اختتامیہ لکھنے والی عذرا مختار مسعود کے نام ہیں۔ کتاب فائن بکس پرنٹرز سے طبع ہوئی ہے۔ 563 صفحات پر مشتمل ہے جس کی اشاعت کا اہتمام مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور نے کیا ہے۔ اگر نئے قارئین کے لیے کتاب کے بیک ٹائٹل پر مصنف کا تعارف بھی دے دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا کہ مصنف مستند لکھاری ہونے کے علاوہ تمغہ امتیاز کے حامل اور زرعی ترقیاتی بنک، پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے چیئرمین اور علاقائی تعاون برائے ترقی کے سیکرٹری جنرل رہ چکے ہیں۔ یہ کتاب ان کی آخری ادبی کاوش ہے سرسید شناسی کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مصنف نے عام سرسید شناسوں سے یکسر مختلف انداز تحریر اپنایا ہے۔

توقیتِ سرسید احمد خاں۔ تحقیقی تناظر میں (۲۰۱۷ء) از ڈاکٹر ذکیہ رانی

توقیتِ سرسیّد احمد خاں۔ تحقیقی تناظر میں ڈاکٹر ذکیہ رانی کی تحقیق و تالیف ہے جسے واحد پرنٹرز، اردو بازار کراچی نے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا۔ اس کے ناشر ''حلقۂ شاداب احسانی'' ہیں۔ یہ تالیف ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ چھے حصوں پر مشتمل ہے جن میں مؤلفہ نے اس کا انتساب اپنے استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر ذوالقرنین احمد شاداب احسانی کے نام کیا ہے۔ فہرست میں ''حق بہ حق دار رسید (پروفیسر ڈاکٹر ذوالقرنین احمد المعروف بہ شاداب احسانی)، قلم برداشتہ (ڈاکٹر محمد احمد علی)، معروضات (مؤلفہ)، توقیت سرسید احمد خاں تحقیقی تناظر، سیدیات، حواشی و تعلیقات، کتابیات'' جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ذوالقرنین احمد نے ''حق بہ حق دار رسید'' کے عنوان کے تحت اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''توقیتِ سرسید احمد خاں تحقیقی تناظر'' میرے سامنے ہے۔ اس کتاب میں سرسید سے متعلق جملہ خذات اور اہم کتب کا اس جامعیت کے ساتھ

ذکر کیا گیا ہے کہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ توقیت تحقیقِ سرسیّد کے لیے ،خذات کی جستجو اوران کے ثقہ ہونے میں نہایت وقیع ماخذ ثابت ہوگا۔"[۲۴]

ڈاکٹر محمد احمد علی کا اس تالیف کے بارے میں خیال ہے:

"سرسیّد کی یہ توقیت ان ماخذات سے تیار کی گئی ہے جن کو کسی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔جن میں تازہ ترین کتاب شافع قدوائی کی شامل ہے۔شافع قدوائی نے حیاتِ جاوید کے حوالے سے ماخذات دیے ہیں جنھیں رد کرنا کسی سطح پر بھی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذکیہ رانی نے نہائی اختصار کے ساتھ سرسید کی حیات ،ولادت سے تادمِ مرگ جس طرح سال بہ سال پیش کی ہے اور اختلافی پہلوؤں پر جس طرح تعلیقات کتابوں کے حوالوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں،اس سے سرسید احمد خاں سے متعلق مفروضات .ورغلط فہمیوں کا بہت حدتک ازالہ ہوگیا ہے جب کہ کتاب کا آخری حصہ سیدیات پر مشتمل ہے جس میں سرسید شناسی کے حوالے سے اہم کتب،رسائل وجرائد کے سرسید نمبروں کی تفصیل سے نئے محققین کے لیے آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں اور سرسید شناسی میں مدد ملنا بھی ایک لازمی امر ہے۔"[۲۵]

مؤلفہ نے اپنی اس تحقیق وتالیف کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"توقیتِ سرسید احمد خاں تحقیقی تناظر" میں سرسید احمد خاں کی حیات اور عہد کی تحدیدِ توقیت اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے جب کہ آخری حصے میں سیدیات یعنی سرسید کے حوالے سے ابتدا تا حال شائع شدہ ہم کتب اور رسائل وجرائد کے سرسید نمبر کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تا کہ اس جہت سے تحقیق کرنے والوں کی معاونت ہو سکے اور جن کتب کی یاد قصۂ پارینہ ہوگئی ان کا اعادہ کیا جاسکے۔"[۲۶]

مندرجہ بالا تین اقتباسات اس تالیف کے مندرجات کا اجمالاً احاطہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ کتاب اشاریہ سرسید ہے گویا اس میں مصنفہ کا اسلوب جامع اور تحریر میں روانی ہے۔انھوں نے سادہ اور سلیس انداز میں سوانح سرسید کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ کتاب سرسید کے حالاتِ زندگی کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے اور مختصر کتاب ہے۔

سوانح سرسید: ایک بازدید (۲۰۱۸ء) از شافع قدوائی

سوانح سرسید۔ایک بازدید شافع قدوائی کی تالیف ہے جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے اکتوبر ۲۰۱۸ء کو شائع کیا۔یہ تالیف ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔یہ بیس حصوں پر محیط ہے۔فہرست میں، حرفے چند (ڈاکٹر تحسین فراقی)، سرسید احمد خاں ایک بازدید (انتظار حسین)، سرسید شناسی کا ایک نیا باب (پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی) سرسید ایک عبقری شخصیت (پروفیسر صغیر ابراہیم)، پیش لفظ (پروفیسر شافع قدوائی)، سوانح سرسید۔ ایک بازدید (۱۔اجداد ۲۔والد ۳۔والدہ ۴۔ہمشیرہ ۵۔بھائی سید محمد خاں ۶۔پیدائش ۷۔بسم اللہ ۸۔تعلیم ۹۔شخصیت ۱۰۔اہلیہ ۱۱۔اولاد ۱۲۔سید حامد ۱۳۔سید محمود ۱۴۔اہلیہ ۱۵۔ملازمت ۱۶۔سرکاری اداروں سے وابستگی ۱۷۔وائسرائے قانون ساز کونسل کی رکنیت ۲۰۔حیات جاوید کا ماخذ، وفات) شامل ہیں۔

''پیش لفظ'' میں مؤلف نے سوانح سرسید۔ایک بازدید کی وجہ تخلیق ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''راقم الحروف نے سرسید کی صحافت کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا ورکوشش کی ہے کہ سرسید کی صحافت کے تمام مبسوط حوالوں کا مطالعہ کیا جائے۔سرسید کی صحافت کے نام پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ (گزٹ) یا تہذیب الاخلاق کا ہی ذکر کیا جاتا تھا۔سرسید نے ۱۸۶۰ء میں ایک شش ماہی رسالہ خیر خواہان مسلمانان نکالا اور ایک فارسی اخبار زبدۃ الاخبار سے بھی

منسلک رہے۔ نیز اودھ اخبار اور دیگر اخباروں میں بھی ان کے مضامین
تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ سید الاخبار سے ان کے تعلق کی نوعیت
کیا تھی؟ ان امور کو بھی موضوع مطالعہ بنایا گیا۔ تحقیقی مقالے کا اولین پہلے
سرسید کی سوانح سے متعلق تھا۔ راقم نے جب سرسید کی سوانح کے متعلق حالی
کے بیانات کی سرسید کے اپنے مندرجات معاصر شہادتوں سے توثیق چاہی
تو نتیجہ غیر متوقع طور پر منفی نکلا حیات جاوید کا سوانح حیات کے مرکزی
حوالے سے انکار کرنا کتمانِ شہادت کے مترادف ہے، مگر یوں بھی ہے کہ
سوانح سرسید کے ضمن میں حالی نے تحقیقی معروضیت کا لحاظ نہیں رکھا۔
یہی سبب ہے کہ سرسید کے خاندان کے ہندوستان میں ورود، ان کے والد
کے نام، بہن کے نام، بیوی کے انتقال اور تدفین، بڑی بہن اور بیٹی امینہ
کے انتقال کے زمانے کے تعین، سرسید کی ملازمت کی مدت، آغاز اور ان
کے مختلف عہدوں پر تقرر کے مندرجات میں تسامحات در آئے ہیں۔ اسی
طرح سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین سے متعلق تفصیلات کے بیان میں بھی
غلاط راہ پا گئی ہیں۔ راقم نے کوشش کی کہ سرسید کے سوانح کے ریکارڈ کو
جہاں تک ممکن ہو درست کر دیا جائے اور ان ثبوتوں کو یکجا کر دیا جائے جن
سے اب تک مطالعات سرسید میں صرفِ نظر کیا جاتا رہا ہے۔''[۲۷]

سرسید جداد سرسید کے خیال میں ہرات سے ہندوستان آئے لیکن کس دور میں؟
یہ سوال حل طلب ہے۔ مؤلف خیال میں سرسید، گراہم اور حالی نے اس ضمن میں مختلف
بادشاہوں کا ذکر کیا ہے لیکن حیات جاوید کی مقبولیت نے سرسید کے بیان کو بھی فراموش
کرا دیا۔ سرسید نے ۱۸۶۰ء میں رسالہ خیر خواہان مسلمانان کے پہلے شمارے میں
لکھا ہے کہ ان کے بزرگ عرب کے رہنے والے تھے لیکن اکبر اول کے عہد میں ہرات
سے ہندوستان آئے۔ سرسید کے اولین سوانح نگار کرنل جی۔ ایف۔ آئی۔ گراہم
کا خیال ہے کہ سرسید کا خاندان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ہندوستان آیا۔ جب

کہ حالی کے خیال میں سر سید کے بزرگوں کی ہندوستان آمد کا زمانہ شاہ جہانی عہد ہے۔ ایسی صورت میں مؤلف سر سید کے ہم نوا دکھائی دیتے ہیں۔

والد کا نام سر سید نے رسالہ خیر خواہانِ مسلمانان میں ہر جگہ سید محمد متقی لکھا ہے۔ گراہم نے سید محمد تقی اور حالی نے ہر جگہ میر متقی تحریر کیا ہے۔ مؤلف نے اس ضمن میں سر سید کے بیان کو ہی ترجیح دی ہے۔

والدہ کے زیرِ عنوان مؤلف نے سر سید کی والدہ محترمہ کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات کو نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''سر سید کے مطابق داد و دہش ان کی والدہ کی امتیازی صفت تھی اور وہ خیرات کا خاص اہتمام کرتی تھیں اور اکثر خیرات کی رقم جمع کر کے اس سے غریب پردہ نشیں عورتوں کی معاش اور غریب لڑکیوں کے نکاح کا بندوبست کرتی تھیں۔ صلۂ رحمی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور سر سید کے مطابق ان کی والدہ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ طور پر یا کسی حیلے سے ان کی امداد کرتیں۔ ان کی والدہ کا خدا پر بہت توکل تھا اور کہتی تھیں کہ دوا تو صرف حیلہ ہے، شفا تو اللہ دیتا ہے۔ اس زمانے کے رواج کے بر خلاف وہ منت، نذر و نیاز کی قائل نہیں تھیں۔ علاوہ ازیں گنڈے، تعویذ اور دنوں کے سعد و نحس ہونے پر انھیں بالکل یقین نہیں تھا۔ سر سید نے زندگی گزارنے کے مختلف گُر اپنی والدہ سے سیکھے تھے اور ان پر عمل پیرا ہو کر انھوں نے دنیا میں سرخروئی حاصل کی۔ انھوں نے سر سید کو بے جا فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہونے کا مشورہ دیا اور ہمیشہ حقیقت پسند اور عملی (Down to Earth) رہنے کی تلقین کی۔'' ۲۸

سر سید کے بھائی سید محمد خاں کے حوالے سے کچھ زیادہ تفصیلات معلوم نہ ہونے کا مؤلف نے اقرار کیا ہے اور ان حوالوں پر اکتفا کیا ہے جو سر سید، حالی اور پروفیسر

افتخار عالم خاں کی آرا کو شامل کیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی رائے کو زیادہ صائب قرار دیا ہے جس کے مطابق مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سید محمد خاں، مالک مطبع سید الاخبار، ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۸۴۵ء کو وفات پا گئے۔

سرسید کی پیدائش کے حوالے سے حالی اور گراہم کی مشترکہ آرا کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ سرسید کی ولادت اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کی حویلی واقع دہلی میں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو ہوئی۔ کیوں کہ سرسید نے رسالہ ''خیر خواہانِ مسلمانان'' ۱۸۶۰ء اور ''سیرت فریدیہ'' ۱۸۹۶ء میں اپنے سوانحی حالات تو لکھے لیکن اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ سرسید کی بسم اللہ غالباً ۱۸۲۲ء میں ہوئی تھی۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب نے بسم اللہ کروائی تھی۔

سرسید کی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ محترمہ عزیز النسا بیگم نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''گلستان'' کے کچھ اسباق ان سے پڑھے۔ بعد میں اپنے نانا سے ''بوستان'' کا درس لیا۔ سرسید کے سوانح نگاروں نے ابتدائی تعلیم کے حوالے سے سرسید کی والدہ اور ان کے نانا کا ذکر نہیں کیا۔ خواجہ فرید الدین احمد کے ایک ملازم مولوی حمید امدین نے سرسید کو ابتدائی کتابیں ''کریما''، ''خالق باری'' اور ''آمدنامہ'' پڑھائیں۔ حالی کے خیال میں سرسید نے گلستان، بوستان اور ایک آدھ کتاب کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا تھا۔

مؤلف کا خیال ہے:

> ''فارسی، عربی، ریاضی اور علم ہیئت کے بعد سرسید علم طب کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے دلی کے مشہور خاندانی حکیم غلام حیدر خاں سے طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ حالی کے مطابق سرسید نے طب کی ابتدائی کتابیں مثلاً قانونچہ، موجز، معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفسی امراض حین وغیرہ حکیم غلام حیدر خاں سے پڑھیں اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔''[۲۹]

حالی کے خیال میں سر سید کی رسمی تعلیم کا سلسلہ اٹھارہ انیس برس تک جاری رہا۔ بعدازاں سر سید نے خود مطالعہ کیا اور دہلی کی نامور ہستیوں غالب، صہبائی، ذوق، مومن اور دیگر مشاہیر کی مجلسوں میں بیٹھ کر کسبِ فیض کیا۔

سر سید کی شخصیت کے وہ امتیازی پہلو جن کی نشان دہی ان کے سوانح نگاروں، کرنل جی۔ایف۔آئی۔گراہم، خواجہ الطاف حسین حالی، ان کے رفقا اور تلامذہ مولوی سمیع اللہ، شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں اور میر ولایت حسین نے کی ہے ان میں جذبۂ تجسس، خوش طبعی، راست گوئی، بذلہ سنجی، خوش خلقی، مصلحت کوشی سے گریز، شامل ہیں۔

سر سید کی اہلیہ پارسا بیگم، سر سید کی سب سے چھوٹی خالہ فخر النسا بیگم کی اولاد تھیں جن کی وفات کے بعد مکان پارسا بیگم کو وراثت میں ملا تھا۔ گراہم اور حالی اس حوالے سے خاموش ہیں۔ پروفیسر افتخار عالم کی تحقیق سے مذکورہ باتیں سامنے آئی ہیں۔

سید حامد، سر سید کے بڑے بیٹے تھے جن کی ولادت ۲۴ صفر ۱۲۶۵ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۸۴۹ء کو دہلی میں ہوئی۔ سر سید اپنے دونوں بیٹوں سے محبت کرتے تھے اور انھیں عزیز از جان حامد اور عزیز از جان محمود لکھتے تھے۔ سفرِ انگلستان میں ان کے دونوں بیٹے ساتھ تھے۔ کثرتِ شراب نوشی سے سید محمد حامد ۳۰ جنوری ۱۸۹۴ء کو انتقال کر گئے۔ سید محمود ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم فارسی، عربی اور دینیات پر مشتمل تھی۔ انھیں فارسی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے ہائی سکول کا امتحان وکٹوریہ ہائی سکول بنارس سے اول درجہ میں پاس کیا۔ بعدازاں انگلستان چلے گئے۔ ساڑھے چار برس بعد بیرسٹرایٹ لاء کی تعلیم حاصل کر کے ستمبر ۱۸۷۲ء کو ہندوستان لوٹے۔ ان کے انگریزوں سے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ الہ آباد میں بیرسٹری کی۔ ان کی قانونی مہارت کے باعث میور کالج میں انھیں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ جولائی ۱۸۷۹ء میں وہ جوڈیشل سروس میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ہائی کورٹ کے جج تعینات ہوئے۔ ہائی کورٹ میں

جسٹس کے عہدے پر فائز ہونے والے پہلے مسلمان اور تیسرے ہندوستانی تھے۔ شمال مغربی، سرحدی صوبے کے چیف جسٹس سے اختلاف کی بنا پر سید محمود اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ ۸ مئی ۱۹۰۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ تیسرے نمبر پر ان کی بیٹی امینہ پیدا ہوئی۔

سرسید کی ملازمت کی ابتدا ان کے والد کی وفات کے بعد ہوئی کیوں کہ گھریلو اخراجات کی ذمہ داری اب ان کے کاندھوں پر آپڑی تھی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق سرسید نے ۱۸۳۸ء کو دہلی کچہری میں سررشتہ دار کی ملازمت سے آغاز کیا۔ افتخار عالم خاں کے خیال میں فروری ۱۸۳۹ء کو نائب منشی مقرر ہوئے۔ منصف کے عہدے پر سرسید کا تقرر ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو فتح پور سیکری میں ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں بجنور میں بہ طور صدر الصدور امین تعینات ہو کر پہنچے۔ مراد آباد میں سرسید کو قحط کے دنوں میں افسر بکار خاص مقرر کیے گئے۔ پروفیسر افتخار عالم کا بیان ہے کہ سرسید ۵۸ سال سے بھی کم عمر میں ریٹائر ہو گئے۔

''سرکاری اداروں سے وابستگی اور کمیٹیوں کی رکنیت'' کی ذیل میں، حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۸۵۹ء میں ۱۸۵۷ء کے متاثرین کی عرض داشتوں کی سماعت کے خصوصی سہ رکنی کمیشن میں رکنیت اور وائسرائے لارڈ لٹن کی جانب سے ۱۸۷۸ء میں گورنر جنرل کونسل کے ایڈیشنل ممبر، مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں قانون ساز کونسل کے دوبارہ رکن نامزد کیے گئے۔ ۴ نومبر ۱۸۸۶ء کو پبلک سروس کمیشن قائم کیا گیا جو سولہ ارکان پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک سرسید احمد خاں تھے۔ ۱۸۸۲ء میں حکومت کی جانب سے ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی قیادت میں امپیریل ایجوکیشن کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کا مقصد تعلیم کی پیشرفت اور دیسی زبانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ترویج کے امکانات کو موضوع بحث بنانا اور مروجہ تعلیم کا محاسبہ کرنا تھا۔ ہندوستان کی چار پریسیڈنسیوں میں ہر پریسیڈنسی کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کو ان کا رکن مقرر کیا گیا۔ ہندوستانی ممبران کے انتخاب میں سرسید بھی شامل تھے۔

''حیاتِ جاوید کا ماخذ'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے 'حیات جاوید' کے تسامحات کا تذکرہ کیا ہے کیوں کہ عام رائے یہ ہے کہ حالی کی یہ تالیف سر سید کے سوانحی کوائف، علمی کمالات، ادبی اکتسابات، صحافتی امتیازات، سیاسی فہم وفراست اور تعلیمی ومعاشرتی خدمات کے ضمن میں سب سے معتبر اور جامع حوالہ ہے۔ لیکن مؤلف نے حالی کی تسامحات اور ان کی نوعیت بیان کی ہے:

> ''حیاتِ جاوید کی ہمہ گیر مقبولیت کے علی الرغم کیا سر سید کی مذکورہ سوانح عمری مطالعۂ سر سید کا حرفِ آخر ہے؟ کیا خود سر سید کی تحریریں اور معاصر شہادتیں، حالی کے بعض بیانات اور دعاوی پر سوالیہ نشان قائم نہیں کرتیں؟ اور کیا حالی کے اندراجات Cross Referencing سے مشتبہ نظر نہیں آتے ہیں؟ ان سوالوں سے بھی بڑھ کر سوال یہ ہے کہ کیا حالی نے پہلی بار سر سید کی سوانح عمری اردو میں قلم بند کی تھی؟ کیا حیات جاوید کو حالی کی بلا شرکت غیرے تصنیف یا Independent اور Exclusive تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے؟ مذکورہ تشنۂ تحقیق سوال راقم السطور کے ذہن میں سر سید کی صحافتی تحریروں پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے پیدا ہوئے۔ سر سید کے ہفتہ وار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کی ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۹ء تک کی فائلوں اور سر سید کے ایک اور رسالہ ''خیر خواہان مسلمانان'' (۱۸۶۰ء) کے مطالعہ سے علم ہوا کہ حیات جاوید کے بعض مندرجات تحقیقی نقطۂ نظر سے صداقت سے بہ مراتب دور ہیں۔ حالی کا اصل ماخذ منشی سراج الدین کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ ہے جو اردو میں سر سید کی اولین سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب سر سید کے رفیق کار اور ان کے خصوصی مخلص حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس دتاولی کے ایما پر لکھی گئی تھی اور اس میں سر سید کی خود اپنی مرضی بھی شامل تھی اس مسودے کے خالق منشی سراج الدین کا ذکر سر سید شناسی میں شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ منشی سراج الدین کون تھے اور ان کا مسودہ کیوں اشاعت

پذیر نہ ہو سکا یہ مطالعۂ سرسید کا تشنۂ تحقیق پہلو ہے۔"[۳۰]

مؤلف نے استدلال کے ساتھ اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھا ہے کہ منشی سراج الدین نے الفاروق سے پہلے اپنا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ ان کی یہ کاوش سرسید کی نظر میں قطعاً معیوب نہیں تھی۔ ان کے بقول: اگرچہ منشی سراج الدین شہرت اور علم و فضل میں حالی کے ہم پلہ نہیں تھے لیکن انھوں نے پہلی بار سرسید کے لیکچر مرتب کیے اور سوانح عمری بھی تحریر کی۔ حیاتِ جاوید کا ماخذ انھی کا مسودہ ہے۔ منشی سراج الدین مطالعۂ سرسید کی اہم کڑی تھے لیکن ن کے کارناموں کو فراموش کر دیا گیا۔

سرسید کی وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوئی۔ حالی کی حیاتِ جاوید، میر ولایت حسین کی آپ بیتی اور ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات "مشاہدات اور تاثرات" کے حوالے سے جو باتیں سامنے آئی ہیں ان کے مطابق سرسید کی تجہیز و تکفین ان کے احباب کے چندے سے ہوئی، سراسر غلط ہے۔ حوالے کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ محسن الملک نے ۵۰ روپے دیے اور بتایا کہ سرسید کے ورثا نے تدفین کا انتظام نہیں کیا۔ پروفیسر افتخار عالم خاں نے لکھ کہ محسن الملک نے چندے کی بات مشتہر کر کے اخلاقیات کی پاس داری نہیں کی اور سید محمود کو ملعون ٹھہرایا ہے۔ حالاں کہ سید محمود نے ڈاکٹر کی فیس ۱۵۰ روپے ادا کی۔ اپنے دعوے کی تائید کے لیے پروفیسر صاحب نے مسٹر تھیوڈور بیک کے خط کو شامل کتاب کیا ہے۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے سرسید کی شخصیت کے مطالعہ کو اپنی تحقیق کی روشنی میں ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ انھوں نے حالی اور دیگر ناقدین سرسید کی تسامحات کی نشان دہی کر کے سرسید کے حوالے سے تحقیق کے نئے در وا کر دیے ہیں اور بہت سے سوال چھوڑے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، علی گڑھ تحریک، مرتبہ نسیم قریشی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، (س ن) ص ۷۰

۲۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، علی گڑھ، ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۵۰۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۴۔ علامہ شبلی نعمانی، بہ حوالہ سرسید تحریک کا رد عمل (ڈاکٹر صدیقہ ارمان) علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی: ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۷

۵۔ مولوی عبدالحق، سرسید احمد خان حالات و افکار، اسلام آباد: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ء، ص ۴

۶۔ ایضاً، ص ۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۰

۸۔ ایضاً، ص ۲۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۰۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۳۔ محمد امین زبیری مرحوم، تذکرہ سرسید، لاہور، پبلی کیشنز یونائیٹڈ، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ اصغر عباس، مرتبہ سرسید کی تعزیتی تحریریں، علی گڑھ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،

۱۹۸۹ء، ص: ۲۵

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۰۴

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ قادری رضوی، محمد راشد محمود، علامہ مولانا، سر سید احمد خان کا اصلی روپ، لاہور، مکتبہ نور بصیرت، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۴۔ ڈاکٹر ذکیہ رانی، توقیتِ سر سیّد احمد خاں تحقیقی تناظر، کراچی: واحد پرنٹرز، ۲۰۱۷ء، ص: ۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۷۔۸

۲۶۔ ایضاً ص: ۱۱

۲۷۔ شافع قدوائی، سوانحِ سر سیّد۔ایک بازدید، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۱۸ء، ص: ۲۱۔۲۲

۲۸۔ ایضاً، ص: ۵۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔۱۲۷

باب دوم

سرسیّد احمد خاں کے مذہبی افکار
اور ان پر لکھی گئی کتب (تنقیدی جائزہ)

یورپ میں غیر معمولی تخلیقیت کی ایک ثقافتی پیدائش چودھویں صدی میں رونما ہوئی۔ یہ پورے یورپ میں پھیلی اور سترھویں صدی تک برقرار رہی۔ اب اس دور کو قرون وسطیٰ اور دورِ جدید کے درمیان ایک پل کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تمام تر یونانی اور لاطینی کلاسیکل کلچر میں ازسرِ نو دل چسپی لی گئی۔ اس دور میں نہ صرف فلسفیانہ اور ریاضیاتی تحریریں جن کو قرون وسطیٰ کے متکلمین نے جذب کرلیا تھا، انھیں زندہ کیا گیا، بل کہ ایک تحریک ابھری جس کا مرکزِ نگاہ انسان تھا۔ یہ نئی انسان دوستی سب سے پہلے آرٹ میں اور پھر اٹلی کے معاشرہ کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں منعکس ہوئی۔ فلورنس اور وینس نے جلد ہی قرون وسطیٰ کے جاگیرداری نظام کو ترک کر کے پلوٹو کریسی یعنی سرمایہ داروں کی حکومت کا نظام اپنا لیا۔ یہاں تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ نئی سائنسی دریافتوں نے حالات تبدیل کر دیے۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک نشاۃ ثانیہ کے خیالات پورے یورپ میں پھیل چکے تھے اور اس کے نتیجے میں علم پر چرچ کی اجارہ داری شروع ہوگئی۔ تجی نشاۃ ثانیہ کا پہلا فلسفی فلورنس کا نکولو میکاولی تھا جس نے سیاست کی طرف توجہ کی۔ سائنس نے پرانے خیالات کی حاکمیت کو چیلنج کیا۔ پہلے نکولس کوپرنیکس پر جوہانس کپلر اور آخر میں گلیلیو گلیلی نے بتایا کہ کائنات کا بطلیموسی ماڈل غلط ہے جس میں زمین کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ گلیلیو کو اپنے خیالات پر سزا دی گئی لیکن مختلف سائنسی شعبوں میں پیش رفت نے کائنات کی کارکردگی کے لیے متبادل توضیحات پیش کیں چناں چہ فلسفہ کی ایک نئی قسم کی بنیاد رکھی گئی۔ عقل وخرد اور سائنسی دریافتوں کی فتح نے سترھویں صدی کی سوچ کو نئی جہت دی۔ برطانوی فلسفیوں بالخصوص فرانسس بیکن اور تھامس ہوبس نے سائنسی اور فلسفیانہ استدلال کو باہم کرنے میں سبقت لی۔ یہ ایسے دور کا آغاز تھا جس کو عقل وخرد کا دور کہا گیا۔ سترہویں صدی عیسوی میں یورپ کے انتہائی اہم فلسفیوں میں سے بیشتر نے گراں قدر کام کیا۔ اسی طرح جرمنی میں ہینز مصروف تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ اس فلسفی کا استدلالی عمل ایسا بہترین ماڈل مہیا کرتا ہے جو بتاتا ہے کہ دنیا کا علم کس طرح حاصل کیا جائے۔ ''میں کیا جان

سکتا ہوں؟“ کے سوال کی کھوج میں ڈیکارٹ کو عقلیت پسندی کے موقف کی طرف لے گئی جس کے مطابق علم صرف عقل سے آتا ہے۔ اسی یقین نے اگلی صدی میں پورے براعظم یورپ پر غلبہ پالیا۔ اسی وقت ایک بالکل مختلف فلسفیانہ روایت برطانیہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ سائنسی استدلال کے بعد جس کو فرانسس بیکن نے گلے لگایا۔ جان لاک اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے بارے میں ہمارا علم عقل کے ذریعے نہیں آتا بلکہ تجربہ کی بدولت آتا ہے۔ یہ نکتہ نظر جس کو تجربیت کہا جاتا ہے، سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے دوران برطانوی فلسفہ نے اسے مرتب کیا۔ یورپی عقلیت پسندی اور برطانوی تجربیت کے درمیان تقسیم کے باوجود دونوں میں یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں انسانوں کو مرکزیت دیتے تھے۔ (اس طرح کی تقسیم نے افلاطون اور رسطو کے فلسفہ کو الگ الگ کیا تھا) علم بہر حال انسان کو حاصل ہوتا ہے چاہے عقل کے ذریعے یا تجربے کے ذریعے۔ دونوں طرف کے فلسفی کائنات کی نوعیت کے بارے میں سوالات کھڑے کرنا چھوڑ گئے تھے۔ کیوں کہ ان کے جوابات آئزک نیوٹن جیسے سائنس دان دے رہے تھے۔ اب وہ اس طرح کے سوالات اٹھا رہے تھے کہ ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ اب انھوں نے انسانی ذہن اور ذات کی نوعیت کا کھوج لگانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن یہ نئے فلسفیانہ تار و پود اخلاقی اور سیاسی مضمرات رکھتے تھے۔ اشرافیہ اور بادشاہوں کو روشن خیالی کے نئے خیالات سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر پرانے حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو پھر ان کی جگہ کس قسم کا معاشرہ مرتب ہوگا؟ برطانیہ میں ہابس اور لاک نے سترھویں صدی کی ہنگامہ آرائی کے دوران جمہوری سوچ کی بنیادیں رکھ دیں۔ لیکن صورت حال کو بدلنے میں مزید ایک سو سال لگ گئے۔

علی گڑھ تحریک کی کئی ایک فکری بنیادیں تھیں جن میں سے دوسری فکری بنیاد عقلیت پر مرکوز تھی۔ سرسید کا نظریہ تھا کہ مذہبی معاملات میں عقل کا دخل ہونا چاہیے اور بغیر عقلی استدلال کے آنکھ بند کر کے مذہبی مسائل کو قبول نہیں کرنا چاہیے اس لیے انھوں

نے تقلید کی پر زور مخالفت کی ہے۔ سرسید نے قرآن پاک کی تشریح عقلی دلائل کی روشنی میں کی۔ انھوں نے قرآن شریف کے اکثر واقعات اور قصے کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مذہب اسلام کو سائنس، فلسفے اور قانون کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اس لیے سرسید نے تمام معجزات اور کرامات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ سرسید نے مذہب کا خول توڑا نھیں بل کہ اسے متحرک کرنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے سرسید نے مذہب کی محرک قوت سے بھی کام لینے کی کوشش کی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور سے ذہن زنگ آلود ہو چکے تھے سرسید نے عقل سلیم سے کام لے کر اسلام کا دفاع کیا اور ثابت کر دیا کہ اسلام زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بل کہ اس کے ذریعے نئے حقائق کی عقلی توضیح بھی کی جا سکتی ہے۔

سرسید کے مذہبی افکار و نظریات پر اس دور کے دانشوران ادب نے بہت نکتہ چینی کی تھی اور آج بھی ان کی اس مذہبی فکر سے مسلمان اتفاق نہیں کرتے ہیں اور سرسید کے عہد میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ اگر سرسید، مذہب اسلام کو عقل کے ترازو میں تولنے کی کوشش نہ کرتے تو اس دور میں ان کی اتنی مخالفت نہ ہوتی۔ ان کے اہم معاصرین حالی، شبلی، نذیر اور وقار الملک وغیرہ نے ان کے اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے باوجود مذہبی معاملات میں ان کی عقلیت پسندی سے اختلاف کیا۔ سرسید نے مذہبی معاملات کو عقل کے مطابق دیکھنے کی اس لیے کوشش کی تھی کیوں کہ مذہب اسلام میں بہت سی نئی چیزیں داخل ہو گئیں تھیں، سرسید ان بدعتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قرآن حکیم اور مستند حدیثوں کی پیروی کے بجائے مسلمانوں کو مختلف توضیحات اور تفاسیر کے مطابق عمل کرنا پڑا اس راہ سے غلط اور غیر معتبر روایتیں بھی شامل ہو گئیں۔ سرسید کا عقیدہ تھا کہ روایتیں جزو اسلام نہیں اور ائمہ مجتہدین کے قیاسی و اجتہادی مسائل کا اصل مذہب سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ سرسید ان مجتہدین کی رائے کو بس اتنی وقعت دیتے تھے جتنی کسی قانون دان کی رائے کو دی جا سکتی ہے۔ سرسید نے اسلام کی

ترجمانی میں انیسویں صدی کی عقلیت کو محدود معنوں میں استعمال کیا۔ انھوں نے اسلام سے ان سارے عناصر کو نکال باہر کیا جو ان کے نزدیک ن کے عہد کی ضرورتوں سے عدم مطابقت رکھتے تھے۔ انھوں نے مذہب کی اندھی تقلید کو سمِ قاتل قرار دیا اور ہر عہد میں مجتہد کی ضرورت واہمیت پر زور دیا۔

سر سید عقلیت پسندی کے ذریعہ مذہبی اصلاح کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے عہد کے تناظر کو مدنظر رکھتے ہوئے عقلیت پسندی پر زیادہ زور دیا۔ لوگوں کے خیال میں جدید تعلیم کفر اور الحاد کی طرف لے جاتی ہے اور سر سید عوام کو اس غلط فہمی سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مذہب اسلام کو جدید عوم اور سائنس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے قدیم روایات جو اسلام میں داخل ہو گئیں تھیں ان کو اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا کہ یہ اسلام سے خارج ہیں۔ سر سید نے جبرئیل اور فرشتے کے وجود، شق صدر اور معراج کا واقعہ، پیغمبروں کا پیدا ہونا جیسے اہم موضوعات پر اظہار کر کے مسلمانوں کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا تھا اس بڑھی ہوئی عقلیت پسندی کی وجہ سے اس دور میں ان کو کافر بھی کہا گیا تھا۔

سر سید کا ذہنی رشتہ مغربی تجربیت کے ابتدائی دور سے وابستہ ہے جب تجربیت اپنی کمزوریوں سے آگاہ نہیں ہوئی تھی اور سائنس غرور پرستی کا شکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی حقائق (مثلاً خدا، روح وغیرہ) کو اکثر تجرباتی اور عقلی استدلال کے ذریعے سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے مذاقِ سلیم کی روشنی میں عقلیت اور تجربیت کے نازشِ بے جا کے استیلا سے نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مثلاً خدا کی حقیقت، اس کی صفات کی ماہیت، روح کی حقیقت بل کہ ہر چیز کی حقیقت کے علم کو وہ عقل کی رسائی سے باہر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور فطرت، جن کو انھوں نے رہنما بنایا ہے۔ ان کی حدود اور رسائی کے بارے میں انھوں نے پوری فلسفیانہ ذمہ داریوں کے ساتھ نہیں سوچا ہے اور علم کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں کوئی مدلل اور مفصل نظریہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ ہیوم اور کانٹ کی طرح انھوں

نے ان راہوں کی خاک نہیں چھانی ہے بل کہ ذوقی اور وجدانی طور پر وہ اس راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ علم الکلام پر سرسید کی دل چسپی کا موضوع تھا جس پر انھوں نے کئی کتب تحریر کیں ان کتب کے مباحث کا جائزہ سرسید کے حوالے سے لکھی جانے والی کم و بیش ہر کتاب میں ہے۔ ذیل میں ہم ان اہم کتب کو زیر بحث لا رہے ہیں جو براہ راست سرسید کے علم ارکلام کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔

سرسید احمد خاں کے دینی افکار پر مطبوعہ کتب

س سلسلے میں سب سے پہلے سرسید احمد خان کے اپنے افکار سے شناسائی ضروری ہے اس کے بعد سرسید شناسوں کی رائے ان کی کتب میں دیکھ کر موازنہ کریں گے کہ کس قدر سرسید کے ذاتی افکار سے مطابقت قائم کی گئی ہے اور کس قدر انحراف کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کے دینی افکار کو شیخ اسماعیل پانی پتی نے مقالاتِ سرسید کے نام سے جلد دوم اور جلد دہم میں جمع کر دیا ہے۔ ہم سب سے پہلے اس کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(ا) مرتبہ و مدونہ کتب و رسائل

مقالاتِ سرسیّد، جلد دوم (۱۹۸۴ء) مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

س موضوع کی پہلی کتاب مقالاتِ سرسیّد از سرسید احمد خاں، کے مرتب مولانا محمد اسماعیل پانی پتی ہیں۔ اسے مجلس ترقی ادب، لاہور نے دسمبر ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ یہ ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تصنیف چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''تفسیر السموٰت'' میں سرسید کے اپنے افکار کا جائزہ لیا جائے تو وہ آسمانوں کی تعداد اور ان کی ہیئت کو یونانی علمِ ہیئت کے تابع مانتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ علمائے اسلام نے ایسا کوئی علمِ ہیئت مقرر نہیں کیا جس کی بنیاد قرآن یا سنتِ نبویؐ پر رکھی گئی ہو:

''ہم کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ علمائے اسلام نے کوئی خاص علمِ ہیئت

ایسا مقرر کیا ہے جس کی بنا قرآن مجید یا حدیث پر ہو۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ یہی ہے کہ جو علمِ ہیئت یونانی حکما نے اختیار کیا تھا وہی بعینہٖ بذریعہ تراجم کے، جو یونانی زبان سے عربی زبان میں ہوئے ہم مسلمانوں میں بھی پھیل گیا۔ جب قرآن مجید کی تفسیریں لکھی گئیں قرآن مجید کی کسی آیت میں کوئی ایسا مضمون آیا جو علم ہیئت سے علاقہ رکھتا تھا تو انھوں نے اس کی تفسیر بھی یونانی علم ہیئت کے اصول پر کی، یہاں تک کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں کا ذکر تھا اور یونانی نو آسمان مانتے تھے تو علمائے اسلام نے ان سات آسمانوں میں عرش اور کرسی کو ملا کر پورے نو کر دیے۔ پس ہم سمجھتے ہیں کہ علمائے اسلام نے یونانی علم ہیئت کو تسلیم کیا اور اسی کے اصول کو مذہبی کتابوں اور قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ مذہب کے ساتھ اور مسائل مذہبی میں ایسا مل جل گیا کہ یونانی علم ہیئت سے انکار کرنا گویا مسائل ضروریاتِ مذہب سے انکار کرنا خیال میں سما گیا۔ پس جس قدر کہ ہم کو انکار ہے انھی مسائل علم ہیئت یونانیہ سے ہے جن کو علمائے اسلام نے مسائل مذہبی و تفسیر قرآن مجید میں شامل کیا ہے۔"[1]

اس موضوع کے تحت پانچ قسم کی آیات کے مختلف حوالے دے کر سر سید نے آسمانوں سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں جو علم ہیئت یونانیہ پر محیط ہیں۔ سر سید نے موضوع بحث کو سمیٹتے ہوئے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر میں ایک آیت کی نسبت تیسرا قول نقل کیا ہے جو ابن عباس اور بہت سے دیگر مفسرین سے منسوب ہے، لکھتے ہیں:

"یعنی امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت کی نسبت تیسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ ابن عباس کا اور بہت سے دوسرے مفسروں کا یہ قول ہے کہ آسمان و زمین بہ سبب سختی اور پٹ پڑ ہونے کے منہ بند تھے، پھر منہ کھولا اللہ تعالیٰ نے آسمان کا مینہ سے اور زمین کا نباتات اور درخت اگانے سے

اور اسی کی مانند خدا کا یہ قول ہے قسم ہے پھرنے والے یا برسنے والے بادل
کی اور اگانے والی پھٹا دو والی زمین کی اور اس وجہ کو تمام وجہوں پر ترجیح دی
ہے خدا تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے جو اسی کے بعد ہے کہ ہم نے
ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا اور اس آیت کا پہلی آیت سے جب ہی جوڑ ملتا ہے
جب کہ پہلی آیت کو پانی سے کچھ تعلق ہو۔ اگر کوئی اعتراض ہے کہ یہ وجہ
ضعیف ہے۔ اس لیے مینہ آسمانوں سے نہیں آتا، بل کہ ایک آسمان سے
جو دنیا کا آسمان ہے اترتا ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ دنیا کے آسمان
پر جمع کا صیغہ اس لیے بولا گیا ہے کہ اس کا ہر ایک ٹکڑا آسمان ہے، جس طرح
کہ عرب بولتے ہیں ثوب اخلاق اور برمۃ اعشار۔ اب یہ بات بھی جاننی
چاہیے کہ اس تاویل پر جائز ہے کہ روایت کے لفظ کے معنی آنکھوں سے
دیکھنے کے لیے جاویں۔"[۲]

دوسرے باب "اصحاب الفیل کا واقعہ۔ سورۂ فیل کی تشریح" کے عنوان کے تحت سرسید نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح مفسرین نے اصحاب الفیل کا واقعہ بیان کیا ہے یا جس طرح اس واقعہ کی توضیح یا تفسیر کی ہے وہ حقائق پر مبنی نہیں بل کہ خود ساختہ ہے۔ سرسید اس سلسلے میں قرآن مجید میں مذکور ابابیل پرندوں کا بھی انکار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی بجائے اصحاب فیل کی بربادی کا باعث چیچک کی وبا کو قرار دیتے ہیں:

"مفسرین کی عادت ہے کہ اصل بات کو بڑھا چڑھا کر کچھ کا کچھ کر دیتے
ہیں اسی طرح اس اصلی واقعہ کو بھی کہانی کی صورت پر بنایا ہے اور اپنی
تفسیروں میں اس طرح لکھا ہے کہ جب ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں سمیت کعبہ
کے پاس آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کے پرند جانوروں کو حکم دیا کہ مسور یا
چنے کے دانہ کے برابر ایک کنکری چونچ میں اور ایک ایک دونوں پنجوں میں
لے کر جاؤ اور ابرہہ کے لشکر پر چھوڑ دو ان پرندوں نے ایسا ہی کیا اور کنکری

جس کے سر پر پڑی پار نکل گئی۔ سارا لشکر برباد ہو گیا اور اس قصہ کے لیے کچھ بے اصل روائتیں بھی گھڑی ہیں اور لفظی مناسبت سے تمام اس کے لوازمات از خود خیال کر لیے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح یہ قصہ نہیں ہے، بل کہ قرآن مجید سے صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر پر ایک آفت پڑی اور وہ برباد ہو گیا۔ اس آفت کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے مگر قرآن مجید کی سیاق عبارت سے اور تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آفت وبائی چیچک کی بیماری تھی جو ابرہہ کے لشکر میں دفعتاً زمانہ محاصرہ مکہ میں پھیلی اور بہت سے آدمی اور جانور چیچک سے مر گئے اور سارا لشکر تباہ ہو گیا۔'' ۳۲

سر سید نے اس واقعہ کو مدلل انداز میں ثابت کرنے کے لیے دس تاریخی واقعات اور قران مجید کے حوالوں کا سہارا لیا ہے۔ سر سید اس واقعہ کو کعبہ کی کرامت نہیں بل کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا بین ثبوت کہتے ہیں۔

تیسرے باب ''کافر۔ اگلے زمانہ میں بھی گزرے ہیں'' کے عنوان کی ذیل میں سر سید نے اپنی ذات پر لگنے والے کفر کے فتوے کو گویا قبول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھیں ایک تفسیر کشف الاسرار ملی ہے جس میں سے بعض آیات کی تفسیر پر ان پر کفر کے فتوے لگے ہیں۔ ایسے فتووں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگلے زمانے کے مفسر بھی کافر تھے۔ اس مفسر نے حضرت عیسیٰ کی نسبت تین باتیں ایسی کی ہیں جو ہم کہتے ہیں۔ اول یہ کہ خدا نے کسی دوسرے شخص کی صورت حضرت عیسیٰؑ کی صورت کے مشابہ نہیں بدل دی تھی، بل کہ رؤسائے یہود نے کسی اور شخص کو مصلوب کر دیا اور عوام سے کہہ دیا کہ ہم نے عیسیٰ کو مار ڈالا ہے۔ دوم یہ کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر نہیں چلے گئے بل کہ وہ دیگر انبیا کی مانند اس دنیا میں اپنی طبعی موت مرے تھے۔ تیسرے یہ کہ معراج بجسد نہیں، بل کہ معراج بالروح خواب میں ہوئی تھی۔ اس حوالے سے سر سید کا نقطہ نظر یہ ہے:

''ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے جو چاہے کہ ایک پہاڑ کو ہوا میں اڑا دے اور ابر میں ایک دریا بہا دے اور اس کے سوا اور جو کچھ

چاہے۔ پس کس طرح نہیں اٹھا سکتا اپنے ایک نبی کا بدن، لیکن نبی کی بزرگی
یسی، نئی چاہیے جس کا دشمن انکار نہ کر سکے اور ایسے ہی خدا کی قدرت کا
قرار۔ پس جھگڑا نہ چاہیے جب مطلب حاصل ہو جاوے اور ایسے ہی کلام
ہے عیسیٰ کے اٹھا لینے میں اور خدا اپنے نبیوں کے حال کو خوب جانتا ہے اور
ضرور تجھ کو یہ، ننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جو یہودیوں کے سرداروں کو یہ کرنے دیا
اوران کو اس پر قدرت دی جو انھوں نے کیا کہ ایک آدمی کو مارا اور اس کو اور
سب بنی اسرائیل پر مشتبہ کیا اور دعویٰ کیا یہ عیسیٰ ہی ہے۔ یہ سب کام حکمت
لہی سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب کام عیسیٰ کے پیروؤں کے لیے
باعث رحمت کا ہوا اور اسی سے ان یہودیوں میں جنھوں نے عیسیٰ کو نہ
مانا تھا فتنہ پھیلا۔"[۴۴]

چوتھے باب "سورۂ جن کی تفسیر" میں سرسید نے لفظ "جن" کی تفسیر اور وضاحت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ "سورۂ جن" میں لفظ "جن" ایسی مخلوق کے لیے استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ معمولی عالم اور مفسرین مراد لیتے اور سمجھتے ہیں، بل کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو پوشیدہ ہو، یہاں تک کہ ماں کے پیٹ میں بچہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے:

"..... ہمارے قدیم عالموں اور مفسروں نے اپنی معمولی عادت کے مطابق
س سورۃ میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کو بھی ایک عجیب و غریب قصہ بنا لیا
ہے۔ ان کے خیال میں آیا کہ اس مقام پر لفظ جن سے وہ مخلوق مراد ہے جس
کو عوام الناس جن خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ہوائی آگ کے
شعلوں سے بنی ہوئی مخلوق ہے جو دکھلائی نہیں دیتی۔ مگر طرح بطرح شکلوں
میں بن جانے اور انسانوں کے سروں پر آنے اور ان کو تکلیف دینے یا ان
کا کام خدمت کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ یہ خیال صحیح ہو یا غلط مگر اس
صورت میں لفظ جن سے وہ جن جو لوگوں کے خیال میں ہے ہرگز مراد نہیں
ہے۔ لفظ جن اجنان سے مشتق ہے جس کے معنی چھپے ہوئے کے ہیں اور

عربی زبان کے محاورہ میں جو چیز پوشیدہ ہو اس پر جن کا اطلاق کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ پیٹ کے بچے کو جنیں اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پیٹ کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔''۵

بعدازاں سرسید نے عالموں کی اس بات کو بھی جھٹلایا ہے کہ جنوں کو آسمان سے دور رکھنے کے لیے شہاب ثاقب مارے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ نجومی بھی اس سے عاجز آ گئے ہیں کہ وہ آسمان سے کسی بھی قسم کا راز چرا سکیں۔ علم نجوم کے ذریعے غیب کی بات دریافت کرنے کا دراصل راستہ بند ہو چکا ہے۔ کسی طرح خدا کی بات کو دریافت کرنا ممکن نہیں رہا۔

چوتھے باب ''جنوں کی حقیقت'' (الجن والجن علی مافی القرآن) میں بھی سرسید نے آیاتِ قرآنی کا حوالہ دے کر جنوں کی حقیقت منکشف کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید اس سے اختلاف کرتے ہیں جو جنوں سے متعلق علما کا عام خیال ہے۔ وہ تو احادیث کے حوالے سے بھی جنوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے نظریات کو تقویت دینے کی پوری پوری کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

> ''علما اسلام جن کی تعریف میں بیان کرتے ہیں کہ جسم ناری، حساس متحرک بالارادہ متشکل بالاشکال مختلف۔ اسی بنا پر عام مسلمان خیال کرتے ہیں کہ وہ یک ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں مرد اور عورت دونوں ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں جنتے جنتے ہیں۔ طرح طرح کی شکلوں میں بن جاتے ہیں۔ انسانوں کے سروں پر آتے ہیں۔ ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ ان کو مار ڈالتے ہیں۔ انسانوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ان کو تازہ بتازہ میوے لا کر دیتے ہیں اور دکھائی نہیں دیتے مگر جب چاہیں اور جیسی شکل میں چاہیں اپنے تئیں دکھلا دیتے ہیں، یعنی اپنے جسم میں دفعتاً ایسا مادہ پیدا کر لیتے ہیں کہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ آدمی کی صورت بن کر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ عامل ان کو آدمی بنا

کر اپنے گھوڑے کا سائیس کر لیتے ہیں مگر اس میں سے ایک بات بھی قرآن سے ثابت نہیں۔''[۱]

اسی طرح کئی ایک احادیث کو اپنے انداز میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ایک حدیث (جس میں جنوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا ثابت ہے) کو بھی سرسید نے غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ امکان ہے کہ کسی جزیرے کے کچھ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے ہوں۔

پانچویں باب ''قرآن مجید کے تفسیری اصول۔ سرسید کا ایک نایاب مضمون'' میں سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر کے کچھ راہ نما اصول مرتب کیے ہیں اور سید مہدی علی خاں کے خطوط کے جواب میں بتایا ہے کہ تفسیر کے چار اصول ہیں:

پہلا اصول: یہ ہے کہ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام اور بالکل سچ اور صحیح ہے۔ کوئی علم یعنی سچ اس کو جھٹلا نہیں سکتا، بل کہ اس کی سچائی پر زمانہ روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرا اصول: یہ ہے کہ اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں

(۱) ورک آف گاڈ یعنی خدا کا کام

(۲) ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قران مجید، اور یہ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ اگر مختلف ہو تو ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا اور اس لیے ورڈ آف گاڈ جس کو بھی کہا جاتا ہے اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے نعوذ باللہ منھا اس لیے ضرور ہے کہ دونوں متحد ہوں۔

تیسرا اصول: ورک آف گاڈ یعنی قانونِ قدرت ایک عملی عہد خدا کا ہے اور وعدہ اور وعید یہ قولی معاہدہ ہے اور ان دونوں میں کوئی بھی خلاف نہیں ہو سکتا، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اس کی تسلیم سے خدا کی قدرت مطلق میں نقصان آتا ہے جیسے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا خیال ہے، محض غلط اور وہم اور ناسمجھی ہے۔ اس راز کے سمجھانے کو چند سطریں کافی نہیں۔

چوتھا اصول: خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان مذہب، یعنی خدا کی عبادت کے لیے پیدا ہوا

ہے، خواہ یہ کہو کہ مذہب انسان کے لیے بنایا گیا ہے، دونوں حالتوں میں ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اس بار کے اٹھانے کا مکلّف ہو اور انسان میں وہ شے کیا ہے؟ عقل ہے، اس لیے ضرور ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جاوے وہ عقلِ انسانی سے مافوق نہ ہو (مجھ کو افسوس ہے کہ تم ہرگز نہیں سمجھتے کہ عقلِ انسانی اور عقلِ شخصی میں کیا فرق ہے) اگر وہ عقلِ انسانی کے مافوق ہے تو انسان اس کا مکلّف نہیں ہوسکتا، بل کہ اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کہ بیل یا گدھے کو امر و نہی کا مکلّف قرار دیا جاوے یا جونپور کا قاضی بنا دیا جاوے۔[۷]

چھٹے حصے میں محسن الملک کے نام ایک اور خط میں سرسید نے تفسیر کے پندرہ اصول بیان کیے ہیں اور ان کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو تفسیر قرآن مجید کی کی ہے وہ عقلِ انسانی کے معیارات کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ انھیں طعنہ دیا جاتا ہے کہ جب حکمت و ہیئت و فلسفہ یونانی مسلمانوں میں پھیلا اور جو اس زمانہ میں بالکل سچ و صحیح اور مطابق حقیقت واقع سمجھا جاتا ہے، علماے اسلام نے قرآن مجید کے ان مقامات کی جو ان کے مطابق معلوم ہوتے تھے تائید کی اور ان مقامات کو جو بہ ظاہر ان علوم کے مخالف معلوم ہوتے تھے ان کے مطابق کرنے کی کوشش کی، اب معلوم ہوا کہ وہ علوم غلط اصول پر مبنی تھے اور ان کا علم ہیئت بالکل حقیقت کے برعکس تھا۔ علم طبیعات در نیچرل سائنس نے ترقی کی تو اب ان معنوں سے اختلاف ہو چکا ہے جو اگلے علما نے یونانی علوم کے مطابق قرار دیے تھے اور آئندہ بھی ان میں رد و بدل کا امکان موجود ہے اس لیے سرسید کا خیال ہے:

''ہم اس طعنہ کو بطور ایک بشارت کے نہایت خاموشی سے تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ وہ ورڈ آف گاڈ ہے اور ورک آف گاڈ اس کے مطابق ہے مگر اس میں بہت بڑا معجزہ یہ ہے کہ ہمارے ہر درجہ علم اور امور میں جن کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہوا ہے یکساں ہدایت کرتا ہے۔ اس کے الفاظ ایسے عجاز سے نازل ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہمارے علوم کو ترقی ہوتی جاوے گی

اور اس ترقی یافتہ علوم کے لحاظ سے ہم اس پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کے الفاظ اس لحاظ سے بھی مطابق حقیقت ہیں اور ہم کو ثابت ہو جاوے گا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے اور اب غلط ثابت ہوئے وہ ہمارے علوم کا قصور تھا نہ الفاظ قرآن مجید کا۔ پس اگر ہمارے علوم کو آئندہ زمانے میں ایسی ترقی ہو جاوے کہ اس وقت کے مور محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کریں گے اور اس کو ضرور مطابق حقیقت پاویں گے ور ہم کو معلوم ہوگا کہ جو معنی ہم نے قرار دیے تھے وہ ہمارے علم کا نقصان تھا، قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔'' ۵۸

مصنف نے بڑا غیر جانبدارانہ سلوب اختیار کیا ہے اور سرسید کی فکر کو ہو بہو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اسلوب بہت سادہ مگر حقائق کے قریب ہے۔ یہ کتاب سرسید شناسی کی روایت میں ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

مقالاتِ سرسیّد، جلد دہم (۱۹۸۴ء) مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

مقالاتِ سرسید (حصہ اول) کے خالق سرسید احمد خاں ہیں جس کے مرتب مولانا محمد اسماعیل پانی پتی ہیں۔ اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے دسمبر ۱۹۸۴ء کو شائع کیا۔ یہ تخلیق ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کی فہرست مرتب نہیں کی گئی، اس لیے تفصیلات میں جا کر موضوعات کا پتا لگانا پڑتا ہے۔

یہ تصنیف موضوعات کے اعتبار سے چونتیس حصوں پر مشتمل ہے جن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جا رہی ہے:۔

آغاز میں ''مقدمہ (نوشتہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)'' کے زیر عنوان، سرسید کی تصانیف اور مقالات، ان کے مقالات پر تبصرہ، سرسید کا اپنا بیان، ان کے مضامین کی صف بندی، مضامین کی خصوصیات، سرسید کا مقام، جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''مناجاتِ سرسید بہ درگاہِ رب العزت'' میں اللہ رب العزت کی تسبیح کے بعد اس

کے حضور گڑگڑا کر دعا کی گئی ہے جس میں گناہوں کی معافی، توبہ کی قبولیت، اپنے عاجز بندوں پر رحم اور شکرانے کی قبولیت کی استدعا شامل ہے۔

''پُر درد اور عاجزانہ دعا'' میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد انسان کے قوی کو اس کے تابع رکھنے، گناہوں کو دھونے اور معاف کرنے، دست گیری کرنے، رسول اللہ ﷺ کی راہ پر رکھنے اور آپؐ اور آل اصحاب پر رحمت نازل کرنے کی دعا کی گئی ہے۔

''عقائدِ مذہب اسلام'' کے تحت اسلامی عقائد کا احاطہ کیا گیا ہے:

عقیدۂ اول تمام کائنات کا خالق رب العلمین ہے۔

عقیدۂ دوم: اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں وحدہ لاشریک ہے۔

عقیدۂ سوم: اللہ کی ہستی ایسی ہے جسے دیکھا جاسکتا ہے، چھوا جاسکتا ہے اور نہ تصور میں لایا جاسکتا ہے۔

سرسید س موضوع پر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''غرض کہ ہم تمام صفات کو یا بطور ایجاب یا بطور سلب ذات باری کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس میں ان صفات کے ہونے اور نہ ہونے کا بھی یقین کرتے ہیں، مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ ان کا محل ہے، بل کہ اس وجہ سے کہ ہم کو ان مفہومات کے من حیث الاطلاق لوازم ذاتی علت العلل کے ہونے پر یقین کلی ہے۔ جس طرح ہم اس کی ذات کی حقیقت کو نہیں جانتے اسی طرح س کی صفات کی حقیقت کو بھی نہیں جانتے۔''[9]

''ملتجی الکلام فی بیانِ مسائل الاسلام'' کے تحت بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے مخالف اور نکتہ چیں زیادہ تر ان کتب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو کتب احادیث و تفاسیر و کتبِ سیر کے نام سے مدون ہیں، جنھیں اہلِ اسلام نے لکھا ہے اور جب کوئی مسلمان ان احادیث کی تنقیح کرتا ہے اور کسی کو مقبول یا مردود قرار دیتا ہے یا تفاسیر اور سیر کی کتابوں کے مضامین کو غلط ٹھہراتا ہے تو وہ مذہب اسلام کی طرف داری کے الزام کی زد میں آجاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا کتب میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو:

۱۔ خود قرآن مجید کے بھی برخلاف ہیں۔

۲۔ ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو تاریخ محققہ اور مشہورہ کے متناقض ہیں۔

۳۔ ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو حس اور مشاہدہ جھٹلاتا ہے۔

۴۔ ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن کو عقل انسانی کسی صورت قبول نہیں کرتی۔ اس قسم کی روایتوں سے جو مسلمان انکار کرتے ہیں اور ان کو غلط ٹھہراتے ہیں اس سے ان کا صاف مطلب یہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی صداقت ظاہر کرنے کو اس کے مخالف جو حدیثیں اور روایتیں ہیں ان سے انکار کریں اور تاریخِ محققہ اور مشہورہ اور حس اور مشاہدہ اور عقلِ انسانی کے برخلاف جو حدیثیں اور روایتیں ہیں ان کا اس لیے انکار کرتے ہیں کہ مذہبِ اسلام پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور تعجب یہ ہوتا ہے۔

۵۔ ایسی حدیثوں اور روایتوں کے جن سے بانیٔ اسلام کے مناقب پائے جائیں، تسلیم کرتے ہیں اور جن سے بانی اسلام پر کسی قسم کی منقصت لازم آتی ہے اس کو نہیں مانتے۔

۶۔ جو حدیثیں اور روایتیں وقارِ نبوت کے برخلاف ہیں ان کو بھی نہیں مانتے اور کوئی عقلی دلیل اس بات کی نہیں بیان کرسکتے کہ کیوں ان حدیثوں اور روایتوں کو مانا اور ان حدیثوں اور روایتوں کو نہیں مانا، مگر اس ماننے اور نہ ماننے کی بنا مذہبی عقائد پر ہے تو وہ شخص جو مذہبِ اسلام نہیں مانتا قبول نہیں کرسکتا، بل کہ ان کے ماننے اور نہ ماننے کے لیے ایسی عقل اور روشن دلیل چاہیے جس کو غیر مذہب والا بھی مان سکے۔"[۱]

سی کے ساتھ ساتھ سرسید نے حدیثوں اور روایتوں میں بے اصل باتوں کے شامل ہونے کی بارہ وجوہات بیان کی ہیں۔ نتیجہ یہ نکالا ہے:

"تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں خواہ وہ تفسیر ابن جریر ہو یا تفسیر کبیر وغیرہ اور خواہ وہ سیرۃ ابن اسحٰق ہو، خواہ سیرت ابن ہشام اور خواہ وہ روضۃ الاحباب

ہو یا مدارج النبوۃ وغیرہ ان میں تو اکثر ایسی لغو اور نامعتبر روایتیں اور قصے مندرج ہیں جن کا نہ بیان کرنا ان کے بیان کرنے سے بہتر ہے۔"[۱۱]

"طبقاتِ علوم الدین" میں سرسید نے دینی علوم کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے:

طبقۂ اول: حدیثوں کے پہچاننے کا علم کہ کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف؟ اور کون سی معتبر ہے اور کون سی نامعتبر؟ اسے علماے محدثینؒ نے اختیار کیا اور کتب احادیث مرتب کیں۔

طبقۂ دوم: کلام الٰہی اور ان حدیثوں کے بیان کرنے کا علم کہ مطابق محاورہ استعمال زبان عرب کے اس کے کیا معنی ہیں؟۔ اس کام کو علماے علم ادب نے اختیار کیا۔

طبقۂ سوم: کلام الٰہی اور حدیثوں کے معنی کو بہ طور اصطلاحات شرعیہ قرار دینے اور ان سے احکام شرعیہ کے نکالنے اور ایک حکم سے دوسرے پر قیاس کرنے اور اشارت وکنایات عبارت سے حکم نکالنے اور ناسخ منسوخ قرار دینے اور راجح مرجوح ٹھہرانے کا علم۔ اسے فقہا نے اختیار کیا۔

طبقۂ چہارم: مذہب اسلام کے اسرار جاننے کا علم۔ یہ وہ علم ہے جس میں مذہب اسلام میں جو کچھ ہے اس کی حقیقت اور اصلیت اور جو حکمت کہ شارع نے اس میں رکھی ہے وہ بیان کی جاتی ہے۔[۱۲]

علم دین کو سمجھنے کے لیے سرسید نے احیاء العلوم از امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اور حجۃ اللہ البالغۃ از شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتب سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جدید فکر کو اپنانے کی اصلاح بھی دے دی ہے:

"اس علم، یعنی علم اسرار دین میں احیاء العلوم امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کی اور حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نہایت عمدہ کتابیں ہیں، مگر زمانہ حال کے مطابق ان کو بھی کامل نہ سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس زمانہ میں بہت سی

چیزیں اب معلوم یا مروج ہوئی ہیں جو اس زمانہ میں نہ تھیں اور یہ کہ طرزِ تحریر
وطریق تقریر اور مناط استدلال اور طریقہ ابراد اس زمانہ میں نئے
طور پر شروع ہوا ہے جو ان زمانوں میں نہ تھا اور یہ کہ حال کے زمانہ کے
لوگوں کے خیالات کو بہ نسبت اس زمانہ کے بہت زیادہ وسعت ہوگئی ہے
اور یہ کہ ان کتابوں میں بہت باتیں بر بنیاد امورات مسلمہ مذہبی بیان کی
گئیں ہیں جو صرف معتقدین اسلام کے لیے بلاشبہ مفید ہیں، مگر بلحاظ شان
وقدر ومنزلت اس علم کے اس کے بیان کا ایسا عام ہونا چاہیے جو معتقدین
سب کے لیے مفید اور برابر مؤثر ہوں۔''[۱۳]

''احادیث'' کے عنوان کی ذیل میں بتایا گیا ہے کہ احادیث کی جمع وتدوین اور ان کی صحت کے بارے میں جس احتیاط سے کام لیا گیا وہ لائق تحسین ہے۔ وضع حدیث اور کذب راوی کے حوالے سے سرسید نے شاہ عبدالعزیز کی عجالہ نافعہ میں سے گیارہ علامات کا ذکر کیا ہے جب کہ امام بخاری کی فتح المغیث میں ابن جوزی سے حدیث کے موضوع ہونے کی دس نشانیاں بیان کی ہیں:

اول: جو حدیث کہ عقل اس کے مخالف ہو اور اصول کے متناقض ہو۔

دوم: ایسی حدیث جو حس اور مشاہدہ اس کو غلط قرار دیتا ہو۔

سوم: وہ حدیث جو کہ مخالف ہو قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے۔

چہارم: جس میں تھوڑے کام پر وعید شدید یا اجر عظیم کا وعدہ ہو۔

پنجم: رکت معنی اس روایت کی جو بیان کی گئی۔

ششم: رکت یعنی سخافت راوی کی۔

ہفتم: منفرد ہونا راوی کا۔

ہشتم: منفرد ہونا ایسی روایت میں جو تمام مکلفین سے متعلق ہو۔

نہم: یا ایسی بڑی بات ہو جس کے نقل کرنے کی بہت سی ضرورتیں ہوں۔

دہم: جس کے جھوٹ ہونے پر ایک گروہ کثیر متفق ہو۔[۱۴]

مذکورہ بالا دس علامت کی روشنی میں ''احادیث'' پر بحث کرتے ہوئے سرسید اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> ''نسبت صحت اور عدم صحت حدیث کے اس بات کی بحث کہ اس کے راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں یا نہیں ایک جدا بحث ہے... بل کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جن راویوں کو معتبر مان کر ان کی حدیث نقل کی گئی ہے ان حدیثوں کے مضمون پر دو لیئے غور کرنا ضرور ہے کہ ان میں بھی کوئی نقص، نقص ہائے مذکورہ بالا میں سے ہے یا نہیں، تا کہ ان کے مضمون کی صحت پر بھی طمانیت کی جاسکے ور اگر کسی حدیث کے مضمون میں کچھ نقص ظاہر ہو تو وہ حدیث نہیں مانی جاوے گی اور نہ وہ جناب رسول خدا ﷺ کی نسبت منسوب ہوگی، بل کہ یہ خیال کیا جاوے گا کہ راوی سے الفاظ کے یا مضمون کے بیان کرنے میں کچھ تبدیلی یا غلطی ہوئی ہے۔ غرضیکہ ہمارے نزدیک حدیثوں کی صحت کا مدار بہ نسبت راویوں کے زیادہ تر سرایت پر منحصر ہے، فقط۔''[۱۵]

''کتب احادیث'' میں سرسید نے احادیث کے مختلف مدارج متعین کیے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ کتب احادیث باعتبار صحت و شہرت اور قبول کے کئی درجہ پر ہیں۔ صحت سے مراد مصنف نے احادیث صحیحہ اس میں لکھی ہوں اور اس کے سوا جو حدیث لکھی اس کا نقص بھی اس کے ساتھ لکھ دیا ہو۔ شہرت سے مراد ہر زمانہ میں اہل حدیث اس کو پڑھاتے رہے ہوں اور اس کی ہر چیز بیان میں آ گئی ہو اور قبول کا مطلب ہے کہ علمائے حدیث نے اس کتاب کو معتبر و مستند سمجھا ہو اور کسی نے اس سے انکار نہ کیا ہو۔ شاہ ولی اللہ نے احادیث کے درجے متعین کیے ہیں۔ پہلے درجے پر مؤطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، دوسرے درجے میں جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، تیسرے درجے میں مسند شافعی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی، مسند ابویعلیٰ موصلی، مصنف ابن عبدالرزاق، مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند ابوداؤد طیالسی، سنن دارقطنی، صحیح ابن حبان، مستدرک

حاکم، کتب بیہقی، کتب طحاوی، تصانیف طبرانی اور چوتھے درجے میں کتاب الضعفا لابن حبان، تصانیف الحاکم، کتاب الضعفا للعقیلی، کتاب الکامل لابن عدی، تصانیف ابن مردویہ، تصانیف خطیب، تصانیف ابن شاہین، تفسیر ابن جریر، فردوس دیلمی، سایر تصانیف فردوس دیلمی، تصانیف ابن نعیم، تصانیف ابن عساکر، تصانیف ابوالشیخ اور تصانیف ابن نجار شامل ہیں۔ سرسید ایسی احادیث کو اہمیت دیتے ہیں جو ایک طرف تو بہ اعتبار صحت وشہرت وقبولیت کے درجے پر ہوں اور دوسرے عقل کے معیار پر پورا اترتی ہوں اور ایسی احادیث کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے جو لغو اور بے سند ہوں:

''اگر ہم لغو اور بے سند باتوں کو اپنے مذہب میں شامل کریں اور پوچ ورواہیات قصوں کو جن کی کچھ اصل نہیں ہے مذہبی قصہ اور الہامی واقعات سمجھنے لگیں تو ہمارا مذہب ہنسی ٹھٹھا ہو جاوے گا اور لون کے گھر سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بودا بن جاوے گا۔ علما متقدمین نے نہایت سختی سے بطور ایک دشمن کے حدیثوں کا امتحان کرنے میں کوشش کی ہے۔ پس یہ بات کہ حدیث بے سند یا ضعیف یا مشتبہ کو حدیث نہ سمجھا جاوے اور مذہبی باتوں میں اسے داخل نہ کیا جاوے بے دینی کی بات نہیں ہے، بل کہ نہایت ایمانداری اور اسلام کی بڑی دوستی کا کام ہے۔''[۱۶]

''اقسام حدیث'' کے زیر عنوان سرسید نے احادیث مبارکہ کی بارہ اقسام بیان کی ہیں ان میں، حدیث بالمعنی، درحکم مرفوع، موقوف، مقطوع، معلق، مرسل یا منقطع، معضل، مدلس، مضطر، مدرج، معن، مؤنن شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے احادیث کو حدیث نبوی ٹھہرانے کے لیے سات راہ نما اصول بھی بیان کر دیے ہیں۔

''احادیث غیر معتمد'' میں سرسید نے لکھا ہے کہ حضرت علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے، جو اکابر علماے حدیث سے ہیں، ''سفر السعادۃ'' کے خاتمے میں بہت سی باتیں لکھی ہیں اور بیان کیا ہے کہ ان باتوں کی نسبت بہت سی حدیثیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے کچھ بھی صحیح اور علماے حدیث کے نزدیک ثابت نہیں ہیں۔ اس ضمن میں

سرسید نے چھیالیس ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جو عموماً نہایت مستند خیال کی جاتی ہیں۔

''قصص واحادیث وتفاسیر میں سرسید نے بتایا ہے کہ تفاسیر میں بیان کیے گئے قصے اور تفاسیر میں شامل احادیث لائق اعتماد نہیں، لغو اور مہمل ہیں۔ جب تک ان کی صحت درایۃً معلوم نہ ہو ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے:

''ہم کثر اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں کہ تفاسیر کے قصے اور تفسیروں کی حدیثیں لائق اعتماد کے نہیں ہیں اور اسی سبب سے ہم ان کو لغو اور مہمل سمجھتے ہیں اور ان پر جب تک کہ درایۃً ان کی صحت نہ معلوم ہو اعتماد نہیں کرتے۔'' ۱۷؎

س مقالے میں سرسید نے اپنی بات کے ثبوت کے لیے دو مقدمے مع ترجمہ شامل کیے ہیں۔

''تشبہ: تحقیق معنی من تشبہ بقوم فھو منھم'' میں سرسید نے مشابہت غیر اقوام کے سلسلے میں امیر الامرا افتخار العلما سید خیر الدین احمد وزیر سلطنت تیونس کی کتاب قوام المسالک میں سے ایک حصہ نقل کیا ہے جس کے مطابق سرسید غافل لوگوں کو ہوشیار اور متنبہ کرنا چاہتے تھے کہ جو ایک اچھی بات کو صرف اس خیال سے اختیار نہیں کرتے کہ وہ ان کی شریعت کا حصہ نہیں ہے اور اس غلط خیال کا منشا یہ ہے کہ وہ دوسرے مذہب کے لوگوں کی تمام تر باتوں کو ترک کرنے کے لائق سمجھتے ہیں، خواہ وہ باتیں کسی قوم کی عادات میں سے ہوں خواہ تدابیر ملکیہ سے متعلق ہوں۔ یہاں تک کہ وہ غافل لوگ غیر مذہب والے کی تالیفات کو بھی پڑھنا برا سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص ان کے سامنے غیر مذہب کی تالیفات یا عمدہ باتوں کی تعریف کرے تو وہ اس شخص کو برا بھلا کہنے پر مستعد ہو جاتے ہیں حالاں کہ یہ سراسر حماقت ہے۔ جو کام فی نفسہ اچھا ہو، ہماری عقل تسلیم کرے اور خاص طور پر جس کام کو ہم لوگ کبھی کیا کرتے تھے اگر غیروں نے اس کو ہم سے اڑا لیا ہے تو ایسے کام سے انکار کرنے یا چھوڑ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

''تعلیم مذہبی'' میں ایک بہت بڑے المیے کی نشان دہی کی ہے جو مسلمانوں کو درپیش ہے اور وہ یہ کہ تمام مسلمان بالاتفاق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ کے سیکھنے سے مسلمان اپنے عقائد مذہبی میں سخت کاہل ہو جاتے ہیں، اس لیے ایسے علوم کو خوب سمجھنے لگتے ہیں اور لامذہب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنے لڑکوں کو انگریزی نہیں پڑھانا چاہتے۔ اس مسئلے کا حل سرسید یہ بتاتے ہیں:

> ''ہاں اگر مسلمان مرد میدان ہیں اور اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو بے دھڑک میدان میں آویں اور جو کچھ ان کے بزرگوں نے فلسفہ یونانیہ کے ساتھ کیا تھا، وہ فلسفہ مغربیہ اور علوم محققہ جدیدہ کے ساتھ کریں۔ تب البتہ ان کا پڑھنا پڑھانا مفید ہوگا، ورنہ اپنے منہ میاں مٹھو کہہ لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔''[۱۸]

''بحث ناسخ ومنسوخ'' میں سرسید بیان کرتے ہیں کہ ان کے ایک دوست نے انھیں یاد دہانی کرائی کہ ان کی تفسیر کی پہلی جلد میں ناسخ ومنسوخ کے حوالے سے سورہ رعد اور سورہ نحل میں جہاں ان آیتوں پر بحث کرنے کا موقع تھا، بحث نہیں کی گئی تو یہ مضمون اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھا گیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ان تمام آیتوں کو جن سے مفسرین ورفقہائے قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ ہونے کا دعویٰ پیش کیا ہے، مجموعی طور پر سامنے رکھ لیا جاوے اور ان پر غور وتعمق کی نظر ڈالی جاوے اور ان کے سیاق وسباق کو مدنظر رکھا جاوے تو ان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیتیں شرائع سابقہ انبیا کے بعض احکام کے تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں، نہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ ومنسوخ ہونے سے اور ہم امید کرتے ہیں کہ جن بزرگوں کے پاس ہماری تفسیر کی پہلی جلد موجود ہے وہ

س بیان کو اس صفحہ کے حاشیہ پر درج فرمالیں گے جہاں ہم نے ناسخ ومنسوخ پر بحث کی ہے۔"[۱۹]

"قرآن مجید کی قسمیں" میں سرسید نے جہاں قرآن مجید میں قسموں کی وضاحت کی ہے وہاں قرآن مجید میں موجود الفاظ کے عربی الاصل ہونے کا انکار بھی کیا ہے جیسے سرادق، ابریق، استبرق، کنز، فردوس۔ جو الفاظ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں ان الفاظ کو عربی زبان سے خارج کرنا یا سمجھنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ سرسید نے ان قسموں کے بارے میں بحث سمٹتے ہوئے بیان کیا ہے:

"پس یہ قسمیں اسی طرز کلام پر واقع ہوئی ہیں جو عرب کا طرز کلام تھا۔ ہاں اس طرح کی قسمیں کھانے پر اس بات کا شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہرگاہ خدا کے سوا اور کسی کی قسم کھانی منع کی گئی ہے تو خود خدا نے غیر خدا کی قسمیں کیوں کھائی ہیں، مگر غیر خدا کی قسمیں کھانے کا امتناع اس سبب سے ہے کہ غیر خدا کی قسمیں کھانے سے اس میں شان الوہیت کا شائبہ پایا جاتا ہے، مگر جب کہ یہ تسلیم کرلیا جاوے جیسا کہ قرآن مجید میں جابجا یہ بتایا گیا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اور خدا ان سب کا خالق ہے تو خدا اگر اپنی مخلوق کی قسم کھاوے تو کسی طرح شائبہ الوہیت اس مخلوق میں نہیں سمجھا جا سکتا اور اگر کچھ سمجھا جاتا ہے تو اس قدر سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیزیں اپنی خلقت میں یا انسان کے لیے مفید ہونے میں عظیم الشان اور عظیم القدر ہیں، لیکن اگر انسان ان میں سے کسی کی قسم کھاوے، خصوصاً ایسی چیزوں کی جن کو مشرکین پوجتے تھے تو ان میں شائبہ الوہیت کے ماننے کا شبہ ہو جاتا ہے اور اس لیے انسانوں کو غیر خدا کی قسم کھانا منع کیا گیا ہے۔"[۲۰]

"مکاشفہ" میں سرسید نے کشف ومکاشفہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر چہ ہم اس قابل نہ ہوں کہ ہمیں کشف ومکاشفہ ہو لیکن سمجھنا تو چاہیے کہ مکاشفہ کیا چیز ہے؟ ایک جاہل طب کے بارے میں نہیں جانتا مگر یہ جانتا ہے کہ طب سے

کیا ہوتا ہے اور کیوں کر ہوتا ہے؟ پس اگر ہم بھی مکاشفہ کے بارے میں علم نہیں رکھتے تو اس کے بارے میں جاننا ہمارے لیے ضروری ہے۔ صوفیاے کرام کی نظر میں روح اور جسم میں جو حجاب ہے اس کے اٹھ جانے کو مکاشفہ کہتے ہیں۔ حجاب کے لفظ نے سرسید کو پریشان کر کے رکھ دیا کہ آخر یہ حجاب اور پردہ کیسا ہے؟ بحث کے نتیجے میں سرسید یہ اخذ کرتے ہیں کہ صوفیاے کرام کا فرمان کہ مکاشفہ ذاتی ایسی چیز ہے جس کا بیان کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے خیالات میں جو کچھ پکا لیتا ہے اسی کو مکاشفہ کہتے ہیں۔ یہ حالتیں صوفیاے کرام نے بیان کی ہیں سوائے خیال کے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

''واقعات وادیۃ الورود'' میں سرسید بتاتے ہیں کہ یہ دنیا دو قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے جنھیں اکثر ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اہل اللہ اور ان کے معتقدین ایسے واقعات کو کرشمہ ربانی خیال کرتے ہیں اور اہل دنیا ایسے واقعات کو اتفاقی واقعات تصور کرتے ہیں۔ اس نظریے کی وضاحت سرسید نے شاہ ولی اللہ کی زندگی کے واقعات کی مثالیں دے کر کی ہے۔

''عجائبات کا ڈھول اور عجائبات کا قبول'' میں سرسید نے عجائباتِ جہاں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قدرتی عجائبات اس قدر کثیر ہیں کہ جنھیں انسان نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی شمار کر سکتا ہے۔ ان لاتعداد عجائبات میں انبیا، صلحا اور عام لوگوں سے منسوب بہت سے عجائبات ہیں جن کی حقیقت کے حوالے سے دونوں طبقات اپنی اپنی رائے پر مصر ہیں۔ سرسید کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معجزہ یا کرامت مذہب اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔ قرآن مجید میں بیان شدہ معجزات میں انسان کا پیدا کرنا، مینہ کا برسانا، اناج اور میوہ جات کا اگانا، سورج، چاند، ستاروں کا پیدا کرنا شامل ہیں۔ انھیں واقعی معجزات کہا جاتا ہے۔ پس جب تک مسلمانوں میں سے معجزے اور کرامات کا اعتقاد نہیں جاتا تب تک ان کا مہذب ہونا ناممکنات میں سے سمجھا جائے۔

''عالمِ غیب'' کے عنوان کے تحت سرسید نے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ غیب

کا اطلاق صرف ان حقائق پر کیا جا سکتا ہے جو پوشیدہ ہیں اور انسانی عقل ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہے یا جن کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے انسان ان کو جان نہیں سکتا۔ وہ حقائق خدا کی ذات اور اس کی صفت، عالم کے پیدا ہونے کی کیفیت، روح اور جان کی حقیقت، موجودات کی ماہیت، خدا کی عالم کو مدبر کرنے کی حقیقت، کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا ہو؟ انسان کی موت کی جگہ، وقت، موت کے بعد کیا ہوگا؟ قیامت کی حقیقت کیا ہے اور کب ہوگی؟ اس ساری بحث کو سرسید نے قرآن وحدیث اور مفکرین کی آرا سے منطقی انجام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

''عبادت'' میں سرسید اس بات پر افسوس کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ تمام نیکیاں اور عبادتیں جو قوانین قدرت کے خلاف ہیں انھیں مکمل طور پر نیکیاں اور عبادتیں شمار نہیں کیا جا سکتا، مگر لوگ اس کا خیال نہیں کرتے۔ اگر صرف اس کا خیال نہ رکھا جاتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دقت یہ ہے کہ قانون قدرت کے مطابق نیکیوں اور عبادتوں کو نیکیاں اور عبادتیں خیال نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں سرسید نے علم، زُہد و ریاضت، ترکِ دنیا، کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور کہا ہے:

> ''.... پس جو مسلمان کہ خلاف قانون قدرت ترک دنیا کا وعظ فرماتے ہیں وہ اس طرح سے اپنے مذہب کو مضحکہ بناتے ہیں اور غور کر کے دیکھو تو وہ خود جو کچھ کرتے ہیں دنیا ہی کمانے کو کرتے ہیں۔ پس یہ بات سمجھنا کہ مورات دنیا میں مصروف ہونا عبادت نہیں ہے، عین غلطی ہے۔ ہاں اس کو قانونِ قدرت کے برخلاف استعمال میں لانا شقاوت اور اس کے مطابق برتاؤ میں لانا عین عبادت ہے۔''[۲۱]

''خلافت'' میں سرسید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں نبوت، احکام الٰہی کی لوگوں میں تبلیغ اور ملکی سیاست، نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہلِ ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت جیسے اوصاف شامل ہیں۔ پہلے امر یعنی نبوت میں آپؐ کا خلیفہ اور نائب نہ تھا، نہ ہے اور نہ

ہوسکتا ہے۔ یہ امر بھی آپؐ کی ذات پر ختم ہوگیا۔ دوسرے امر کی ذیل میں "اولی الامر" میں آئمہ اہلِ بیت، علما اور فقہا کو داخل کیا گیا ہے۔ تیسرے امر یعنی خیفہ یا نائب میں حکمران طبقہ شامل ہے جو خود صفات اور اخلاق محمدی سے متصف اور تمام احکام شرعی کے پابند ہوں اور ان کا ظاہر و باطن مقدس ہو۔ مفسرین نے سرداران لشکرِ اسلام کو بھی اولی الامر میں شامل کیا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت ہر عام و خاص پر لازم ہوتی ہے:

> "بعض روایتوں پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان کو امام زمان کا جاننا اور اس سے بیعت کرنا واجب ہے گو یہ روایتیں بھی قابلِ وثوق اور لائق عتبار نہیں ہیں، مگر ہم اس پر کچھ بحث کرنا نہیں چاہتے اور ان کو تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے خلیفہ کا جس کی سلطنت میں وہ رہتا ہے جاننا اور اس سے بیعت کرنا ضرور ہے۔ بیعت کا مطلب صرف اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ ہم اس کے مطیع اور تابعدار ہیں اور جو شخص جس حکومت میں رہتا ہو اس کا فرض ہے کہ اس کی تابعداری کرے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اس کی حکومت میں نہیں رہتے، وہ بھی اس کی تابعداری کا اقرار کریں۔ غرضیکہ کوئی مسلمان بادشاہ ان مسلمانوں کے لیے جو اس کی سلطنت میں نہیں رہتے، خلیفہ نہیں ہوسکتا۔"[۲۲]

"خلافت اور خیفہ میں بھی سر سید کے خیفہ اور خلافت کے بارے میں ویسے ہی خیالات ملتے ہیں جو مذکورہ بالا مضمون میں شامل ہیں۔ سر سید کے یہ خیالات اس پر دال ہیں کہ سر سید خلافت کی صورت میں اسلام کی مرکزیت کے حق میں نہیں ہیں اور اولی الامر میں انگریز حکام کو مانتے ہیں اور ان کے احکامات کی پیروی کو مسلمانوں پر فرض سمجھتے ہیں جیسہ کہ دیگر مضامین میں انھوں نے واشگاف الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

"امام اور امامت" میں سر سید کی امام سے مراد وہ شخصیت نہیں جو سب سے آگے کھڑا ہو کر لوگوں کو نماز پڑھائے بل کہ وہ شخص مراد ہے جو بہ سبب کمال نفسی و روحانی

وعلمی و عملی کے امام کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

''اور جس نے تمام روحانی اور اخلاقی صفاتِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں مشابہت پیدا کرلی ہو اور ملک میں اس کی حکومت ہو جس میں اس کو احکامِ شرعی کے نفاذ اور مسلمانوں کی ہدایت اور حفاظت کا اختیار حاصل ہو، بلاشبہ وہ شخص بھی اس ملک کے لیے جو اس کی حکومت میں ہے، خلیفہ رسول اللہ اور امام کے لقب سے ملقب ہونے کا مستحق ہے، اور اگر اس نے اپنے تئیں ان صفات کمال کے جو رسول اللہ ﷺ میں تھیں مشابہ نہیں کیا، اور کسی ملک کی حکومت حاصل کی، جیسا کہ بنی امیہ و بنی عباس نے تو وہ درحقیقت اس ملک کے لیے اور اس ملک کے مسلمان رہنے والوں کے لیے سلطان ہے نہ امام، اور نہ خلیفہ رسول اللہ، گو کہ اس نے فخریہ طور پر خلیفہ کا لقب اختیار کیا ہو اور بزور حکومت اپنے تئیں خلیفہ کہلوایا ہو، اسی لیے اس نے اپنے اجتہاد سے جو احکام متعلق مذہب کے دیے ہوں وہ وقعت سے نہیں دیکھے جاتے۔''[۲۳]

سرسید کا خیال ہے کہ شیعہ امام کو معصوم، منصوب من اللہ اور مفروض الاطاعت قرار دیتے ہیں اور امام مہدی کو آخری امام کہتے ہیں جو پیدا تو ہو چکے ہیں لیکن ''سرمن رائے'' کی غار میں غائب ہو گئے ہیں اور قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے۔ مگر اہل سنت و جماعت کسی امام کو منصوب من اللہ اور معصوم عن الخطا نہیں مانتے، بل کہ سوائے پیغمبر کے کسی اور کو، خواہ وہ کیسا ہی مقدس، ذی علم اور صاحبِ فضل و کمال کیوں نہ ہو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ امام کی ہر بات کو بے چون و چرا واجب التعمیل سمجھتے ہیں جب کہ اہل سنت و جماعت کسی امام کی بات بے چون و چرا تسلیم کرنے کے قائل نہیں۔

''وراثت'' کے عنوان میں سرسید وراثت کے اسلام کے برخلاف تصورات کے برعکس اسلام کے وراثتی قانون کو کاملاً درست خیال کرتے ہیں۔

''جوتی پہنے ہوئے نماز پڑھنی'' میں سرسید نے جوتی پہن کر نماز پڑھنے کو صحیح مانا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے بعض دلائل بھی پیش کیے ہیں اور پھر ابن قیم کی تحقیقات کو درست مان کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> ''اس تمام تحقیقات سے جو ابن قیم نے کی ہے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جوتی پہنے ہوئے مسجد میں جانا اور جوتی پہنے ہوئے نماز پڑھنا ایک عام عادت تھی، مگر اس زمانہ میں اور بالخصوص ہندوستان میں مسلمانوں نے اس بات کو اپنی غلطی سے معیوب سمجھا ہے۔''[۲۴]

''خطبہ میں بادشاہ کا نام'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد تک کسی کا نام خطبہ میں نہیں لیا جاتا تھا۔بعد ازاں صحابہ کرام کے باہمی نزاعات اور محاربات اور خلفائے راشدین کی نسبت سب وشتم کے رواج کو مٹانے کی خاطر خلفائے راشدین اور عمین مکرمین کا نام لینے کا رواج ہوا تا کہ یہ معلوم ہو کہ سب کے سب واجب التعظیم اور قابلِ ادب ہیں۔تاریخ الخلفا سیوطی سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ۱۹۸ ہجری مطابق ۸۱۳ء کے محمد امین کی خلافت میں اس کا نام مع لقب فخریہ الفاظ کے ساتھ لیا گیا۔لیکن سرسید خطبہ میں بادشاہ کا نام لینا اور اس کے لیے دعا کرنا مذہبی مسئلہ نہیں خیال کرتے۔

''زمانہ کا اثر مذہب پر'' میں سرسید نے واضح انداز میں بتایا ہے کہ زمانہ کس طرح اثر ڈالتا ہے؟ زمانہ انسان کے خیالات، اعتقادات، رسوم ورواج کو اپنے پوشیدہ مگر نا معلوم اثرات سے بدل کر رکھ دیتا ہے۔نظامِ کائنات کسی صورت نہیں بدلتا مگر انسان کے خیالات اور اس کی معلومات میں ترقی ہو جاتی ہے۔

''کتابۃ الاعمال والمیزان والموازنہ'' میں سرسید نے میزان وموازنہ کے حوالے سے بحث کی ہے۔اس سلسے میں سرسید کہتے ہیں کہ انسان کے نیک اور بد اعمال کے جو اثرات روحِ انسانی میں مستقر ہوتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ نے کتابت کراما کاتبین کی مثال میں بیان کیا ہے اور وہی ذریعہ ہیں نیکی وبدی کی مقدار ظاہر ہونے کا، جو نتیجہ ہے

میزان اور موازنہ کا، اس لیے وزن اعمال کی مثال سے اس کو تعبیر کیا ہے اور اس بات کو جتلایا ہے کہ قیامت میں کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔

''گناہ سے کیوں عذاب ہوتا ہے اور شرک سے کیوں نجات نہیں ہوتی'' مقدمات مسلمہ میں سرسید نے ان سات مقدمات کا ذکر کیا ہے جنھیں ان کے ایک دوست مقدمات مسلمہ کا نام دیتے تھے جن میں سے پہلے چھ مقدمات کو تو سرسید نے تسلیم کرلیا لیکن آخری مقدمہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان ک دوست کے خیال میں اخلاق حمیدہ سے خدا کی شان میں کچھ زیادتی اور خصائص ذمیمہ سے اس کی شان میں کچھ نقصان نہیں ہوتا تو پھر کیوں خدا گناہوں کی سزا دیتا اور شرک کو مانع نجات قرار دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں سرسید کہتے ہیں کہ گناہ اُخروی زندگی کے حق میں ایسے ہیں جیسے دنیاوی زندگی کے لیے زہر، جب کہ شرک ایسی چیز ہے جس کا اکتساب روح کو ایسا ضعیف بنا دیتا ہے کہ اس کی برائی سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی اور ہمیشہ دوزخ میں رہتی ہے۔

''آدم کی سرگزشت'' میں سرسید نے حضرت آدمؑ کی داستان کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے سرسید نے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ اس بحث کو نہایت دلچسپ انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے سرسید نے حضرت آدمؑ کے لفاظ میں یوں انجام تک پہنچایا ہے:

> ''پس تمام عباد اور تمام شکر اور تمام انسانیت یہی ہے کہ انسان اپنے تمام قویٰ کو جو خدا نے اسے دیے ہیں کام میں لاتا رہے اور اسی طرح پر کام میں لاوے جس طرح کہ ان کا کام میں لانا ان کے صانع کی مرضی ہو اور اس مرضی پے ظاہر ہونے کا خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں وعدہ کیا ہے۔
> **اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم منّي هدى فمن تبع هدىٰ فلا خوف عليهم ولاهم يحزنون والذين كفروا وكذبوا بايٰتنا اولٰئک اصحاب النارهم فيها خالدون۔''** [۲۵]

''حضرت ابراہیم علیہ السلام اوران کا مذہب حنیف'' میں حضرت ابراہیمؑ کے مذہب کی وضاحت کی ہے اور واضح کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کبھی بت پرستی نہیں کی، بل کہ وہ ہمیشہ دینِ حنیف کے پیروکار رہے۔ سر سید نے قرآنی آیات کے حوالے دے کر عبدالمسیح والے واقعے کا رد کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کو پکا اور سچا مسلمان ثابت کیا ہے:

> ''مامون رشید کے زمانہ میں عبدالمسیح ابن اسحاق کندی جس کا مذہب عیسائی تھا اور بڑا عالم تھا، مامون رشید کے دربار میں ایک بہت معزز عہدہ پر ملازم تھا۔ مامون رشید کے ایک قریبی رشتہ دار نے جس نے اپنا لقب الہاشمی قرار دیا ہے، ایک خط عبدالمسیح کے نام دعوت اسلام کا بھیجا اور یہ خواہش کی کہ وہ بھی مسلمان ہو جائے۔ عبدالمسیح نے سختی سے اس خط کا جواب لکھا ہے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس جواب میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس زمانہ تک جب کہ وہ پیغمبر ہوئے، یعنی پچھتر برس کی عمر تک بت پرستی کیا کرتے تھے اور وہی بت پرستی کا مذہب مذہب حنیف کہلاتا تھا، مگر یہ دونوں باتیں محض غلط ہیں۔ توریت مقدس سے یا اور کسی کتاب سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کسی وقت اور کسی زمانہ میں بت پرستی کی ہو، بل کہ برخلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کبھی بت پرستی، یعنی شرک نہیں کیا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی نسبت متعدد جگہ آیا ہے کہ وما کان من المشرکین، یعنی ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھا اور خود حضرت ابراہیمؑ کا قول قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: ''ما انا من المشرکین'' یعنی میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' [۴۶]

''صابا صابا'' میں سر سید نے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں آنے کی وجوہات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو اس بحث سے خارج

کر دیتے ہیں جو کسی ڈر یا لالچ کے باعث اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں۔ سر سید صرف اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ دوسرے مذہب کی کون سی خوبی نہایت سچائی کے ساتھ اب کے دل میں بیٹھ جاتی ہے جس سے وہ پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں؟ سر سید بیان کرتے ہیں کہ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں ایک تو یہ کہ اپنے مذہب کی سخت پابندیاں اور سخت احکام کسی شخص کو دوسرے مذہب میں جانے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ دوسری یہ کہ دوسرے مذاہب کے مسائل اور عقائد کسی شخص کو اچھے لگے تو وہ مذہب اختیار کر لیا۔ تیسری یہ کہ راہ ہدایت اختیار کرنا اللہ کی جانب سے ہے تو وہ اس پر یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر گم راہی کس کی طرف سے ہے؟ تیسری یہ کہ کسی شخص کو کسی مذہب کی کچھ باتیں کسی دلیل سے یا بغیر کسی دلیل کے سچ معلوم ہونے لگتی ہیں تو وہ مذہب اپنا لیتا ہے۔ چوتھی یہ کہ کسی مذہب کے لوگوں کی بزرگی، تقدس، اخلاق کی خوبی، نیکی اور نیک خصلت کسی کو اس مذہب کی طرف مائل کرتی ہے۔ مگر یہ سب وجوہات ہر ایک کے دوسرا مذہب اختیار کرنے کا موجب نہیں ہوتیں بل کہ سر سید کا خیال ہے:

> ''علما کے ذریعہ سے تو شاید دو چار دس پانچ آدمی مسلمان ہوئے ہوں، مگر فقراء اور اولیاء اللہ کی بدولت ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔'' [۲۷]

''العجب ثم العجب'' میں سر سید نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تفہیمات الٰہیہ میں سے انتخاب کردہ ایک تحریر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر انھوں نے بہ ذریعہ کشف کے بیان کیا ہے تو اس میں کچھ کلام نہیں لیکن اگر انھوں نے کتاب وسنت سے اخذ کیا ہے تو وہ کسی صاحب علم دوست سے ماخذات کے منتظر ہیں۔

''سبع ارضین'' میں سر سید نے سات زمینوں کے وجود کی حقیقت پر بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زمین ایک ہے لیکن اس کے سات طبقات ممکن ہیں۔ ان کے خیال میں زمینوں کا متعدد ہونا عیسائیوں، یہودیوں، آتش پرستوں، ایرانیوں، عبرانیوں، لاطینیوں اور یونانیوں میں نہیں تھا، لیکن شاید ہندوؤں میں ہو۔ اسلام میں

بھی سات زمینوں کا جداگانہ ہونا کسی طور ثابت نہیں ہے۔

''اگلے زمانے میں علومِ دینیہ اور علومِ عربیہ وفلسفۂ یونانیہ کی ترقی کس وجہ سے تھی اور اب کیوں تنزل ہوگیا ہے؟'' میں سرسید نے مختلف ادوار میں مختلف علوم کے عروج وزوال کی داستاں رقم کی اور آخر میں مسلمانوں کو نصیحت کی:

> '' مذہب اسلام کی شان ارفع ہے اور دنیاوی جاہ وتمکنت، دولت وعزت کے حاصل کرنے سے اور اس میں ترقی کرنے سے اس میں کچھ خلل نہیں آتا۔ اسلام کی عزت، اسلام کی شان وشوکت خود مسلمانوں کی عزت اور مسلمانوں کی شان وشوکت سے ہے وہ علاحدہ بت نہیں ہے جس کی پرستش مسلمانوں سے ایک علاحدہ مندر یا کعبہ کی چار دیواری میں کی جائے۔ تاریخِ اسلام کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ جب کبھی مسلمانوں نے علومِ دنیوی میں ترقی کی اور دنیا میں دولت اور عزت شان وشوکت حاصل کی وہی زمانہ اسلام کی ترقی اور جاہ وجلال اور عزت وشوکت کا سمجھا جاتا ہے۔''[۲۸]

''حکایت ایک نادان خداپرست اور دانا دنیادار کی'' میں سرسید نے دو اشخاص کی کہانی بیان کی ہے۔ ایک شخص خداپرست تو تھا لیکن نادان بھی تھا، جب کہ دوسرا دنیادار تھا لیکن دانا بھی تھا۔ جب انھوں نے خدا کو پالیا تو خداپرست نے اللہ کی محبت اور دنیا کی خرافات سے نفرت مانگی۔ جب کہ دنیادار نے نیک کاموں کے لیے دنیا مانگی۔ دونوں کی مراد پوری ہوگئی۔ خداپرست معاشی تنگدستی کے باعث کسم پرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا جب کہ دنیادار نے نیکی کے کاموں پر دولت خرچ کرکے اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار لیں۔

''اہلِ سنت والجماعت کے لیے مجتہد کی ضرورت'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ مذہب شیعہ امامیہ کے نزدیک زمانہ مجتہد العصر سے خالی نہیں ہوتا اور ہونا بھی نہیں چاہیے لیکن ان کا یہ مسئلہ کہ مات المفتی مات الفتویٰ درست نہیں ہوسکتا۔ جب اہلِ سنت والجماعت کے خیال میں اجتہاد ختم ہوگیا ہے لیکن وہ اس پر متفق نہیں کہ آیا خاتم

المجتہدین زید ہیں یا عمرو؟ لیکن اس کے باوجود بعض علما کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے شاہ ولی اللہ۔ سر سید نے ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا اسلام کی رو سے درست ہے۔

''انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اسلامی احکام کی رو سے'' میں سر سید نے قرآن وسنت کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انگریز چوں کہ اہل کتاب ہیں اس لیے ان کے ساتھ کھانا پینا شرعاً جائز ہے۔

س کتاب میں مصنف نے معروضی انداز میں سر سید کے اسلامی افکار کو بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں جانبداری کہیں بھی نظر نہیں آتی نا ہی وہ کسی طرح بھی اپنی رائے کو نافذ کرتے نظر آئے ہیں تاہم یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کتاب سر سید شناسی کی روایت میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

مقالاتِ سر سیّد، جلد سیزدہم ۱۹۹۳ء مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

اردو کا کلاسیکی ادب کے تحت مقالاتِ سر سیّد (حصہ سیزدہم) از سر سید احمد خاں کے مرتب مولانا محمد اسماعیل پانی پتی ہیں۔ اسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے دوسری بار ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ یہ تحقیق ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تصنیف چار ابواب پر مشتمل ہے۔

فہرست میں ''(۱) سر سید کے ذاتی عقائد کے متعلق مضامین'' کی ذیل میں درج ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے ہیں۔

۱۔ اعتقدی باللہ، ۲۔ دافع البہتان، ۳۔ خدا، رسولؐ اور قیامت کے متعلق سر سید کے عقائد، ۴۔ استجابتِ دعا اور سر سید، ۵۔ دعا اور اس کی قبولیت، ۶۔ وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت، ۷۔ نبوت ایک فطری امر ہے، ۸۔ معجزہ کی حقیقت، ۹۔ کیا معجزہ دلیل نبوت ہے؟ ۱۰۔ کیا معجزات باعثِ ایمان ہوتے ہیں؟، ۱۱۔ آنحضرت اور صدورِ معجزات، ۱۲۔ قرآن کریم کس لحاظ سے معجزہ ہے؟، ۱۳۔ ناسخ ومنسوخ کی بحث، ۱۴۔ آیاتِ

محکمات ومتشابہات، ۱۵۔ جبرئیل ومیکائیل اور فرشتوں کا وجود، ۱۶۔ فرشتوں اور شیطان کی حقیقت، ۱۷۔ شیطان کا وجود اور انبیا، ۱۸۔ استویٰ علی العرش سے کیا مراد ہے، ۱۹۔ لفظ سمٰوٰت قرآن مجید میں، ۲۰۔ آسمان کے برجوں کا بیان ور رجمِ شیاطین کی تحقیق، ۲۱۔ حقیقۃ الرویاء، ۲۲۔ مسئلۂ جبرو اختیار، ۲۳۔ مسئلۂ متعہ کی تحقیق، ۲۴۔ تعددِ ازواج کا مسئلہ، ۲۵۔ مسئلۂ طلاق، ۲۶۔ جہاد کا قرآنی فلسفہ، ۲۷۔ نفخِ صور کی حقیقت، ۲۸۔ معاد کے حالات حقیقت کی روشنی میں، ۲۹۔ بہشت کی ماہیت۔

(۲) ''مضامین متعلق بہ استفسارات'' کے عنوان کے تحت'' درج ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے ہیں۔

۔اخبارات کے اعتراضات اور ان کے جوابات، ۲۔ سوال۔ خدا نے یہ تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی؟ ۳۔ وحی والہام پر ایک صاحب کے خیالات اور ان پر سرسید کا تبصرہ

(۳) ''ترکوں کے متعلق مضامین'' کے زیرِ عنوان درج ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے ہیں۔

ا۔ ترک، ۲۔ یونانی اور ترک، ۳۔ ذکر ترکی یعنی روم کی مجلسوں کا، ۴۔ ترکوں کی تہذیب، ۵۔ سلطانِ روم اور ہندوستان کے مسلمان، ۶۔ ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی، ۷۔ سلطان روم بھی ہندوستان کے مقدسوں کے نزدیک کافر، ۸۔ ترکی کا شیخ الاسلام، ۹۔ ترکی کی حالت، ۱۰۔ ملک یمین، ۱۱۔ روس اور ترک، ۱۲۔ انگلستان، روس اور ترکی کا معاملہ، ۱۳۔ ترکوں کے یتیموں اور زخمیوں کے لیے چندہ، ۱۴۔ چندہ برائے یتیمان وبیوگان وزخمیان، ۱۵۔ ٹائمز از اے گریٹ ریفارمر۔

''(۴) مضامینِ متعلق واقعتِ حاضرہ'' کے عنوان کے تحت درج ذیل موضوعات زیرِ بحث رہے ہیں۔

۔ دہلی کا دربار اور اس کا خرچ ۲۔ رہائی ۳۔ جیل خانوں کی رپورٹ ۴۔ عدالت ہائے سرکاری کی تخفیف ۵۔ قاتل تحصیلدار فتح آباد ۶۔ قابلِ نفرت حرکت ۷۔ وکیلوں

اور مختاروں کے واسطے یکساں لباس ہونا ۸۔ شاہجہان پور کا واقعہ ۹۔ قانون معیاد نکاح ۱۰۔ فساد ۱۱۔ بچہ کشی کی عجیب واردات ۱۲۔ ہندوستانیوں کا خون ۱۳۔ گورنر جنرل کے حکم کا اثر ۱۴۔ زبردستی کا سلام ۱۵۔ زمانے کی ترقی کے آثار ۱۶۔ اودھ اخبار اور منشی غلام محمد خاں ۱۷۔ تجارت ۱۸۔ صاحب بہادر کی چوری ۱۹۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۲۰۔ کلکتہ میں ایک صاحب کا بھنگی سے مقدمہ ۲۱۔ صاحبانِ یورپ کا دیسی زبان میں امتحان ۲۲۔ ترمیم احکامِ شریعت، ۲۳۔ حیدرآباد کا ہنگامہ، ۲۴۔ انتظام مہمانی، ۲۵۔ لارڈ نارتھ بروک کی فیاضی، ۲۶۔ لارڈ نارتھ بروک کا استعفیٰ ۲۷۔ جوتے کا مقدمہ ۲۸ نئی تہذیب، ۲۹۔ وفات لارڈ ہابرٹ صاحب بہادر گورنر مدراس۔ اور ''ضمیمہ'' کے تحت، واقعہ معراج کی حقیقت واصیت، کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

پہلے باب میں ''سرسید کے ذاتی عقائد کے متعلق مضامین'' کے عنوان کے تحت ''اعتقادی باللہ: اشہدان لا الہ الا اللہ'' میں سرسید اقرار کرتے ہیں کہ تمام جہانوں کا خالق اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہمیشہ سے قائم ودائم ہے۔ اس کا ہونا ضروری ہے اور اس کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ اس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ وہ زندہ ہے اپنی ذات سے نہ کہ جان سے۔ جو بھی صفات اس میں موجود ہیں اس کی ذات سے ہیں۔ تمام مخلوقات اور معلومات کا مالک ہے۔ کائنات کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ قوی وعزیز ہے۔ غرض تمام تر صفات اس میں ذاتی ہیں اور کوئی بھی اس کے حکم سے سرتابی کرسکتا ہے اور نہ زمین وآسمان کے کناروں سے باہر جاسکتا ہے۔

''دافع البہتان (تہذیب الاخلاق بابت ۱۵ شعبان ۱۲۹۱ھ)، (ان اعتراضوں کے جواب جو سرسید پر کیے جاتے تھے)'' میں سرسید نے جناب سید الحاج مولانا مولوی حاجی علی بخش خاں صاحب بہادر سب آرڈینٹ جج گورکھ پور کے اتہام کا جواب تحریر کیا ہے:

''جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ مجموعہ موجودہ اسلام مخاطب یعنی

میرے نزدیک قطعاً باطل ہے۔ یہ محض اتہام ہے۔ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے میں نے ایک مقام پر جہاں یہ بحث کی ہے کہ مذاہب مختلفہ میں کون سا مذہب سچ ہوسکتا ہے اور بعد ایک لمبی تقریر کے بیان کیا ہے کہ مذہب اسلام کے سوا اور کوئی مذہب سچ نہیں ہوسکتا وہاں میں نے لکھا ہے کہ اسلام سے میری مراد یہ مجموعہ احکام نہیں ہے کیوں کہ اس میں احکام منصوصہ اور اجتہادیات ور قیاسیات سب شامل ہیں جن میں خطا کا احتمال ہے اس مقام پر میری مراد مذہب اسلام سے صرف احکام منصوصہ ہیں بس یہ کہنا کہ مخاطب کے نزدیک مجموعہ موجودہ اسلام قطعاً باطل ہے کیسا غلط اور کتنا بڑا اتہام ہے۔ لعنت خدا کی ہو اس پر جس نے یہ لکھا ہو اور جس کا یہ اعتقاد ہو میں نے یہ لکھا ہے کہ جب اس سچے مذہب (یعنی اسلام) میں بھی لغو خیلات ور بد تعصبات مل جاتے ہیں تو وہ ویسا ہی انسان کی ترقی کا ہارج ہوتا ہے کجا یہ لفظ اور کجا وہ عقیدہ جو سید الحاج نے میری نسبت لکھا ہے۔"[۲۹]

سید الحج کے اعتراضات اور الزامات و تہامات کے جوابات تحریر کرنے کے بعد سر سید اپنے تئیں عقائد کی وضاحت کرتے ہیں, ور آخر میں امید کرتے ہیں:

"مجھے امید ہے کہ جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کیے ہیں، مگر ظاہراً اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ اول صرف اس خیالی اور بے اصل ور بے اصل خوشی کا حاصل کرنا کہ لوگ جناب سید الحاج کو کہیں کہ واہ کیا مسلمان ہیں۔ حضرت مسلمان عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب بدایوں میں تشریف لے جاتے ہوں گے تو دو چار محلہ کے آدمی ان کو کہتے ہوں گے کہ واہ کیا لکھا ہے اور جناب سید الحاج خوش ہوتے ہوں گے، دگر ہیچ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا

کہ لوگ حج کو جاتے ہی ہیں۔ جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہو ہی جاویں گے۔ حج سے آپ کے سب گناہ معاف ہو گئے ہوں اور شبلیؒ و جنیدؒ کے مرتبہ پر پہنچ گئے ہوں بل کہ اس سے بھی اعلیٰ، مگر حقوق العباد کبھی نہ حج سے بخشے جاتے ہیں اور نہ کسی بشارت سے۔ پس آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک میں ہی معاف نہ کروں معاف نہیں ہو سکتے۔ پس مقتضائے حج دراحمدی کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا کو آپ کو اپنی کرتوتوں کا مزا معلوم ہو جائے گا۔ واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم۔" ۳۰

"خدا، رسول اور قیامت کے متعلق سرسید کے عقائد (اخبار "صدق جدید" لکھنؤ بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء)" میں سرسید کے اللہ، اس کے رسولؐ اور قیامت کے بارے میں اپنے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنے کا اعلان کیا تو اس مفید کام میں قوم نے ان کی مدد کرنے کی بجائے ان پر بڑی شدومد کے ساتھ کفر کے فتوے لگائے۔ مکہ معظمہ سے سرسید کے کفر کے فتوے منگوائے گئے۔ اسی سلسلے میں مومنین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس بھی پہنچے۔ یاد رہے کہ کفر کے فتوے میں یہ لازمی شق ہوتی تھی کہ متعلقہ شخص کی بیوی پر طلاق ہے۔ جب علمائے کرام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پاس فتوے کی تحریر لے کر پہنچے تو اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب مولانا نانوتوی نے ذاتی طور پر تحقیق کا ارادہ ظاہر کیا وہ بھی اس صورت میں جب یہ متفق علیہ مسئلہ تھا:

سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

مولانا نے تین سوالات لکھ کر سرسید کو بھیجے اور کہا کہ مختصر جواب لکھ کر بھیجیں:

۱۔ سوال: خدا کی نسبت آپ کا جو عقیدہ ہو وہ بہت مختصر طور پر چند لفظوں میں لکھ دیں۔

جواب۔ خدا تعالیٰ ازلی، ابدی، مالک، اور صانع تمام کائنات کا ہے۔

۲۔سوال: حضرت نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کے متعلق آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟

جواب: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

۳۔سوال: قیامت کی بابت آپ کے خیالات کیا ہیں؟ جواب مختصر ہو؟

جواب: قیامت برحق ہے۔

سرسید کی طرف سے تینوں سوالات کے یہ جواب پاکر حضرت مولانا نے علمائے کرام سے فرمایا: ''کیا تم ایسے شخص کے کفر پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟ جاؤ میں قیامت تک اس فتوے پر دستخط نہیں کروں گا۔'' (۳۱)

''استجابت دعا اور سرسید از'' ''آخری مضامین سرسید'' میں بتایا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک اشتہار ۲۵ جون ۱۸۹۷ء کے مطابق فرقہ نیچریہ کو دعاؤں کی قبولیت کا منکر قرار دیا ہے جو کہ صریح غلطی پر مبنی ہے۔فرقہ نیچریہ کا اعتقاد ہے کہ خدا مستجاب الدعوات ہے اور ہر ایک بندے کی دعا قبول کرتا ہے،مگر دعا کی قبولیت کا مطلب ہے کہ اگر مسئول عنہ مقدر میں ہے تو ہو جاتا ہے ورنہ خدا دعا قبول کر کے دعا مانگنے والے کو ثواب آخرت دیتا ہے لیکن کسی کی دعا رد نہیں کرتا۔مرزا صاحب کا اشتہار میں یہ لکھنا کہ یہ لوگ دعا کے منکر ہیں، اس لائق ہے اس کسی وقت خاص میں دوبارہ غور کریں۔

''دعا اور اس کی قبولیت منقول'' از رسالہ ''الدعاء والاستجابہ'' میں سرسید نے سب سے پہلے دعا اور ندا کو ایک دوسرے کا مترادف ثابت کیا ہے۔بعد ازاں اس امر کے اثبات میں کئی آیات اور احادیث کے حوالے پیش کیے ہیں جن کے نتیجے میں اپنا عقیدہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

> ''جو لوگ کہ حقیقت دعا سے اور جو اس میں حکمت ہے اس سے ناواقف ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ امر مسلم ہے کہ جو مقدر نہیں ہے وہ نہیں ہونے کا تو دعا سے کیا فائدہ ہے،مگر اس میں چند نا سمجھیاں ہیں۔اول تو یہ معلوم نہیں کہ وہ مقدر ہے یا نہیں۔دوسرے یہ کہ وہ ایسا کہنے میں فطرتِ انسانی

کو بھول جاتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں یہ امر داخل ہے کہ حالتِ اضطرار میں یا حصولِ مطلب کے لیے دوسرے سے استمداد کی خواہش رکھتا ہے۔ بلا خیال اس کے کہ وہ ہوگا یا نہیں اور انسان کی یہ فطرت اُس سے جدا نہیں ہو سکتی اور یہ مقتضائے س کی فطرت کے اس کو کہا گیا ہے کہ خدا ہی سے مانگو جو مانگو۔''[۳۲]

''وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت'' میں سرسید نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وحی الٰہی کیا ہے اور نبوت کی کیا حقیقت ہے؟ سرسید کا خیال ہے کہ وحی وہ چیز ہے جسے قلب نبوت پر اسی فطرت نبوت کے باعث 'مبدیٔ فیاض نے نقش کیا ہے۔ وہی ارتعاش قلبی کبھی مثل بولنے والی آواز کے انھیں ظاہری کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی وہ نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے نہ بولنے والا۔ خدا نے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر جبرئیل کا نام لیا ہے۔ جب کہ سورۂ بقرہ میں اس کی ماہیت کا تعین بھی کر دیا ہے کہ جبرئیل نے نبی کریمؐ کے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے۔ دل میں اتارنے یا ڈالنے والی چیز وہی ہوتی ہے جو فطرتِ انسانی میں ہو:

''پس وحی وہ چیز ہے جس کو قلب نبوت پر بسبب اسی فطرت نبوت کے مبدءِ فیاض نے نقش کیا ہے۔ وہی ارتعاش قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے نھیں ظاہری کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی وہ نقش قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے نہ بولنے والا۔ خدا نے بہت سی جگہ قرآن میں جبرئیل کا نام لیا ہے۔ مگر سورۂ بقرہ میں اس کی ماہیت بتا دی ہے جہاں فرمایا ہے کہ جبرئیل نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے۔ دل پر اتارنے والی یا دل میں ڈالنے والی وہی چیز ہوتی ہے۔ جو خود انسان کی فطرت میں ہو۔ نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اس کی خلقت سے جس کے

دل میں ڈالی گئی ہے جداگانہ ہو۔'' ۳۳

سرسید نے اسی ملکۂ انسانی کو ملکۂ نبوت کہا ہے۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے۔ وہی پڑھتا ہے۔ وہی مطلب بتاتا ہے اور یہ سب کام فطری قوت نبوت کے ہیں اللہ نے مثل دیگر قویٰ کے انبیا میں پیدا کی ہے۔ اسی کو ناموس اکبر اور جبرئیل پیغام بر کہا جاتا ہے۔

''نبوت ایک امر فطری ہے'' میں سرسید نے گزشتہ مضمون کی جزئیات کو ہی شاملِ مضمون کیا ہے۔ اگرچہ بعض نکات کا اضافہ بھی کر دیا اپنے مضمون کو زیادہ معتبر بنانے کے لیے۔

''معجزہ کی حقیقت'' میں سرسید نے معجزہ کی تشریح و تعبیر عقلی سطح پر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ در حقیقت معجزہ کیا ہوتا ہے؟ سرسید نے عقلی دلائل سے معجزہ کی حقیقت اپنے انداز میں بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے خیالات کو بھی شامل کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

> ''حکما و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار کسی وجہ سے کیا ہو مگر ہمارا نکار صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ وہ مخالف عقل کے ہیں اور اس لیے انکار کرنا ضرور ہے بل کہ ہمارا انکار اس بنا پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات و کرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرق عادت یعنی خلافِ فطرت یا خلافِ جبلت یا خلاف خلقت یا خلاف قدر التی قدرھا اللہ کے امتناع پایا جاتا ہے جس کو ہم مختصر لفظوں میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلاف قانون قدرت واقع نہیں ہوتا اور اس لیے معجزات و کرامات سے جب کہ ان کے معنوں میں غیر مقید ہونا قانون قدرت کا مراد دیا جاوے تو انکار کرتے ہیں اور اگر ان کے مفہوم میں یہ بھی داخل کیا جاوے کہ وہ مطابق قانون قدرت کے واقع ہوتے ہیں تو صرف نزاع لفظی باقی رہ جاتی ہے کیوں کہ

جو امر کہ واقع ہوا اور جس شخص کے ہاتھ سے واقع ہوا اس کو ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اس کا معجزہ یا کرامت نام رکھتے ہیں ہم اس کا یہ نام نہیں رکھتے۔''۴۴

''کیا معجزہ دلیل نبوت ہے؟'' میں سرسید نے معجزہ کو دلیل نبوت ماننے سے انکار کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ ابن رُشد کے نظریات سے بھی ستفادہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے:

''معجزہ نبوت کے ثبوت کی کیوں کر دلیل ہوسکتا ہے۔اثباتِ نبوت کے لیے ول خدا کا وجود اور اس کا متکلم ہونا اور اس میں اپنے ارادہ سے کام کرنے کی قدرت کا ہونا اور اس کا تمام بندوں کا مالک ہونا ثابت کرنا چاہیے۔پھر اس کا ثبوت چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے رسول و پیغمبر بھیجا کرتا ہے پھر یہ ثابت ہونا چاہیے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت اس کا بھیجا ہوا ہے۔ہم پہلی دونوں باتوں سے قطع نظر کرتے ہیں کیوں کہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسے مقامات پر اکثر اہل کتاب مخاطب ہیں جو ان دونوں پہلی باتوں کو مانتے تھے اور اس لیے معجزات سے صرف تیسری بات ثابت کرنا مقصود ہے۔''۴۵

''کیا معجزات باعث ایمان ہوتے ہیں؟'' میں سرسید نے اس بات کا انکار اور رد کیا ہے کہ معجزات انبیا پر ایمان لانا واجب ہوتا ہے۔ان کے خیال میں انبیا یا کسی ہادی باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانون قدرت کے تابع ہے۔سلیم الطبع انسانوں کا رجحان سیدھی اور سچی بات ماننے کی طرف ہوتا ہے اس کے لیے وہ کسی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے۔وہ صرف نبیا کا وعظ سن کر ان پر ایمان لے آتے ہیں۔جب کہ معجزوں کے طلب گار انسان کبھی ایمان نہیں لاتے۔پس ایمان لانا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے۔

''آنحضرت اور صدور معجزات'' میں سرسید نے بہت سی قرآنی آیات، احادیث

اور امام فخر الدین رازی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے خیالات کا حوالہ دے کر صرف قرآن کو معجزہ قرار دیا ہے۔ علما جتنے بھی معجزات کا ذکر کرتے ہیں اس سے سرسید نے انکار کیا ہے۔

''قرآن کریم کس لحاظ سے معجزہ ہے'' میں سرسید نے قرآن کی معجزانہ صورت کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے سورہ بقرہ کی آیت کا حوالہ دیا ہے:

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃٍ من مثلہٖ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔

ترجمہ اور اگر تم کو اس میں شبہ ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس طرح کی ایک سورۃ بنالاؤ اور اپنے مددگاروں کو بھی بلالاؤ سوائے اللہ کے۔اگر تم سچے ہو۔

س آیت کریمہ کے بعد مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

''ناسخ و منسوخ کی بحث'' کے تحت سرسید بیان کرتے ہیں کہ علما، مفسرین اور محدثین ناسخ و منسوخ کے جس نظریے کے قائل ہیں، وہ بالکل غلط ہے۔یہودی سمجھتے تھے کہ حضرت موسیٰ پر جو شریعت اتری ہے وہ کبھی منسوخ یا تبدیل نہیں ہونے والی، جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو آیت کہ ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ اسی کی مانند یا اس سے بہتر آیت دیتے ہیں۔اس سے مراد قرآن کی آیت مراد نہیں ہے بل کہ موسوی شریعت جو شریعتِ محمدی ﷺ میں تبدیل ہوگئی۔مفسرین نے تو یہاں تک کیا کہ ''ننسھا'' سے مراد یہ لیا کہ حضرت محمد ﷺ بعض آیتوں کو بھول بھی گئے تھے۔اسی نسخ اور ننسھا کی بناپر مفسرین نے جھوٹی اور مصنوعی روایتوں کے بیان سے اپنی تفسیروں میں ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے۔انھی جھوٹی روایتوں کی بناپر انھوں نے قرآن مجید کی آیات کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے:

اول: وہ آیتیں جن کی تلاوت اور احکام دونوں بحال ہیں اور وہ سب آیتیں قرآن

مجید میں موجود ہیں۔

دوم: وہ آیتیں جن کی تلاوت بحال ہے اور احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔ ان آیتوں کی نسبت بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں موجود ہیں۔

سوم. وہ آیتیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے مگر احکام بحال ہیں۔

چہارم: وہ آیتیں جن کی تلاوت اور احکام دونوں منسوخ ہو گئے ہیں اور تیسری اور چوتھی قسم کی آیتوں کی نسبت کہتے ہیں کہ قرآن میں موجود نہیں ہیں، مگر ان جھوٹی روایتوں میں ان کا موجود ہونا بیان کرتے ہیں۔[۳۶]

سر سید ایسی باتوں پر اعتماد نہیں کرتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آنحضرتؐ پر اترا ہے۔ آپ ﷺ کے عہد میں تحریر ہو چکا ہے وہ بے کم و کاست قرآن میں موجود ہے۔ اس میں سے کوئی حرف بھی خارج نہیں اور کوئی بھی آیت منسوخ نہیں:

''اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ان تمام آیتوں کو جن سے مفسرین در فقہا نے قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ ہونے کا دعویٰ پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر سامنے رکھ لیا جاوے اور ان پر غور و تعمق کی نظر ڈالی جاوے اور ان کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جاوے تو ان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیتیں شرائع سابقہ انبیا کے بعض احکام کے تبدیل ہونے سے تعلق رکھتی ہیں نہ قرآن مجید کی آیتوں کے باہم ناسخ و منسوخ ہونے سے۔''[۳۷]

''آیات محکمات و متشابہات'' میں سر سید نے قرآن مجید میں موجود آیت محکمات و متشابہات کی معنویت اور توضیح پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ عربی زبان میں محکم بات ہے جو ایسی صاف اور شستہ ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آئے اور دوسرے مطلب کو نہ آنے دے اور متشابہ ایسی بات جس کے کئی معانی و مفاہیم سمجھ میں آتے ہوں اور بہ خوبی تمیز نہ ہو سکتی ہو کہ کون سا مطلب مقصود ہے یا جو معنی اس کے الفاظ سے متبادل ہوتے ہیں وہ مقصود نہ ہوں، بل کہ وہ الفاظ بہ طور تمثیل

یا مجاز و استعارہ کے آئے ہوں۔ سر سید کا خیال ہے کہ توحید اور اعمال حسنہ سے متعلق قرآن مجید میں جتنی آیات موجود ہیں وہ سب کی سب آیات محکمات کے زمرے میں آتی ہیں جبکہ اللہ کی صفات سے متعلق جتنی بھی آیت ہیں وہ آیات متشابہات کی ذیل میں شمار کی جائیں۔ کیوں کہ ان کے معانی واضح نہیں ہیں جیسے سمیع و بصیر کی صفات پر غور کرنے سے ہم اپنی سماعت اور بصارت کو خیال میں لائیں گے، لیکن درحقیقت اللہ کی یہ صفات، صفات انسانی سے بالکل جدا چیز ہیں۔

''جبرئیل و میکائیل اور فرشتوں کا وجود'' میں سر سید نے فرشتوں کے وجود کا انکار کرتے ہوئے انھیں اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات تصور کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہودیوں نے فرشتوں کے لیے جبرئیل اور میکائیل جیسے نام مقرر کیے تھے اور ان کے ہاں سات فرشتے مشہور ہیں باقی غیر مشہور۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ کسی نبی نے انھیں بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحف انبیا میں کوئی صفت صفات باری میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔ قرآن مجید میں ان الفاظ کا استعمال ویسے ہی ہوا جیسے یہودی خیال کرتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی علمانے یہودیوں کی تقلید میں ان کو فرشتے کہا۔ قرآن مجید میں جبرئیل اور میکائیل دو فرشتوں کے نام آئے ہیں۔ یہ دونوں نام تلفظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہودیوں کے ہاں بھی مشہور ہیں کیوں کہ یہودیوں کی زبان عبرانی ہے۔

''فرشتوں اور شیطان کی حقیقت'' میں سر سید نے فرشتوں اور شیطان کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عبرانی، یونانی اور فارسی زبانوں میں لفظ ''ملک'' کے معنی ایلچی یا پیامبر کے ہیں جو خدا کا پیغام انبیا تک پہنچاتا ہے۔ توریت میں بعض مقامات پر عام ایلچی، مذہبی پیشوا، ابر، ہوا اور وبا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جن مخلوقات کو وہ نہیں جانتا اور دیکھا تک نہیں ان کا وجود اپنے تصور میں قائم کر لیتا ہے جو معاشرے میں رفتہ رفتہ جڑ پکڑنا شروع کر دیتا ہے

اور پھر پختہ ہو جاتا ہے اور نسل در نسل چلتے ہوئے ایسا مستحکم ہو جاتا ہے کہ گویا اس میں شک وشبہ مطلق ہے ہی نہیں۔ یہی حال فرشتوں کے حوالے سے ہوا ہے۔ انھیں نوری مخلوق سمجھا گیا جن کی گوری گوری سفید برف سی رنگت، نوری شمع کی مانند بانہیں، بوریں پنڈلیاں، چہرے جیسے پاؤں، ایک خوب صورت انسان کی شکل جو نہ مرد ہے اور نہ عورت۔ آسمان ان کا ٹھکانہ ہے۔ آسمان اور زمین تک آنے جانے کے لیے ان کے پر لگا دیے۔ کسی کو شان دار اور کسی کو غضب ناک، کسی کو کمشان کا کسی کو صور پھونکتا، کسی کو آتشیں کوزے سے مینھ برساتا خیال کیا ہے۔ اب تو فرشتوں کی نسبت دو فرقے ہو گئے ہیں۔ ایک وہ جو فرشتوں کے وجود اور ان کے متغیر ہونے دونوں باتوں کے قائل ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے متغیر ہونے کے قائل نہیں۔ سر سید کا خیال ہے:

> ''حکما عقول ہی جن کو انھوں نے تسلیم کیا ہے فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں در کہتے ہیں کہ فرشتے حقیقت موجودہ غیر متغیرہ ہیں اور ان کی حقیقت نفوس نسانی کی حقیقت سے زیادہ ترقوی ہے اور انسان کی بہ نسبت ان کو علم بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ تو آسمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے کہ ہمارے بدن سے ہماری روح اور کچھ بجز استغراق کے ذات باری میں کسی چیز سے علاقہ نہیں رکھتے اور وہی ملائکہ مقربین ہیں اور بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ ان کے سوا دو قسمیں اور ہیں در وہ زمین کے فرشتے ہیں اور دنیا کے امورات کو درست کرتے ہیں۔ جو نیک کام کرنے والے ہیں وہ تو فرشتے ہیں اور جو بد کام کرنے والے ہیں وہ شیطان ہیں۔'' [۳۸]

شیطان کی نسبت سر سید مزید کہتے ہیں کہ ''قیصری شرح'' میں نہایت واضح لفاظ میں وہی بات لکھی ہے جو ہم نے کہی ہے۔ اس کے مطابق انسان کبیر یعنی عالم میں جو قوت وہمیہ کلیہ ہے وہ ابلیس ہے اور ہر ایک انسان میں جو قوت وہمی ہے وہی ابلیس کی ذریت ہے۔ مگر شارح اس کو درست نہیں سمجھتا۔ وہم نہیں بل کہ نفس امارہ ذریات

ابلیس ہے۔ تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ انھی قوئ کو (جو انسان میں ہیں اور جن کو نفسِ امارہ یا قوائے بہیمیہ تعبیر کرتے ہیں) شیطان کہا جاتا ہے۔

''شیطان کا وجود اور انبیا'' میں سر سید نے شیطان کے وجود اور اس کے انبیا پر اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''وما ینزغنک'' کی تفسیر میں مفسرین کو وقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ شیطان کو ایک جدگانہ مخلوق خارج از انسان اور خدا تعالیٰ کا مخالف اور لوگوں کو بدی و نافرمانی کی جانب راغب کرنے والا، بہکانے والا، کفر و شرک میں ڈالنے والا قرار دیتے ہیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ شیطان عام انسانوں کو تو آسانی سے بہکا لیتا ہے جبکہ انبیا علیہ اسلام کو نہیں بہکا سکتا اور اس کا برا اثر ذرا سا بھی انبیا پر نہیں پڑتا۔ تقاضائے بشریت کے مطابق تو شیطان کا اثرِ بد انبیا پر بھی ہونا چاہیے لیکن اللہ نے انبیا کو معصوم عن الخطا بنا دیا ہے اس لیے شیطان کے اثرِ بد سے انبیا محفوظ رہتے ہیں۔

''استویٰ علی العرش سے کیا مراد ہے'' میں سر سید نے ''استوی علی العرش'' کی حقیقت بیان کی ہے اس ضمن میں انھوں نے کئی ایک مفسرین کی تفاسیر کے حوالے دیے ہیں اور اعتراض یہ کیا ہے:

> ''اب میں نہایت ادب سے ان بزرگوں کی خدمت میں جنھوں نے ان آیتوں میں عرش کے لفظ سے سلطنت اور مملکت مراد لی ہے عرض کرتا ہوں کہ جن آیتوں میں صرف لفظ ''رب العرش'' کا یا ''رب العرش العظیم'' کا یا ''ذی العرش'' کا یا رب العرش الکریم'' کا یا ''ذوالعرش المجید'' کا آیا ہے وہاں بھی عرش کے معنی سلطنت و مملکت کے کیوں نہیں لیے جاتے۔ جو ایک چوڑے چکلے تخت موجودگی اخارج کے جس کا بنانا بھی ظاہر بیکار معلوم ہوتا ہے جس پر نہ کبھی خدا بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا اور نہ بیٹھ سکتا ہے، لیے جاتے ہیں۔'' ۳۹

سر سید نے بیان کیا ہے کہ جس شے سے جو چیز ظاہر ہوا سے اس کا حامل کہتے

ہیں۔اللہ کی مخلوق سے جو اس کی سلطنت و بادشاہت ظاہر ہوتی ہے ان پر حاملان عرش کا اطلاق ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب یہ سب چیزیں جو تم دیکھتے ہو برباد ہو جائیں گی تب بھی اللہ کی بادشاہت اس کی اور بے انتہا مخلوقات اٹھائے ہوئے ہوں گی۔وہ مزید کہتے ہیں کہ ''الذین یحملون العرش'' میں ''الذین'' سے اہل ایمان انسان مراد ہیں نہ کہ فرشتے۔یہ وہی لوگ ہیں جو خدا کی سلطنت کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ان میں صلحا و خیار امت شامل ہیں جو پاکیزگی سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں۔ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔اس کے بعد پھر کفار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔قرآن مجید میں اس مقام پر فرشتوں کا پتہ بھی نہیں اور نہ ''الذین'' کے مشار الیہ ہیں۔سر سید نے ''الذین یحملون العرش'' میں ''الذین'' سے اہل ایمان مراد لیے ہیں نہ کہ فرشتے۔''عرش'' سے سلطنت اور مملکت مراد لی ہے اور کہا ہے کہ جس چیز سے جو ظاہر ہوا سے اس کا حامل کہتے ہیں۔اللہ کی مخلوق سے جو اس کی سلطنت و بادشاہت ظاہر ہوتی ہے ان پر حاملانِ عرش کا اطلاق ہوسکتا ہے۔اللہ فرماتا ہے کہ جب یہ سب چیزیں جو تم دیکھتے ہو برباد ہو جائیں گی تب اہلِ ایمان انسان خدا کی سلطنت کو اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

''لفظ سمٰوٰت قرآن مجید میں'' کے زیرِ عنوان سر سید نے لفظ ''سمٰوٰت'' کی توضیح کی ہے۔جس کے مطابق ''سمٰوٰت'' جمع ہے سماء کی اور جس کے معنی اونچے کے ہیں۔یہ لفظ عربی اور عبرانی میں اس زمانے سے بولا جاتا ہے جب کہ یونانی علم ہیئت کا وجود تک نہ تھا۔قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا اطلاق اسی محاورہ میں ہوا ہے۔لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول اور اس کے بعد مسلمانوں میں یونانی علم ہیئت کا بڑا رواج ہوا۔یونانیوں نے آسمان کو ایک جسم شفاف صلب کروی الشکل مقعر و محدب کا محیط زمین کے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں تسلیم کیا تھا۔سر سید کے خیال میں سماء کا اطلاق اس وسعت پر بھی ہوا ہے جو ہر شخص اپنے سر کے اوپر دیکھتا ہے اور اس کی نیلی نیلی چیز پر بھی ہوا ہے جو گنبد کی چھت کے مانند ہر شخص کو اپنے سر کے اوپر دکھائی دیتی

ہے اور ستاروں یا کواکب پر بھی ہوا ہے، بادلوں پر بھی ہوا ہے جو برسات لاتے ہیں۔ چوں کہ یونانیوں نے آسمان کے جو معنی بتائے ہیں وہ قرآن نے کہیں نہیں بتلائے ،اس لیے سرسید ان معنی سے انکار کرتے ہیں اور صرف قرآن کے معانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

''آسمان کے برجوں کا بیان اور رجم شیاطین کی تحقیق'' میں سرسید نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اور مفسرین کی تفاسیر کے حوالے دے کر اہلِ ہیئت کی باتوں کا کسی حد تک انکار کیا ہے لیکن جو ملتی جلتی باتیں ہیں انھیں قبول بھی کیا ہے۔

''حقیقت الرویا (حضرت یوسف شاہ مصر اور دو قیدیوں کے خواب اور ان کی اصلی کیفیت)'' میں سرسید نے خیال ظاہر کیا ہے کہ انسان کے اُمور خارجہ خواب دیکھنے کے لیے موثر ہیں۔ جب تک کہ انسان کا نفس ان ظاہری باتوں سے جن سے حالت بیداری میں مشغول ہوتا ہے ، بے ہوشی یا سو جانے یا استغراق کے باعث بے خبر نہ ہو اس وقت تک خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص ایسا خواب کبھی نہیں دیکھ سکتا جسے اس نے کبھی دیکھا نہ ہو، سنا نہ ہو اور نہ کبھی اس کا خیال ہوا ہو۔ ان باتوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ایسی حالتیں ہر ایک شخص پر گزرتی ہیں اور عالم و جاہل سبھی جانتے ہیں۔

رویا کی پانچ اقسام بیان کی گئی ہیں:

۱۔ بشارت خدا کی طرف سے اور نفس کی خوبیوں یا برائیوں کا نورانی تمثیل ملکی سطح پر۔

۲۔ شیطان کا خوف دلانا۔

۳۔ دل کی باتیں جس طرح کی عادت بیداری کی حالت میں پڑی ہوتی ہے اس کو قوت متخیلہ یاد کر لیتی ہے اور وہ حس مشترک میں آ کر ظاہر ہوتی ہیں۔

۴۔ اخلاط کے غلبہ کی وجہ سے طبعی طور پر خیالات کا آنا۔

۵۔ متنبہ ہونا نفس کا بدنی اذیتوں سے۔[۴۰]

صوفیاے کرام کی مقرر کردہ اصطلاحات کے مجموعے پر ملاء اعلیٰ یا منبر الخیر والجود یا مبداء الاعلیٰ یا حضرت القدس اطلاق ہوتا ہے۔ان اصطلاحات میں تدلیات، لاہوت، جبروت، رحموت اور ناسوت شامل ہیں۔سرسید کا خیال ہے:

"... بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں آدمی باتیں سوچتا ہے اور اپنے دل میں قرار دیتا ہے کہ یہ ہوگا اور وہی ہوتا ہے یا کسی شخص کو یاد کرتا ہے اور وہ شخص آجاتا ہے اور بہت دفعہ اس کے مطابق نہیں ہوتا پس اس کی بیداری کے خیال کے مطابق واقعہ کا ہونا ایک امر اتفاقی ہے۔ سی طرح خوب میں بھی جو باتیں وہ دیکھتا ہے اور وہی ہوتی ہیں جو اس کے دماغ اور خیال میں جمی ہوئی ہوتی ہیں پس ان کے مطابق بھی کوئی واقعہ اسی طرح واقع ہوتا ہے جس طرح کہ بیداری کی حالت میں خیالات کے مطابق واقع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ انبیا اور صلحا کے خواب بہ سبب اس کے کہ ان کے نفس کو تجرد فطری و خلقی یا اکتسابی حاصل ہوتا ہے ان کے خواب بالکل سچے اور اصلی اور مطابق ان کی حالت نفس کے ہوتے ہیں اور ان کے نفس کا تقدس ور متبرک ہونا ثابت ہوتا ہے۔"[۱۲]

"مسئلہ جبر و قدر" میں سرسید ایک آیت مبارکہ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ جبر و اختیار کے مسئلہ پر بحث کرنا قرآن مجید کے بیان کلام کے منافی ہے۔قرآن مجید کی کسی آیت سے نہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے، نہ مختار ہونے پر، نہ بین الجبر والاختیار ہونے پر۔مگر افسوس ہے کہ ایک گروہ انسان کے اپنے افعال میں مجبور ہونے کا قائل ہے، دوسرا گروہ مختار ہونے کا اور تیسرا گروہ بین الجبر والا اختیار کا جو بالفعل مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔اس ضمن میں سرسید رقم طراز ہیں:

"پس سب سے عاحدہ طریقہ اس باریک مسئلہ کے سمجھانے کا یہی تھا کہ تمام افعال کو ان کے تمام واسطوں کو دور کر کے خاص اپنی طرف منسوب

کرے اور کبھی ان واسطوں کی طرف۔ تا کہ لوگ سمجھ میں کہ علۃ العلل صرف ایک ذات وحدہ لاشریک ہے اور جو واسطے ہم کو دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ واسطے ہیں۔ مگر علۃ العلل ان سب کی وہی ایک ذات وحدہ لاشریک ہے۔ پس جس کلام کا یہ موضوع ہو اس سے اس مطلب کو نکالنا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار یا بین الجبر والاختیار اس کلام کو غیر ماوضع لہ میں استعمال کرنا ہے۔ ہاں یہ ایک تمدنی اور طبعی اور عقلی مسئلہ ہے۔''[۴۲]

''مسئلہ متعہ کی تحقیق'' میں سرسید نے علما کے مختلف دلائل کے باوجود متعہ کو ناجائز قرار دیا ہے اور ان علما سے مختلف رائے اس آیت کے حوالے سے قائم کی جس سے بعض علما نے متعہ کی حلت کا جواز نکالا تھا۔

''تعدد ازواج کا مسئلہ'' میں سرسید نے نکاح کو دو افراد کے درمیان معاہدہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو فطرت انسانی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس معاہدے کو مرد توڑ سکتا ہے، مگر چند شرائط پوری کرنے کے بعد۔ عورت طلاق دے نہیں سکتی لیکن اسے خلع کے حق سے محروم نہیں کیا گیا۔ اسلام کی رو سے مرد بعض شرائط پوری کرنے پر بہ یک وقت چار عورتوں کو اپنے عقد میں رکھ سکتا ہے لیکن عورت ایک سے زیادہ مردوں سے بہ یک وقت نکاح نہیں کر سکتی۔ مرد کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ تمام بیویوں کے حقوق کو پورا کرے، ناانصافی نہ کرے۔

''مسئلہ طلاق'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں تین شریعتیں طلاق کے معاملے میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ایک یہودیوں کی جس میں کسی سبب قوی کے بغیر مرد کو طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس پر کوئی گناہ بھی نہیں۔ دوسری بت پرستوں اور موجودہ عہد کے عیسائیوں کی جن میں سوائے زنا کے طلاق جائز نہیں۔ یہ شریعت اس مقدس رسم کا بیشک احترام تو کرتی ہے لیکن یہ بھی یہودی شریعت کی طرح نقص پایا جاتا ہے کیوں کہ یہودی شریعت میں افراط ہے اور ان دونوں شریعتوں میں

تفریط۔ جب کہ شریعت محمدیہ نے طلاق کو ایسی حالت میں جائز قرار دیا ہے جب کہ زن و شوہر میں مرض ناموافقت و عدم محبت اپنی انتہا کو پہنچ کر ناقابل علاج ہو جائے۔ لیکن چوں کہ میاں بیوی کے رشتے میں خرابی کا اندازہ کوئی تیسرا شخص نہیں کر سکتا، اس لیے ان دونوں کو خود اپنا قاضی بنا دیا گیا ہے کہ وہ درست فیصلہ کریں۔

''جہاد کا قرآنی فلسفہ'' میں سرسید نے جہاد کی نوعیت اور فرضیت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ''وقاتلوا فی سبیل اللہ'' اس آیت میں اور اس جیسی آیات میں کافروں یا دشمنوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ مگر صاف صاف حکم دیا گیا ہے کہ ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو۔ اسلام نے دو صورتوں میں تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے:

۱۔ جب کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے۔ نہ کہ کسی ملکی اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔

۲۔ جب کسی ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں ان کے جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی آزادی نہ ہو۔ جو لوگ اس ملک میں بہ طور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا علانیہ یا ضمناً قرار کیا ہو اور گو صرف بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں تب تلوار پکڑنے کی اجازت ہے۔ یہی وہ لڑائی ہے جس کی اسلام نے ترغیب دی ہے۔

سرسید لکھتے ہیں:

> ''یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کے کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ

یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت
نسان کی فطرت کے مخالف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی
مرضی کے برخلاف ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ
ہونا بل کہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔''[۴۳]

لڑائی شروع ہونے کے بعد اس طرح اور یہاں تک لڑنے کا حکم ہے کہ دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے۔

''نفخ صور کی حقیقت'' میں سرسید نے ابتدائی اقتباس میں کئی ایک آیات قرآنی کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تمام آیات قیامت کے حال سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں اس دن کا ذکر ہے جس دن تمام دنیا الٹ پلٹ اور درہم برہم ہو جائے گی۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ صور جمع ہے صورۃ کی اور اس سے مراد مردوں میں روح پھونکنے سے ہے۔ یہ رائے تسلیم نہیں کی جا سکتی کیوں کہ ان آیات میں صور کے لفظ سے وہی آلہ مراد ہے جس کو بھونپو، نرسنگھ، سنکھ، ترئی، قرن، ترم، بگل، کہتے ہیں اور جس کو پھونکنے سے نہایت سخت اور شدید آواز نکلتی ہے۔ سرسید کا خیال ہے:

''.... نفخ صور صرف استعارہ ہے بعث وحشر کا اور تبدل حالت کا جس طرح
شکر میں صور بجنے سے سب مجتمع ہو جاتے ہیں اور لڑنے کو کھڑے ہو جاتے
ہیں اور گروہ در گروہ آموجود ہوتے ہیں اسی طرح بعث وحشر میں ارادۂ اللہ
سے جس طرح کہ اس نے قانون قدرت میں مقرر کیا ہوگا وقت موعود
پر سب لوگ اٹھیں گے اور جمع ہو جاویں گے۔ اس صورت نفخ صور سے
ستعارہ کیا گیا ہے پس اس آیت سے یا قرآن مجید کی اور آیتوں سے یہ
بات کہ فی الواقع کوئی صور بمعنی متعارف موجود ہے یا موجود ہوگی اور فی
الواقع وہ مثل صور متعارفہ کے پھونکنے کے پھونکی جاوے گی اور فی الواقع اس
کو فرشتے لیے ہوں گے اور وہ اس کو پھونکیں گے ثابت نہیں ہے۔''[۴۴]

''معاد کے حالات حقیقت کی روشنی میں'' سر سید نے ''معاذ'' کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ قاضی ابوالولید ابن رشد کے رسائل کے حوالے سے لکھا ہے کہ شرع کا مقصد علم حق اور عمل حق کی تعیم ہے۔ تعلیم کی دو اقسام ہیں:

ا۔ کسی شے کا خیال رکھنا۔

۲۔ اس پر یقین کرنا جس کو اہل علم تصور اور تصدیق سے تعبیر کرتے ہیں۔

تصور کے دو طریقے ہیں:

ا۔ خود اس شے کو تصور کرنا۔

۲۔ اس کی مثال کو تصور کرنا۔

تصدیق کے تین طریقے انسانوں میں رائج ہیں:

ا۔ برہانی معنی دلائل قطعی کے سبب سے یقین کرنا

۲۔ جدلی یعنی مخالفانہ اور مخاصمانہ دلیلوں کے ٹوٹ جانے کے بعد یقین لانا۔

۳۔ خطبی یعنی ایسی باتوں سے جن سے انسان کے دل اور وجدان قلبی کو تسکین ہو جائے اس پر یقین لانا۔[۴۵]

معاد کے مسائل میں ''المسئلۃ اولیٰ: ما الروح ھو جواھر عرض'' میں سر سید نے روح کے وجود کی حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ اس میں دو طرح کے اجسام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک عضوی اور دوسرا غیر عضوی۔ بعد ازاں ان میں فرق واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے اختلافات کے باعث اور وہ اختلافات تعداد میں چھے بیان کیے گئے ہیں۔ مختلف جان داروں کے اجسام، ان کے اعضا اور ان کی ساخت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد سر سید نے روح کی حقیقت بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ روح ایک جوہر ہے۔ اس صورت میں اس کے مادی یا غیر مادی ہونے پر بحث آتی ہے۔ چوں کہ اس کی ماہیت جاننا ناممکن ہے اس لیے اسے مادی یا غیر مادی قرار دینا بھی ناممکن ہے۔

''المسئلۃ الثانیہ: روح الانسان وسایر الحیوانات من جنس واحد'' میں سر سید اس

بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انسان اور حیوانات میں ایک جیسی روح ہوتی ہے۔

''المسئلۃ الثالثۃ: لم یصدر من سایر الحیوانات مایصدر من الانسان ولم احدھما مکلّف والآخر غیر مکلّف'' میں سرسید بیان کرتے ہیں کہ روح سے افعال جسم کی ساخت اور بناوٹ کے مطابق صادر ہوتے ہیں جن سے وہ متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ حیوان نہیں کرسکتے۔ بعض امور ایسے ہیں جنھیں ایک انسان کرسکتا ہے دوسرا نہیں کرسکتا اور جو افعال حیوانات کرسکتے ہیں وہ انسان نہیں کرسکتے۔

''المسئلۃ الرابعہ: ان الروح اکتساب سعادۃ وشقاوۃ'' میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ سرسید کا خیال ہے کہ تعقل اور ارادہ روح کا خاصہ ہے۔ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ مثل ایک حیوان کے ہوتا ہے لیکن اکتساب سے وہ عالم ہو جاتا ہے۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ روح سعادت یا شقاوت کا اکتساب کرتی ہے اور اس کی حالت بمناسبت اس کے جس کا اس نے اکتساب کیا ہے تبدیل ہو جاتی ہے۔

''المسئلۃ الخامسہ ان للانسان موت فما حقیقت الموت وللروح بقاء بعد مفارقۃ الابدان'' میں سرسید نے موت کو برحق جانا ہے۔ موت کیا ہے؟ کیا اجسام سے جدا ہو کر روح کی کوئی بقا ہے؟ ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ اجزائے عنصری کے پریشان ہونے کو موت کہا گیا ہے۔ سرسید نے روح کو ایک جسم لطیف جوہر مستقل بالذات تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ روح کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی اس کی بقا کا تسلیم کرنا بھی لازمی ہے۔

''المسئلۃ السادسہ: ان سلمنا البقاء للروح فما حقیقت البعث او الحشر والنشر'' میں بعث وحشر ونشر کی بحث سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قیامت کے دن کائنات کا حال کیا ہوگا؟ اس سوال کے جواب کے لیے انھوں نے بیس قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے جن سے یہ ثابت ہوا ہے کہ موجودہ کائنات کا وجود مٹ جائے گا۔

حشر اجساد کے حوالے سے سرسید نے پانچ اقوال نقل کیے ہیں:

۱۔ صرف معاد جسمانی کا ثبوت اور یہ اکثر ان متکلفین کا مذہب ہے جو نفس

ناطقہ کا انکار کرتے ہیں۔

۲۔ صرف معاد روحانی کا ثبوت۔ یہ مذہب فلاسفہ الہیین کا ہے۔

۳۔ دونوں کا ثبوت اور یہی اکثر محققوں کا مذہب ہے مثلاً حلمی، غزالی، راغب، ابوزید، الادموسی معمر (جو کہ قدیم معتزلیوں میں سے ہے) اور عموماً متاخرین شیعہ اور اکثر صوفیوں کا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان حقیقت میں صرف نفس ناطقہ کا نام ہے وہی مکلّف ہے اور وہی عاصی اور مطیع ہے اسی پر ثواب عذاب ہوتا ہے اور بدن تو بجائے ایک آلہ کا کام دیتا ہے۔ جسم خراب ہو جاتا ہے پھر بھی نفس باقی رہتا ہے پس جب خدا قیامت کے دن مخلوقات کو اٹھانا چاہے گا تو ہر ایک روح کے لیے ایک مخصوص جسم بنادے گا جس سے روح کا تعلق ویسا ہی ہوگا جیسا کہ دنیا میں تھا۔

۴۔ ان دونوں میں سے کسی کا ثبوت نہیں فلاسفہ طبیعین میں سے قدما کا یہی مذہب ہے۔

۵۔ بالکل سکوت اختیار کرنا یہ مذہب جالینوس سے منقول ہے۔ اس کا قول ہے کہ مجھ کو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نفس آیا مزاج ہے تو موت کے وقت معدوم ہو جاوے گا تو اس کا اعادہ ناممکن ہوگا یا وہ ایک جوہر ہے جو بدن کے خراب ہونے پر باقی رہتا ہے اس حالت میں معاد بھی ممکن ہوگی۔[۶۳]

سر سید تیسرے قول سے متفق ہیں۔

مضمون ''بہشت کی ماہیت'' میں سر سید نے بہشت کی ماہیت اور حقیقت کو واضح کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن مجید میں بے مثل چیز اس کا طرز بیان ہے جو ہر مذاق اور دماغ کے موافق ہے اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجے پانے میں برابر ہیں ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ وعدہ وعید دوزخ و بہشت کے جن الفاظ میں بیان ہوئے ہیں ان سے بعینہٖ وہی اشیا مقصود نہیں بل کہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی اور راحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہے۔ اس خیال سے اس

کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی جنت نعیم کی اور ایک ترغیب امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے اور ایک کوڑھ مغز ملایا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوب صورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیئیں گے، میوے کھائیں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہائیں گے اور جو دل چاہے گا وہ مزے اڑائیں گے اور اس لغو بے ہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجے پر پہلے پہنچا تھا اسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور ''کافہ انام'' کی تربیت کا کام بہ خوبی مکمل ہو جاتا ہے۔

دوسرے باب ''مضامین متعلق بہ استفسارات'' کے عنوان کے تحت ''اخباروں کے اعتراضات اور ان کے جوابات'' (اقتباسات از رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۷ بابت ۱۲۹۳ھ)'' جیسے مضمون میں چھے اخبارات میں اٹھائے گئے سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔

''سوال: خدا نے تمام کائنات کیوں اور کس مقصد سے پیدا کی؟ (سوال از دیوان سر شیر محمد خاں والی پالن پور گجرات)'' کے جواب میں سرسید نے ایک کمھار کی مثال دی ہے اور کہا ہے کہ جس نے مٹی سے کھلونے بنائے ہیں۔ کسی کو ہاتھی بنایا ہے، کسی کو گھوڑا، کسی کو شیر، کسی کو بکری، کسی کو بلی اور کسی کو چوہا، کسی کو لنگڑا، کسی کو لولا۔ تو کیا مٹی اس سے سوال کر سکتی ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تو انسان کی کیا مجال کہ خدا کی نسبت یہ سوال کرے۔ مگر انھوں نے جواب پھر بھی دیا کہ مسلمانوں کو اسی طرح عبادت کرنی چاہیے جیسا کہ خدا نے عبادت کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی غیر مذہب والا جو قرآن کو نہیں مانتا، اس کی وجہ دریافت کرے تو اس کا عقلاً بخوبی جواب دیا جا سکتا ہے کہ انسان کی نیچر جسے خدا نے پیدا کیا ہے، اسی کا تقاضا ہے۔

''وحی والہام کے متعلق ایک صاحب کے خیالات اور ان پر سرسید کا تبصرہ (تہذیب الاخلاق، بابت ماہ صفر اور ربیع الاول ۱۲۹۷ھ)'' میں سرسید نے مکتوب نگار کا نام ظاہر کیے بغیر اس کے نفس مضمون کا جواب دیا ہے۔ وہ خط چھے صفحات

پر مشتمل تھا لیکن سر سید نے اس کا چودہ صفحات پر مشتمل تسلی بخش جواب تحریر کیا ہے۔ یہ جواب انھی امور کا احاطہ کرتا ہے جن امور کا پچھلے صفحات پر ذکر کیا جا چکا ہے۔

''ترکوں کے متعلق مضامین'' کے عنوان کے تحت لکھے گئے مضمون 'ترک (تہذیب الاخلاق بابت ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ)'' میں سر سید نے اسلام کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد مسٹر جان رینل موریل اس تاریخ کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے ترکوں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

۱۔ ماں اور لڑکوں کی محبت جس میں ماں کی شفقت اور لڑکوں کا ادب یہ دونوں باتیں طرفین کی طرف سے نہایت مستحکم اور لازوال ہوتی ہیں اسی کے ذریعے عورتوں کو وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جو فرنگستان میں نہیں ہے۔

۲۔ عورت کو خانہ داری میں بالکل اختیار رہتا ہے۔

۳۔ کثرت ازدواج ترکوں میں اس قدر زیادہ اور عام نہیں ہے جیسا کہ لوگ عموماً تصور کرتے ہیں۔

۴۔ اسلام عورتوں کی طرف نہایت رحم دل ہے۔ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ جو کوئی نیک کام کرتا ہے مرد ہو یا عورت بہشت میں جائے گا۔

۵۔ مس پارڈہ ۱۸۳۸ء میں ترکی میں تھیں اور ترکوں کے زنانہ میں جایا کرتی تھیں ترکوں کے گھر کے چال چلن سے خوش تھیں اور ترکوں کی عورتوں کی نیکی اور پارسائی کی تصدیق کرتی ہیں۔

بعد ازاں سر سید نے مسٹر سی ہوایٹ، مسٹر جان کارنی کے بیانات بھی قلم بند کیے ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان کے شریف خاندان کی عورتوں کے اخلاق و عادات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور انھیں بھی ترک عورتوں کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہندو معاشرے میں رہتے ہوئے ان عورتوں کے کردار کو بہت زیادہ سراہا بھی ہے اور کہا ہے:

''جو جو مصیبتیں ہماری یاد میں ہندوستان کی مسلمان عورتوں پر اتفاقات زمانہ

سے پڑیں اور جس صبر وشکر وقناعت اور استقلال اور خدا پر بھروسہ رکھنے میں
نھوں نے اس کو سہا حقیقت میں دنیا کی عجائبات میں سے ہے۔ ہماری
رائے میں اسلام کی عزت جس قدر کہ ہندوستان میں رکھی ہے صرف
مسلمان عورتوں نے رکھی ہے اور جب اس کیساتھ کافر مسلمان مردوں کا
چال چلن جوان کے ساتھ خیال کیا جاوے تو عورتوں کی نیکی ایسے درجہ پر پہنچ
جاتی ہے جو حد بیان سے خارج ہے۔''[۴۷]

''یونانی اور ترک (آخری مضامین سرسید صفحہ ۴۹)'' میں سرسید نے یونانیوں پر ترکوں کی فتح کو اسلام کی فتح نہیں بل کہ ترکوں کی فتح قرار دیا ہے کیوں کہ انھوں نے یہ فتح عیسائیوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر حاصل کی تھی۔ ان کے خیال میں یہ فتح، اسلام کی فتح تبھی کہا سکتی تھی جب یہ فتح ترکوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنے زور بازو سے حاصل کی ہوتی۔

تیسرے باب ''ذکر ترکی یعنی روم کی مجلسوں کا (تہذیب الاخلاق، جلد اول نمبر ۲ بابت ۱۵ شوال ۱۲۸۷ھ)'' میں سرسید نے مسٹر ولیم ہورڈ رسل صاحب کے روزنامچہ میں سے تھوڑا سا حال پرنس آف ویلز اور پرنس آف ویلز کے روم میں جانے اور سلطان روم سے ملاقاتوں کا لکھا ہے۔ یہ دونوں خاندان ۱۸۶۸ء میں دارالسلطنت قسطنطنیہ گئے اور سلطان عبدالعزیز خاں کے ہاں مہمان رہے۔ دوسرا جلسہ برٹش ایمباسڈر یعنی سفیر انگلستان کے ہاں ہوا جو روم میں رہتا تھا۔ اس نے پرنس اور پرنسس آف ویلز کے لیے برٹش امباسی میں بہت عالی شان شاہانہ بال دینا چاہا جس میں سلطان عبدالعزیز خاں نے بھی شرکت کی۔ بعدازاں سلطان کا لندن آنا، ملکہ معظّمہ سے ملنا، ولی عہد انگلستان اور ولی عہد کی بیگم کا وہاں جانا نہایت عمدہ تاریخی واقعات سے ہیں۔ ور روم وانگلستان یا ایک مسلمان اور عیسائی ریاست میں محبت اور دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جب سلطان لندن تشریف لائے تھے اور انڈیا آفس میں دعوت ہوئی تھی تو اس بڑے ہال کو بہ طور یادگار محبت اور دوستی عیسائی اور مسلمان سلطنت

کے نقش کریسنٹ اور کراس کا ملا کر کھودا گیا تھا۔

''ترکوں کی تہذیب (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ ۱۷ مارچ ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے ترکوں اور ان کی بہترین تہذیب کو مختلف حوالے دے کر بیان کیا ہے۔ ترکوں کی تہذیب کا نمایاں پہلو سر سید کو نہایت عمدہ لگا ہے وہ ہے ترکوں میں ادب واحترام کا پایا جانا اور وہ بھی خاص طور پر سلطان کا اپنی والدہ کی تعظیم کے لیے:

> ''سلطان روم نہایت مہذب حالت میں ہیں اور وہ اپنی والدہ کی تعظیم ایسی کرتے ہیں کہ اس کی کچھ حد نہیں ہے یہاں تک کہ جس وقت وہ ان کو بیٹھنے کی اجازت نہ دیں اس وقت تک بیٹھ نہیں سکتے اور ان کی مرضی کے خلاف کچھ کام نہیں کر سکتے۔'' ۴۸

مضمون ''سلطان روم اور ہندوستان کے مسلمان'' میں سر سید نے ایک تار کا ذکر کیا ہے جس میں مسلمانان شملہ کی طرف سے بھیجے گئے تہنیت کے خط جو یونان کی فتح پر سلطان کو بھیجا گیا تھا، کا جواب ایک تار کی صورت میں سلطان ترکی کی جانب سے مسلمانان ہند کو بھیجا گیا لیکن سر سید اس کی صحت کو تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مضمون ''ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی'' میں سر سید نے ہندوستان کے مسمانوں کو ترکوں کا ہمدرد تو شمار کیا ہے لیکن جنگ کریمیا میں انگلستان اور فرانس کی جانب سے ترکی کی مدد کرنے پر انگریز حکومت کا شکریہ ادا نہ کرنے پر اپنی برہمی کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک انگریز کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ ہندوستان کے مسمان بڑے احسان فراموش ہیں کیوں کہ جس زمانہ میں انگریزوں نے ترکوں کی مدد کی تھی۔ اسی کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف غدر کیا۔

''سلطان روم بھی ہندوستان کے مقدسوں کے نزدیک بحکم حدیث ''من تشبہ بقوم فھو منھم'' کافر نکلے (تہذیب الاخلاق، جلد ۷ نمبر ۱، بابت یکم شوال ۱۲۹۳ھ، صفحہ ۴)''

میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ ترک سلطان نے ۱۸۶۷ء میں پیرس کی ایک نمائش گاہ میں چوں کہ مغربی تہذیب کو نہ صرف پسند کیا بل کہ اسے اپنا بھی لیا ہے تو سلطان بھی ہندوستان کی مقدس ہستیوں کے نزدیک کافر ہو گئے۔

''ترکی کا شیخ الاسلام (تہذیب الاخلاق، جلد ہفتم بابت شعبان ۱۲۹۴ھ)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ ترکی میں ایسے اسباب موجود تھے جن کے باعث ترکی کے شیخ الاسلام گویا تمام امور کلی و جزوی سلطنت میں ایسے اختیارات حاصل تھے جن سے ایک گونہ مداخلت ہو جاتی ہے مثلاً جب وزیروں نے سلطان عبدالعزیز یا سلطان مراد کو معزول کرنا مناسب سمجھا تو اس میں شیخ الاسلام کا اتفاق ضروری تھا اس لیے اس سے ایک فتویٰ لیا گیا کہ سلطان عبدالعزیز یا سلطان مراد لائق بادشاہت نہیں رہا اس کا عزم کرنا احکام شریعت کے موافق درست ہے جب دوسرا بادشاہ اس کی جگہ قائم کیا گیا تو شیخ الاسلام سے اس کا استحقاق بادشاہت تسلیم کرانا ہوا۔ مسلمانوں کا یہ ماننا ہے کہ شیخ الاسلام کو اس طرح کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔

''ترکی کی حالت (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۲ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے سلطان عبدالعزیز خاں اور سلطان مراد کے معزول ہونے کے بعد ترکی کی حالت پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے وزرائے سلطنت سے بعض سوالات کیے ہیں کہ کیا سلطان عبدالعزیز خاں میں سلطان عبدالحمید خاں جیسے کوئی ایک صلاحیت بھی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر انھیں سلطان کے عہدے پر بحال رکھا جاتا۔ کیا درحقیقت یہ لڑکوں کا سا کھیل کچھ سلطنت کی شوکت میں مخل تو نہیں؟

''ملکِ یمین (تہذیب الاخلاق، جلد ہفتم بابت ماہ شعبان ۱۲۹۴ھ)'' میں سرسید نے بڑے دکھ اور رنج سے بیان کیا ہے کہ روم اور روس کی لڑائی میں روسیوں اور بلگیر یا والوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہیں۔ سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو پکڑ کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا۔ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ جن عورتوں کی گود میں شیر خوار بچے تھے ان کو بھی قتل کیا اور ان کے شیر خوار بچوں کو زندہ ان

ہی لاشوں میں ڈال دیا کہ رو رو کر، چلا چلا کر اور جانوروں کے پنجوں سے زخمی ہو کر سسک سسک کر مر گئے۔ سب سے زیادہ رنج، غصہ، غیرت اور کاہش طبع جو مسلمانوں کو ہے وہ روسیوں اور بلگیریا والوں کی اس نالائق حرکت سے ہے، جوانھوں نے کنواری لڑکیوں، بیاہی عورتوں اور بڈھی بیواؤں سے بہ طور ملک یمین کے کیا۔ کافروں نے بھی اسے ناپسند کیا اور چند عیسائی سلطنتوں نے ان مظالم کی بابت روسیوں سے کیفیت طلب کی ہے لیکن سر سید کو خوف ہے کہ کہیں نور الآفاق کا وہ پرچہ جس میں مولوی محمد علی صاحب نے ہمارے رسالہ تبریۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام کا جواب تحریر کیا ہے اور اس میں انھوں نے ایسی حرکات کو مذہب اسلام میں جائز قرار دیا ہے۔ گر یہ رسالہ روسیوں کے ہاتھ لگ گیا اور اسے اپنی جرأت کی دلیل میں پیش کر دیا اور جواب دیا کہ یہ باتیں کچھ وحشیانہ پن کی نہیں ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ ہم نے کیا ہے وہ اپنے مذہب کی رو سے اور اپنے خدا کے حکم کے بموجب دوسرے لوگوں کے ساتھ کرنی جائز سمجھتے ہیں اور نعوذ باللہ اپنے بزرگوں کی نسبت ان افعال کو منسوب کرتے ہیں۔ پھر ہم ان افعال کے کیوں مجرم ہیں؟ ہاں عورتوں اور بچوں کے قتل کا گناہ ہم پر ہے مگر تصرف علیٰ ملک الیمین کی نسبت جواب پوچھنا بجا ہے تو کیا ہوگا؟

''روس اور ترک (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۲ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے روس اور ترکی کے درمیان ہولناک جنگ کے قوی امکان کا اظہار کیا ہے کیوں کہ یہ لڑائی کسی صورت ٹلتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس صورت میں شہزادہ بسمارک کے غیر جانب دار رہنے کا سر سید کو شک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شہزادہ شاید ہوا کا رخ دیکھ رہا ہے اور وقت ضرورت جنگ میں کود پڑے گا۔

''انگلستان، روس اور ٹرکی کا معاملہ (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۲ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید روس اور ترکی کی جنگ میں انگلستان کو ترکی کا اتحادی دیکھنے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔

''ترکوں کے یتیموں اور زخمیوں کے لیے چندہ (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ،

۲۲ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے چندہ جمع کرنے پر انگریز سرکار کی جانب سے لگائی گئی پابندیوں پر انگشت بدنداں دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ انگریز سرکار کی جانب سے ایسے رویے کی سرسید کو توقع نہیں تھی۔

''چندہ یتیمان و بیوگان و زخمیان (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۷ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں خاص طور پر مدراس، بمبئی، کلکتہ اور دیگر کئی ایک مقامات میں جمع ہونے والے چندہ پر اپنی خوشی اور اطمینان کا ظہار کیا ہے۔ انھیں اس بات پر اور زیادہ خوشی ہے کہ اس کارِ خیر میں سنی اور شیعہ دونوں فرقے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

چوتھے باب ''مضامین متعلق حالات حاضرہ'' کے زیر عنوان مضمون ''دہلی کا دربار اور اس کا خرچ (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید دہلی تمام محکموں کے اخراجات کی تخفیف اور اس کے اسباب پر شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ انھیں گمان غالب ہے کہ یہ زیادتی صرف اور صرف ہندوستان کے عوام کے ساتھ کی جا رہی ہے کیوں کہ وجہ جو بھی ہو یہ تخفیف درست نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہندوستان نے تمام محکموں میں تخفیف کا حکم دیا ہے تو ہمارے دل میں یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ آج کل خزانہ میں کمی ہے اور وہ ضرورتیں پیش ہیں جن کو خزانہ اپنی کمی کے سبب برداشت نہیں کر سکتا اور ہم یقین کرتے ہیں کہ جو ارا کین تخفیف کی رائے دینے والے ہیں وہ بھی اپنی رائے کے واسطے بجز اس کے اور کچھ وجہ نہ ظاہر کریں گے کہ خزانہ کم اور ضرورت زائد تھی۔ اس سبب سے تخفیف کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن بحسب ظاہر جو لوگ اس وجہ کو ضعیف خیال کرتے ہیں وہ دربار دہلی کے صرف کو دیکھ کر تخفیف کی اس وجہ کو بالکل ناواجب کہتے ہیں اور وہ بہت حیرت میں ہیں کہ دربار دہلی پچھتر لاکھ روپیہ صرف کرے گا اور گورنمنٹ تین چار ہی لاکھ کی تخفیف کی خواہاں ہے۔''[۴۹]

''رہائی (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، یکم دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ ملکہ معظمہ کے خط شہنشاہی قبول کرنے کی خوشی میں ہندوستانی جیلوں سے قیدی رہا کر دیے جائیں گے۔ ان قیدیوں میں قیدی عورتیں بھی ہوں گی جن کی رہائی ممکن ہوگی۔

''قاتل تحصیل دار فتح آباد (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۹ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے فتح آباد کے تحصیلدار کے قاتل کو صرف پانچ سال کی سزا ہونے کو درست خیال نہیں کیا کیوں کہ ایسے ہی ایک اقدام پر ریڈر صاحب کا قاتل رہ نہ ہو سکا۔ اس لیے سر سید کی خواہش ہے کہ قانون اشتعال طبع ضرور محدود ہونا چاہیے نہ اس واسطے کہ وہ خاص یورپین کے واسطے یہ بندوبست چاہتے ہیں بل کہ وہ ہمیشہ جان کے معاملے کو نہایت نازک اور اہم خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قانونی حیلہ سے قاتل کا صاف رہا ہو جانا ضرور یہ جرم قتل کو زیادہ کرے گا اور اس کا روک پانا ممکن نہیں رہے گا کیوں کہ ہر قتل کے ساتھ یہی وجہ پیش کی جانے لگے گی اور قاتل آزاد گھومتے پھریں گے۔

''قابل نفرت حرکت (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ دسمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے ایک قابل نفرت حرکت کی مذمت کی ہے کہ راولپنڈی میں ایک سپاہی نے عین قواعد کے وقت اپنے افسر کے صرف اس قدر ملامت کرنے پر کہ اس سپاہی کا نشانہ آفریدیوں کے مقابلے میں کچھ مفید نہ ہوگا، افسر کو گولی سے ہلاک کر دیا۔

''شاہجہان پور کا واقعہ (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء)'' میں سر سید نے ایک واقعے کی مذمت کی ہے جس میں ایک یورپین نے تین ہندوستانیوں کو صرف اس لیے گولی مار کر ہلاک کر دیا کیوں کہ اس کے بیان کے مطابق ۱۸۵۷ء میں کان پور کے مقام پر غدر میں مظلوم یورپین کے قتل کی یادگار کو دیکھ لیا تھا اس وقت سے اسے ہندوستانیوں سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ سر سید نے رائے ظاہر کی کہ کان پور کی یادگار کی طرح کی دیگر یادگاروں کو دور کر دیا جائے۔

''قانون معیاد نکاح (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے بعض لوگوں کی یہ رائے ان کی نظروں کے سامنے سے گزری ہے کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ وہ ہندوستانیوں کو صغیر سنی میں بچوں کے نکاح سے روک دے اور نکاح کے لیے ایک خاص حد عمر متعین کر دے تاکہ اس کے سبب سے ہندوستانی ان خرابیوں سے محفوظ رہیں جو صغیر سنی میں بچوں کے نکاح سے پیدا ہوتی ہیں۔ سرسید اسے بچی قومی ہمدردی پر محمول کرتے ہیں لیکن انھیں یہ امید نہیں کہ یہ رائے کسی کے لیے قابل قبول ہوگی۔

''بچہ کشی کی عجیب واردات (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۲ مئی ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ ایک پارسی خاتون جو دو برس سے بیوہ تھی اس نے ناجائز بچہ جن کر اسے عجیب جرأت سے قتل کرایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عورت مذکورہ نے بچہ جنا اور ایک عورت کی صلاح لے کر اپنے باورچی سے کہا کہ وہ اسے ذبح کر ڈالے۔ باورچی نے نہایت بے رحمی سے اس بچے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور علانیہ یہ جرم کیا گیا جس پر سرسید نے صرف اس لیے افسوس کا اظہار نہیں کیا کہ ایک نفس انسانی ضائع ہوا بلکہ ایک یوریشین صاحب کا بچہ ضائع ہو گیا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو کتنا لائق اور ذہین ہوتا۔

''ہندوستانیوں کا خون (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ مئی ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ آئے دن خبریں ملتی رہتی ہیں کہ فلاں ہندوستانی فلاں صاحب کے ہاتھوں مارا گیا۔ حال آں کہ لارڈ لٹن کی تنبیہ جو اس نے مسٹر فلر کے مقدمہ میں کی تھی، کے نتیجے میں اس طرح کے واقعات ختم ہو جانے چاہیے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

''زمانے کی ترقی کے آثار (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۴ مارچ ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے اس بات کو خوش آئند قرار دیا ہے کہ ہندوستان میں تعصب آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے جو ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا

تھا اور ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث بھی تھا۔
''اودھ اخبار اور منشی غلام محمد خاں (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۹ ستمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے منشی غلام محمد خاں اودھ خبار کے ایڈیٹر کی کاوشات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اخباروں کے مالکان اپنے ایڈیٹروں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہی اخبار زندہ رہے گا جو اپنے ایڈیٹروں کی قدر کرے گا۔
''صاحب بہادر کی چوری (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے صیغی کارسپانڈنٹ میں ایک خبر ڈیڑھ دون کی چھاپی جس میں سیل صاحب بہادر چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے اور زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ ہوا تو اعتراف جرم کرنے کے بعد تیسرے دن مر گئے۔ مقدمہ عدالت فوجداری میں چلا تو جج نے غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انصاف کے پیش نظر فیصلہ کیا۔ یورپین اور ہندوستانی کا تعصب اس میں دکھائی نہیں دیتا۔
''الٹا چور کوتو.ل کو ڈانٹے (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے ایک ایسے مقدمے کا ذکر کیا ہے جس میں ایک یورپین نے چالیس ہزار روپے ہرجانے کا دعوی کیا اور سولہ ہزار روپے بہ طور ہرجانہ کے وصول بھی کر لیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پونا کی حدود میونسپلٹی کے اندر ایک سڑک کے کنارے اینٹوں کی سرخی کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ صاحب بہادر بگھی دوڑاتے ہوئے اس طرف سے نکلے تو بگھی کا پہیہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ گیا اور صاحب بہادر گرنے سے اپنا ایک پاؤں تڑوا بیٹھے اور میونسپل کمیٹی پر نالش کر کے سولہ ہزار روپے کی ڈگری کرالی۔
''کلکتہ میں ایک صاحب کا بھنگی سے مقدمہ'' (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ کلکتہ میں ایک بھنگی کی اپنے صاحب (مسٹر بروز صاحب باکن کرو کوڈلین) سے تکرار ہوئی تو صاحب نے اس پر نالش کر دی

لیکن مقدمہ خارج ہوگیا۔صاحب کے بیان کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ صاحب بہادر نے بھنگی کو برتن دھونے کا حکم دیا تو بھنگی نے اس پر حملہ کر دیا۔ایک ملازم کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ جس کام کے لیے مامور ہے وہی کام نہ کرے اور صاحب پر حملہ کر دے۔سر سید کا خیال ہے کہ عین ممکن ہے صاحب نے خفیف قصور پر بھنگی کو بہت سخت پکڑا ہوگا اور مار پیٹ کی ہوگی تو بھنگی نے لاچار ہوکر اور مسٹر فلر کے سائیس کو یاد کر کے یہ خیال کیا ہوگا کہ اگر میں بیٹھا رہا تو بے کار میں جان جائے گی اس لیے اس نے اپنی جان بچانے کے لیے گستاخی کی ہوگی۔

''صاحبان یورپ کا دیسی زبان میں امتحان (اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، ۵ نومبر ۱۸۷۵ء)''میں سر سید نے عدالتی نظام کی ایک خرابی کا ذکر کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں صاحب اخبار ''انڈین پبلک اوپینین'' کے رائے سے متفق ہوں کہ جتنے بھی انگریز عہدے دار ہیں انھیں دیسی زبان کا مکمل طور پر ادراک ہونا چاہیے۔اگر وہ مقامی زبان نہیں جانتے تو وہ جاٹ یا میو سے کیسے گفتگو کریں گے؟اگر عدالت میں جج تعینات ہیں تو جب تک مغیث کی زبان کو نہیں سمجھیں گے تو کیسے انصاف کے تقاضوں کو پورا کریں گے؟لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان انگریز عہدے داروں کا دیسی زبان میں کڑے سے کڑا امتحان لیا جائے تاکہ وہ معاملہ کرتے ہوئے کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں۔

''ترمیم احکام شریعت (''تہذیب الاخلاق'' یکم رجب ۱۲۹۳ھ)''میں سر سید بیان ہوا ہے کہ سر سید کو اودھ اخبار ۲ جولائی ۱۸۷۶ء دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ امام اعظم جناب حضرت مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس مدرسہ عربی دیو بند احکام شریعت میں ترمیم کے خواہاں ہیں۔شریعت کے مطابق مہر کی غیر معینہ حد اور ناکح اور منکوحہ کی رضامندی کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ انگریز حکام تمام ذاتوں کی حیثیت کے مطابق مہر مقرر کر دے۔لیکن یہ امر سر سید کو سخت ناپسند ہے،اس لیے وہ تحریر کرتے ہیں:

''سمجھتے ہیں کہ جو حکم شریعتِ محمدی کا ہے تو نہایت عمدہ ہے۔اس میں تو کچھ

قوم کی حاجت نہیں اور نہ کوئی نقصان اور آفت اس میں ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ شریعت کی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔ ان کو بہت سی جوروواں گھیر لینے اور پرانی کو طلاق اور نئی سے نیا نکاح کر لیتے ہیں بہت آسانی ہو جائے گی اور ٹھیک یہ مثل صادق آجاوے گی کہ: کل جدید لذیذ''۵۰

''نئی تہذیب 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۲ جون ۱۸۸۳ء)'' میں سرسید نے بیان کیا ہے کہ نئی تہذیب سے نفرت کے باعث اسے کڑی تنقید اور شدید طنز کا سامنا ہے۔ ہماری قوم میں سے جس نے نئی تہذیب میں قدم رکھا ہے، ہم نے کوئی درجہ لعنت وملامت، تشنیع اور اتہام اور مسخرا پن کا ان کی نسبت باقی نہیں چھوڑا۔ جو کچھ چاہا، کہا اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے فرماں رواؤں کو ہماری قوم سے زیادہ اور کوئی نہیں کھٹکتا اس لیے وہ ہماری قوم کے پرانے فیشن کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے سرسید نے تحریر کیا ہے:

''بمبئی کے کشف الاخبار نے تہذیب مروجہ کے عنوان سے ایک آرٹیکل شاید مزاحاً نئی تہذیب پر لکھا ہے بے شک نئی تہذیب پر جو کچھ الزام لگایا جاوے اور نئی تہذیب والوں کی جو ہنسی اڑائی جاوے سب آسان ہے۔ ہم بھی اس بات سے متفق ہیں کہ نئی تہذیب اختیار کرنا بے وقوفی کا کام ہے اور اپنے تئیں نہایت مشکلات میں پھنسانا ہے۔ نئی تہذیب اختیار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو اختیار کرنا چاہتے ہیں آپ کو صدہا مشکلات میں پھنساتے ہیں۔ اس زمانہ میں نئی تہذیب اختیار کرنا نہایت دل گردے والے شخص کا کام ہے جو اس کے اختیار کرنے سے پہلے اپنے آپ کو صدہا بلاؤں و مشکلات و طعن تشنیع کا نشانہ بنا لے۔ اس وقت ہم کو ہندوستان میں دو فریق سے کام پڑا ہے۔ ایک خود ہماری قوم دوسری وہ قوم جو ہم پر فرماں روا ہے۔''۵۱

''ضمیمہ: واقعۂ معراج کی حقیقت واصیت'' کے تحت سرسید نے اس کے ذیلی عنوانات زمانۂ معراج، اقوال ان علما کے جواسراء اور معراج کو دو جداگانہ واقعے سمجھتے ہیں، اقوال ان علما کے جو کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صرف اسراء ہوئی اور ایک دفعہ اسراء مع معراج کے، اقوال ان علما کے جو کہتے ہیں کہ معراج دو دفعہ ہوئی ایک دفعہ بغیر اسراء کے اور ایک دفعہ معہ اسراء کے، اقوال ان علما کے جو اسراء کا مع معراج کے دو دفعہ ہونا بیان کرتے ہیں، اقوال ان علما کے جو اسراء اور معراج دونوں کا ایک رات میں ہونا تسلیم کرتے ہیں، احادیث بخاری، احادیث مسلم، احادیث ترمذی، احادیث نسائی، حدیث ابن ماجہ، اختلاف جو ان حدیثوں میں ہے: ا۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ جب معراج شروع ہوئی تو آپ ﷺ کہاں تھے ۲۔ جبریل تنہا آئے تھے یا اور بھی ان کے ساتھ تھے ۳۔ اس وقت آپ سوتے تھے اور آخیر تک سوتے رہے یا جاگتے تھے ۴۔ شق صدر اور اس میں اختلافات ۵۔ براق کا ذکر کن حدیثوں میں ہے کن میں نہیں ۶۔ آپ براق پر سوار ہو کر گئے یا کس طرح، ۷۔ بیت المقدس میں براق کے باندھنے کا اختلاف ۸۔ بیت المقدس پہنچنے سے پہلے کہاں کہاں تشریف لے گئے اور کیا کیا کیا؟ ۹۔ اختلافات مقامات انبیا آسمانوں پر جن سے ملاقات ہوئی، ا۔ ادریس ۲۔ ہارون ۳۔ موسیٰ ۴۔ ابراہیم حلیۂ موسیٰ، حلیۂ عیسیٰ ۵۔ ذریات آدم و بکاءِ آدم، بکاءِ موسیٰ ۱۰۔ تخفیف نمازوں میں، اختلافات نسبت سدرۃ المنتہیٰ و بیت المعمور، الوان سدرۃ المنتہیٰ اور آپ ﷺ کا سجدہ کرنا ۱۳۔ سدرۃ المنتہیٰ کی نہریں ۱۴۔ شراب اور دودھ ۱۵۔ جنت میں داخل ہونا ۱۶۔ کوثر ۱۷۔ سماعتِ صریف الاقلام ۱۸۔ آسمانوں پر جانا بذریعہ معراج کے، اختلافاتِ حدیث کا نتیجہ، صورتِ اول یعنی معراج بجسدہ ابتدا سے انتہا تک بحالت بیداری، تفسیر سورۃ والنجم، صورت دوم یعنی اسراء کا مکہ سے بیت المقدس تک بجسدہ و بحالت بیداری ہونا اور معراج کا اس کے بعد بیت المقدس سے آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک بروحہ ہونا، تصریح پہلی دلیل کی، تصریح دوسری دلیل کی، تصریح تیسری دلیل کی، تصریح چوتھی دلیل کی، تصریح پانچویں دلیل کی، نقل اور عقل

میں مخالفت، قول ابن تیمیہ، قول ابن رشد، شق صدر عند حلیمۃ فی بنی الیث، شق صدرہ فی غار حرا، شق صدر وھو ابن عشر، شق صدرہ مرۃ خامسۃ ۱۔ اختلاف اس بات میں کہ کتنے شخص یا فرشتے شق صدر کے لیے آئے ۲۔ جو چیزیں کہ ان شخصوں کے پاس تھیں ان میں اختلاف ۳۔ اختلاف آنحضرت کے زمین پر لٹانے کی نسبت، ۴۔ اختلاف نسبت شق صدر و غسلِ قلب وغیرہ، ۵۔ اختلاف درباب اطلاع واقعات بہ حلیمہ ۶۔ اختلاف نسبت صحت واقعہ شقِ صدر کے، جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مجموعی طور مقالاتِ سرسید ایک عمدہ کاوش ہے۔ اس جلد میں سرسید کے مذہبی افکار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہ مقالات تدوین کی عمدہ مثال ہیں۔

سرسید کی اسلامی بصیرت (تصانیفِ سرسید سے ایک نیا انتخاب) (۱۹۸۷ء) از پروفیسر جمال خواجہ

سرسید کی اسلامی بصیرت (تصانیفِ سرسید سے ایک نیا انتخاب) پروفیسر جمال خواجہ، شعبۂ فلسفہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، کی تالیف ہے جو ۱۹۸۷ء کو نیو علی گڑھ موومنٹ، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف کا خاصا یہ ہے کہ مصنف نے سرسید کے حالات زندگی کو موضوع بحث بنانے کے ساتھ ساتھ جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان تمام کی مثالیں سرسید کی عملی زندگی سے پیش کی ہیں، خواہ وہ مذہبی موضوع ہو، سیاسی ہو یا معاشرتی۔ سرسید نے علم حدیث اور فقہ کے حصول میں کن کن کا معاملات سے کام لیا ان کی اپنی تحریروں سے اقتباسات مصنف نے پیش کیے ہیں اس حوالے سے جو موضوعات سیر سید کے سوانح سے منقول ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے انتساب ان نوجوانوں کے نام منسوب کیا گیا ہے جو آندھیوں میں بھی نئے ذہنوں کے لیے تلاشِ حق کا چراغ روشن کیے ہیں اور اکیسویں صدی کو راہ دکھا سکتے ہیں۔ تفصیلات میں سرسید اور ان کی تصانیف کا تعارف، نیو علی گڑھ موومنٹ (علی گڑھ، تعارف): اغراض و

مقاصد، بانی ممبران، نیو علی گڑھ موومنٹ: یک تعارف، اظہارِ تشکر (جمال خواجہ کے اپنے الفاظ میں)، سرسید کی اہم کتب کا تعارف اور ان کا تنقیدی جائزہ، ''تصانیفِ سرسید سے انتخاب'' میں حصہ اول: بدلتی ہوئی دنیا میں مذہب کی معنویت (۱۔طبقات علوم الدین، ۲۔زمانے کا اثر مذہب پر، ۳۔مذہبی خیال، ۴۔مشرقی علوم وفنون)، حصہ دوم: وحی اور رسالت کی حقیقت (۵۔وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت، ۶۔نبوت ایک امر فطری ہے)، حصہ سوم: تفسیر قرآن کے بنیادی اصول (۷۔تحریر فی اصول التفسیر، ۸۔آیات محکمات ومتشابہات)، حصہ چہارم: خدا اور کائنات (۹۔نیچر، ۱۰۔ نیچری، ۱۱۔کیا نیچر کے ماننے سے خدا معطل ہو جاتا ہے، ۱۲۔سرابِ حیات)، حصہ پنجم: معجزات اور فوق الفطری واقعات پر اعتقاد (۱۳۔عجائبات کا ظہور اور عجائبات کا قبول، ۱۴۔بہشت کی ماہیت، ۱۵۔کرامت اور معجزہ)، حصہ ششم علم حدیث (۱۶۔کتبِ احادیث) اور حصہ ہفتم: مذہب، سماج اور کلچر (۱۷۔مذہب اور معاشرت، ۱۸۔حبِ ایمانی اور حبِ انسانی، ۱۹۔ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط، ۲۰۔یونانی اور ترک اور ۲۱۔آزادی رائے) شامل ہیں۔

''طبقاتِ علوم الدین'' (تہذیب الاخلاق بابت ۱۵محرم ۱۲۸۸ھ)، (مقالاتِ سرسید، جلد ایک: ۳۶۔۴۰) میں علوم دین کے مختلف طبقات کا ذکر کیا گیا ہے۔شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں علوم الدین کے چار طبقات کا تذکرہ کیا ہے:

طبقۂ اول: حدیثوں کے پہچاننے کا علم کہ کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف؟ اور کون سی معتبر ہے اور کون سی نامعتبر؟ چناں چہ اس کام کو علما محدثین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے اختیار کیا اور حدیث کی کتابیں اس میں تالیف کیں۔

طبقۂ دوم: کلام الٰہی اور ان حدیثوں کے معانی بیان کرنے کا علم کہ مطابق محاورہ استعمال زبان عرب کے اس کے کیا معنی ہیں چناں چہ اس کام کو علما علم ادب نے اختیار کیا۔

طبقۂ سوم: کلامِ الٰہی اور ان حدیثوں کے معنوں کو بطور اصطلاحات شرعیہ قرار دینے
اور ان سے احکامِ شرعیہ کے نکالنے اور ایک حکم سے دوسرے پر قیاس کرنے
اور اشارات دکنایات عبارت سے حکم نکالنے اور ناسخ منسوخ قرار دینے
اور راجح مرجوح ٹھہرانے کا علم۔ چناں چہ اس کام کو فقہا نے اختیار کیا۔

طبقۂ چہارم: مذہب اسلام کے اسرار جاننے کا علم اور یہ وہ علم ہے جس میں مذہب
اسلام میں جو کچھ ہے اس کی حقیقت اور اصلیت اور جو حکمت کہ شارع نے
اس میں رکھی ہے وہ بیان کی جاتی ہے۔

س موضوع کے حوالے سے دو کتابیں نہایت عمدہ ہیں جن میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی ''احیاء العلوم'' اور دوسری (جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے) شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ شامل ہیں۔ اس مضمون میں سرسید نے بتایا ہے کہ اگلے زمانے میں علما کرام کی رائے تھی کہ علم اسرار الدین کو عام لوگوں میں پھیلانے سے جو ان کی سمجھ سے باہر ہے، کچھ فائدہ نہیں بل کہ ان کی تصدیق کو تشکیک میں ڈالتا ہے۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ موجودہ زمانے میں علوم کی ترقی سے اس علم کی شعاعیں تمام دنیا میں پھیل گئی ہیں، پھیلتی جاتی ہیں اور پھیلتی جائیں گی۔

سرسید کے خیال میں انسان زمانے سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وہ انسان کے خیالات، اعتقدات اور رسوم و رواج کو اپنے پوشیدہ اثرات سے بدلتا جاتا ہے۔ جس طرح دنیوی خیالات، عادات اور رسوم و رواج، حالتِ تمدن اور معاشرت پر زمانہ اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح مذہب و اعتقاد بھی متاثر ہوتے ہیں، لہٰذا سرسید کا خیال ہے کہ مذہب پر زمانہ کے اثرات یقینی ہیں۔ ہمیں مذہب کے بارے میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کر لینا چاہیے بل کہ تحقیق سے کام لینا چاہیے تا کہ مذہب میں غلط تصورات در نہ آئیں۔

''مذہبی خیال: زمانہ قدیم اور زمانہ جدید کا'' (تہذیب الاخلاق)، (مقالاتِ سرسید جلد تین) سرسید نے مذہب کے قدیم اور جدید فلسفوں پر بحث کی ہے۔ ماقبل سنہ

نبوی کو سر سید پہلے زمانہ قدیم تصور کرتے تھے لیکن مسلمان چوں کہ پھر سے پرانے رسوم ورواج کی طرف مائل ہو گئے تھے اس لیے سر سید نے اس زمانہ کو ۱۳۰۰ نبوی تک محیط کر دیا اور زمانۂ بعد کو زمانہ جدید تصور کر لیا۔ مذہبی اصول کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ قدیم اصول مذہبی یعنی انسان مذہب کے لیے پیدا ہوا ہے۔

۲۔ جدید اصول یعنی مذہب انسان کے لیے پیدا ہوا ہے۔

سر سید نے بہت قدیم اور جدید سوالوں کا احاطہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ بہت سے جدید اصول قدیم اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ پرانے اسکول کے پڑھے ملّا اور موجودہ زمانے کی جوان تعلیم یافتہ کے خیالات ایک جیسے نہیں لیکن جو صحیح اصووں کی پاس داری کرتا ہے وہ کامیاب وکامران ہے اور جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ ناکام و نامراد ٹھہرے گا۔

سر سید نے ''مشرقی علوم وفنون'' (مقالات سر سید جلد پندرہ) میں مشرقی علوم و فنون اور جدید مغربی علوم وفنون کا تقابل کر کے جدید علوم وفنون کے حصول کو ترجیح دی ہے، کہتے ہیں:

''۔۔۔ جنوری ۱۸۶۴ء کے ایڈنبرا ریویو میں ایک نہایت دقیق اور مدبر مصنف نے اپنے آرٹیکل میں اس مشکل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں علمیت اور انسانیت بہ نسبت انگریزوں کے ایادہ قدیم تر تھی۔ وہ ایک ایسی علیت تھی جس کی بنیاد اس زبان پر (یعنی سنسکرت وعربی پر) تھی جو یورپ کی تمام زبانوں کا (اور میں کہتا ہوں کہ یورپ کے بڑے بڑے علوم کا) ماخذ تھی۔ اس یے یہ مشکل سوال حل طلب تھا کہ وہ کون سی تعلیم ہے جو ہندوستانیوں کو دی جاوے۔''[۵۲]

گرچہ سر سید مشرقی علوم کو یورپ کے بڑے بڑے علوم کا ماخذ سمجھتے ہیں لیکن یورپی علوم نے جو جدت اختیار کر لی ہے اور جس طرح انسانیت ترقی کی انتہاؤں کو

چھونے لگی، سرسید جدید مغربی علوم کے حصول کو ترجیح دینے لگے۔

''وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت'' (مقالاتِ سرسید جلد تیرہ) میں سرسید نے وحی کی حقیقت، وحی کیوں کر دی جاتی ہے؟ اور نبوت کی حقیقت کو مدلل انداز میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں وحی تو وہی ہوتی ہے جو خدا سے پیغمبروں کو دی جاتی ہے۔ مختلف دلائل پیش کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''پس وحی وہ چیز ہے جس کو قلبِ نبوت پر بسبب اسی فطرت نبوت کے مبدءِ فیاض نے نقش کیا ہے۔ وہی انتعاشِ قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے نہیں ظاہری کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی وہ نقشِ قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے نہ بولنے والا۔ خدا نے بہت سی جگہ قرآن میں جبرئیل کا نام لیا ہے۔ مگر سورۃ بقرہ میں اس کی ماہیت بتا دی ہے جہاں فرمایا ہے کہ جبرئیل نے تیرے دل میں قرآن کو خدا کے حکم سے ڈالا ہے! دل پر اتارنے والی یا دل میں ڈالنے ولی وہی چیز ہوتی ہے جو خود انسان کی فطرت میں ہو۔ نہ کوئی دوسری چیز جو فطرت سے خارج اور خود اس کی خلقت سے جس کے دل میں ڈالی گئی ہے جدا گانہ ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی ملکۂ نبوت کا جو خدا نے انبیا میں پیدا کیا ہے، جبرئیل نام ہے۔''۔[۵۴]

سرسید کا مذکورہ بیان مدلل ہونے کے باوجود مبہم سا ہے کیوں کہ ان دلائل میں سے کچھ کی درست تعبیر کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔

نبوت کے حوالے سے بھی سرسید نے آئمہ کرام کے بیانات سے استناد لے کر اپنی رائے قائم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نبوت کو ایک فطری چیز سمجھتے ہیں۔ نبی گو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں کیوں نہ ہو نبی ہوتا ہے۔ النبی نبی ولوکان فی بطن امہ۔ جب پیدا ہوتا ہے تو نبی ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو نبی ہی مرتا ہے۔

''نبوت ایک فطری امر ہے'' سابقہ مضمون کی مزید تفصیل، تکملہ یا تتمہ ہے۔

سابقہ مضمون میں جو وضاحتیں رہ گئی تھیں انھیں سرسید نے قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ نبوت کسی ایسے منصب کی مانند نہیں ہے جیسے کہ کوئی بادشاہ کوئی منصب کسی کو دے دیتا ہے بل کہ نبوت ایک فطری امر ہے اور جس کی فطرت میں خدا نے ملکۂ نبوت رکھا ہے وہی نبی ہوتا ہے اور اس بات کو ہم نہیں مانتے کہ سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کو خدا چاہتا ہے نبی اور پیغمبر کر دیتا ہے۔''[۵۴]

مصنف نے سرسید کی کتاب تحریر فی اصول التفسیر کو خوب سراہا ہے جس میں سرسید نے تفسیر قرآن کے اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں جو اصول قرآن مجید سے نکلتے ہیں ان کے مطابق کوئی مخالفت علومِ جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے۔ ہر ایک کلام کے معنی قرار دینے میں وہ کلام کسی کا ہو خواہ خدا کا یا انسان کا سات باتوں کا محقق ہونا ضروری قرار دیا ہے:

۱۔ جس لفظ کے جو معنی قرار دیے گئے ہیں اس کی نسبت جاننا چاہیے کہ وہ لفظ انھیں معنوں میں وضع کیا گیا ہے۔

۲۔ اس بات کا قرار دینا کہ جن معنوں میں وہ لفظ وضع کیا گیا تھا ان معنوں سے کسی دوسرے معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔

۳۔ اگر وہ لفظ مشترک المعنی ہے تو اس بات کا قرار دینا لازم ہے کہ وہ ان مشترک معنوں میں سے کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ضمائر جن کا مرجع مختلف ہو سکتا ہو وہ بھی الفاظ مشترک المعنی میں داخل ہیں۔

۴۔ اس بات کو قرار دینا ضرور ہے کہ وہ ان اصلی معنوں میں بولا گیا ہے جو اس سے متبادر ہوتے ہیں یا مجازی معنوں میں۔

۵۔ اس بات کو قرار دینا کہ اس کلام میں کوئی شے مضمر ہے یا نہیں۔

۶۔ اس بات کو قرار دینا ضرور ہے کہ جن معنوں پر وہ لفظ دلالت کرتا ہے اس میں کوئی تخصیص بھی ہے یا نہیں۔

۷۔ یہ بات دیکھنی لازم ہے کہ جو معنی اس لفظ کے قرار دیے گئے ہوں اس پر کوئی عقلی معاوضہ بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ معنی اس کے صحیح نہ ہوں گے۔ اور یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بل کہ تمام علمائے اسلام نے سینکڑوں مقاموں میں اس کی پیروی کی ہے، مثلاً خدا کے عرش پر استوار ہونے میں۔ اس کے ہاتھ اور منہ اور بے مثال ہونے میں اور مثل ان کے اور بہت سے لفظوں کے اصل معنی اس لیے نہیں لیے گئے کہ دلیل عقلی سے محال ہیں یا خود اس قانونِ فطرت کے مخالف ہیں جو خدا نے بیان کیا ہے یا تجربہ کے مخالف ہیں چھوڑ کر دوسرے معنی نہ لیے جاویں۔ ۵۵

اس مضمون کی بحث کو سمیٹتے ہوئے سرسید کہتے ہیں:

''یہ بحثیں جہاں تک ہیں صرف ان امور سے متعلق ہیں جو علوم سے اور طبیعات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ باقی رہے وہ امور جو روحانی تعلیم سے متعلق ہیں اور جن کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ حاوی ہے ہر وقت میں ایک حالتِ مستقل پر قائم ہیں اس میں نہ کبھی تبدل ہوا۔ نہ ہوگا۔ نہ ہونے کی حاجت۔ جس کے لیے منطوق آیہ کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا شاہد عادل ہے۔'' ۵۶

''آیات محکمات و متشابہات'' میں سرسید نے آیاتِ محکمات اور آیاتِ متشابہات کا جائزہ لیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ آیاتِ محکمات کے ساتھ آیاتِ متشابہات کیوں آئی گئی ہیں۔ بعض کے خیال میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام تر آیات محکم ہوتیں تا کہ آسانی سے سمجھ میں آتیں اور ان کو سمجھنے میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہتا۔ سرسید کے خیال میں قرآن مجید انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور اس سے عوام وخواص سب کی ہدایت مقصود ہے تو اس میں آیاتِ متشابہات کا ہونا لازمی امر ہے۔ سرسید اسلام کا سب سے بڑا اصول توحید اور اس کے بعد اعمالِ حسنہ کو سمجھتے ہیں۔ اس موضوع کی بحث کو سمیٹتے ہوئے سرسید کہتے ہیں

''عربی زبان کے محاورہ میں محکم اس بات کو کہتے ہیں جو ایسی صاف ہو جس سے ایک ہی مطلب سمجھ میں آئے اور دوسرا کوئی مطلب نکلتا ہی نہ ہو۔ متشابہ اس بات کو کہتے ہیں جس کے کئی معانی سمجھ میں آتے ہوں اور ان میں یہ خوبی تمیز نہ کی جاسکتی ہو کہ کون سا مطلب مقصود ہے یا جو معنی اس کے الفاظ سے متبادل ہوتے ہوں وہ مقصود نہ ہوں بل کہ وہ الفاظ بہ طور تمثیل یا بہ طور مجاز و استعارہ کے آئے ہوں۔'' ۵۷

''نیچر'' میں فطرت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ سرسید کا خیال ہے کہ انسان مقلد تو ہوتا ہے اور مقلد ہونا عمدگی پر دال ہے نہ کہ غیر عمدگی پر۔ انسان کو چوں کہ اس کی فطرت پر تخلیق کیا گیا ہے، لہٰذا اسے نیچری یعنی فطرت کا پیروکار ہونا چاہیے جیسے انبیا نے اللہ تعالیٰ کو شروع میں نیچر کے ذریعے ہی پہچانا جیسے حضرت موسیٰ نے رب ارنی کے جواب میں سنا۔

لن ترانی ولکن انظرالی الجبل، پہاڑ پر کیا تھا؟ وہی نیچر قانونِ قدرت کا نمونہ تھا۔ سرسید نے شاہ ولی اللہ اور صاحب تفسیر ابن عباس کی فطرت اللہ کے ترجمے کا حوالہ دیا ہے:

''شاہ ولی اللہ نے، صاحب تفسیر ابن عباس نے فطرت اللہ کا ترجمہ دینِ خدا کا کیا ہے، پس جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے۔ خدا نہ ہندو ہے، نہ عرفی مسلمان، نہ مقلد، نہ لامذہب، نہ یہودی، نہ عیسائی۔ وہ تو پکا چھٹا ہوا نیچری ہے۔ وہ خود اپنے کو نیچری کہتا ہے۔ پھر اگر ہم بھی نیچری ہیں تو اس سے زیادہ ہم کو کیا فخر ہے۔'' ۵۸

سرسید کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر چیز نیچر کے مطابق ہے کیوں کہ موسیٰ اور ابراہیمؑ نے نیچر کے ذریعے ہی اپنی ذات کو پہچانا۔ ہر انسان اپنی ذات کو اور اپنے خدا کو نیچر کے ذریعے ہی جانتا اور پہچانتا ہے اس لیے انسان کا نیچری ہونا یقینی ہے۔ سرسید پوری بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جب ہم نیچری، ہمارا خدا نیچری،

ہمارے باپ دادا نیچری تو پھر کوئی اس مقدس لفظ کو بری نیت سے استعمال کرتا ہے تو وہ جانے اور اس کا دین ایمان وہ ہمارے ساتھ ساتھ خدا کو، پیغمبر کو، ابراہیم کو سب کو نیچری کہتا ہے۔ پھر لوگ جو چاہیں کہتے پھریں، ہم ان کی نسبت حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ رکھنے دیا جائے۔ اس لیے سر سید چاہتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی راہ پر، ہمیں اپنی راہ پر، اپنے خدا کی راہ پر، اپنے باپ دادا کی راہ پر، پیغمبروں کی راہ پر، رسولوں کی راہ پر آزر کے بیٹے ابراہیم کی راہ پر چلنے دو۔

''نیچری'' (تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۶ھ از صفحہ ۱۸ تا ۲۱)، (مقالاتِ سر سید جلد پندرہ ۱۵۴-۵۹) میں سر سید نے ''نیچری (Naturalist)'' کی تعریف اور وضاحت کے ساتھ ساتھ خود کو ''نیچری'' کہلوانا پسند کیا ہے۔

''کیا نیچر کے ماننے سے خدا معطل ہو جاتا ہے'' (تہذیب الاخلاق جلد اول، نمبر ۵)، (مقالاتِ سر سید جلد تین) میں سر سید نے قدرے مختصر انداز سے اس موضوع کا جائزہ لیا ہے۔ سر سید کہتے ہیں کہ بہت ہی نیک اور پارسا مگر کم غور و فکر کرنے والے بزرگ سمجھتے ہیں کہ اگر دنیا ایک قانون قدرت پر چلتی ہے اور اس کے برخلاف نہیں ہو سکتا، گو وہ قانونِ قدرت خود خدا نے ہی بنایا ہو، مگر اس کے بنانے کے بعد خدا کے کرنے کے لیے کیا کام باقی ہے۔ پھر ایسے خدا سے جو معزول یا معطل ہو گیا ہے ہم کو کیا غرض ہے اور وہ ہمارے کس کام کا ہے؟ نعوذ باللہ، ایسے خیالات عمق نہ کرنے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ نعوذ باللہ اگر خدا قانونِ قدرت بنا کر معطل ہو گیا ہو تو اس قانونِ قدرت کا قائم رکھنے والا اور دنیا کو اس قانون کے مطابق چلانے والا کون ہوگا؟ ۵۹

بحث و تمحیص کے بعد سر سید اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چوں کہ خود قائم ہے اور ان چیزوں کا قائم رکھنے والا ہے جو اس کے سوا ہیں، لہٰذا خدا کسی وقت بھی بے کار نہیں رہتا اور نہ ہی بے کار رہ سکتا ہے۔

''سرابِ حیات'' (مقالاتِ سر سید جلد ۷ نمبر) میں سر سید نے زندگی کو سراب

ثابت کرنے کے لیے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی سے مخاطب ہیں۔ چند دلائل اور مثالوں سے انھوں نے بتایا ہے کہ یہ زندگی بے مایہ ہے اور کسی بھی وقت ختم ہونے والی ہے۔

''عجائبات کا ڈھول اور عجائبات کا قبول (مقالات سرسید جلد ا) میں بھی سرسید نے مکالماتی انداز کو برقرار رکھا ہے۔ان عجائبات کا ڈھول اس صورت میں ہوتا ہے جب انسان کسی مذہب کا ماننے والا نہ ہو۔اس کے برعکس کسی مذہب کا ماننے والا عجائبات کو قبول کر لیتا ہے۔ان عجائبات میں سے سرسید نے درختوں کے اگنے، پرندوں کے ہوا میں اڑنے، آسمان وزمین میں معلق رہنے، شہد کی مکھی کے کرتب، اس کا نہایت اعلیٰ اصولِ اقلیدس پر چھتا بنانے، پہاڑوں پر اور اونچی جگہ پر لگانے، ہر ایک قسم کے سفید پھولوں کا رس چوس کر لانے، مختلف رنگوں کا شہد بنانے، گائے، بھینس، لال گائے اور بکری کا چارہ کھا کر دودھ بنانے، خود انسان، انڈے سے مرغی کا اور مرغی سے انڈے کا پیدا ہونا وغیرہ سے متعلقات جیسے عجائبات کا ذکر کیا ہے۔

طوفانِ نوحؑ، تختِ سلیمان کا ہوا میں اڑنا، حضرت موسیٰ کا طورِ سینا پر اللہ سے ہم کلام ہونا، سفید ہاتھ اور عصا کا اژدھا بننا، حضرت یوشعؑ کے حکم سے سورج کا ٹھہر جانا، حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں چالیس دن زندہ رہنا، حضرت عیسیٰؑ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا، مردوں کو زندہ کرنا، کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا، حضرت محمد ﷺ کا معراج پر تشریف لے جانا، ہاتھ کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کرنا اور اولیاء اللہ کی کرامات بھی عجائبات میں شامل ہیں۔

مذکورہ بالا تمام عجائبات کا تذکرہ کرنے کے بعد سرسید صرف ان عجائبات کو تسلیم کرتے دکھائی دیتے ہیں جو فطرت کے عین مطابق ہوں جبکہ وہ خلافِ فطرت عجائبات کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔

''بہشت کی ماہیت'' (مقالاتِ سرسید جلد تیرا) میں سرسید نے بہشت اور اس کی قلبِ ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔سرسید مسلمانوں کے عام اعتقادات کے برعکس اللہ

اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق بہشت کا تصور قبول کیے ہوئے ہیں'

"جنت یا بہشت کی ماہیت جو خود خدا تعالیٰ نے بتلائی ہے وہ تو یہ ہے . یعنی کوئی نہیں جانتا کہ کیا ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) چھپا رکھی ہے اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔ پیغمبر خدا ﷺ نے جو حقیقت بہشت کی فرمائی جیسے کہ بخاری و مسلم نے ابو ہریرہ کی سند پر بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیار کی ہے میں نے اپنے بندوں کے لیے وہ چیز جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہے اور نہ کسی کان نے سنی ہے، ورنہ کسی انسان کے دل میں خیال گزرا ہے۔ پس اگر حقیقت بہشت کی یہی باغ اور نہریں اور موتی کے اور چاندی سونے کی اینٹوں کے مکان اور دودھ شراب اور شہد کے سمندر اور لذیذ میوے اور خوب صورت عورتیں اور لونڈے ہوں تو یہ تو قرآن کی آیت اور خدا کے فرمودہ کے بالکل مخالف ہے کیوں کہ ان چیزوں کو تو انسان جان سکتا ہے اور اگر یہ فرض کیا جاوے کہ ویسی عمدہ چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں نے سنی تو بھی ولا خطر علیٰ قلب بشر سے خارج نہیں ہو سکتیں۔"[۲۰]

سرسید یک آیت کریمہ اور ایک حدیث مبارکہ کا ذکر کرنے کے بعد بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ رحمٰن میں جنت کا کیا نقشہ کھینچا ہے۔ اگر سرسید ان آیات کا مطالعہ کر لیتے تو شاید انھیں جنت کی مذکورہ نعمتوں میں سے کسی پر شک وشبہ نہ رہتا۔ البتہ ان نعمتوں کی ماہیت کیا ہوگی؟ ایک ایسا سوال ہے جو یقیناً قیامت کے روز اپنا جواب حاصل کر لے گا۔

"کرامت اور معجزہ" (مقالاتِ سرسید جلد ۱) میں سرسید نے کرامت او معجزہ میں فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید نے خدف قانونِ قدرت معجزہ اور کرامت کا سرے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ایسے کرامات اور ایسے معجزات سرسید کے خیال میں مسلم امہ میں خرابی کا باعث ہیں اور اسلام کے خلاف بھی۔

"کتب احادیث" کے باب میں سرسید نے کتب احادیث کے وہ درجے بیان کیے ہیں جو شاہ ولی اللہ نے متعین کیے تھے:

درجۂ اول: موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم

درجۂ دوم: جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن نسائی

شاہ ولی اللہ مذکورہ بالا چھے کتب احادیث کو صحاحِ ستہ میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اکثر نے موطا امام مالک کی بجائے سنن ابن ماجہ کو شامل کیا ہے۔

درجۂ سوم: مسند شافعی

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان کتابوں کے مصنف عالم متبحر ہیں، لیکن ان میں اچھی بری، یہاں تک کہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں۔

"مذہب و معاشرت" کے باب میں سرسید نے مذہب اور معاشرت کا باہمی تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح بنی اسرائیل کو لے کر حضرت موسیٰ رامیسس سے نکلے تھے اور پھر ایک جنگل میں بسیرا کیا۔ بعدازاں بخت نصر نے انھیں بابل میں قید کر کے توریت کے نسخوں کو تاراج کر دیا۔ جب بنی اسرائیل بابل کے قید خانے سے آزاد ہوئے تو مذہبی احکامات صرف ان کے دل و دماغ میں موجود تھے جس سے ان کے مذہبی تصورات میں تحریف ہوئی۔ جیسے یہودی برسات لانے کے لیے بکری کے بچے کو اس کی ماں کے دودھ میں کھیتوں کے کونوں پر رکھ دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ نے منع فرمایا تو یہودیوں نے سمجھا کہ گوشت کو دودھ میں پکانا ہی سرے سے ناجائز ہے۔

سرسید کے خیال میں حضرت محمد ﷺ بھی موسیٰ کی طرح دنیاوی سرداری کے منصب پر فائز تھے اس لیے آپ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینا پڑتا تھا اور آپ کو نبوت عطا ہونے سے پہلے عرب میں قبائلی لڑائیاں عام تھیں اس لیے آپ کو ہی ان کے درمیان فیصلے کرنے پڑے جو قبائل دینِ اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلمان عالموں نے بھی قدم بہ قدم یہودیوں کی تقلید کی اور دنیاوی احکام کو دین کا حصہ بنا دیا۔ جس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کی بدبختی کی جڑ دنیوی مسائل کو دینی مسائل میں جو نا قابلِ تغیر و تبدل ہیں، شامل کر لینا ہے۔

''حب ایمانی اور حب انسانی'' میں سرسید نے مذہب اسلام کی رو سے کافروں سے صرف وہی دوستی ممنوع قرار دی ہے جو من حیث الدین ہو اور اس کے سوا کسی کی دوستی اور سچی محبت جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہو سکتی ہے، کفر کرنا شرعی طور پر منع نہیں ہے:

> ''پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ ان کی محض غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے گو وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے۔ مگر وہ تمام محبت اور دوستی حب انسانی کے درجے پر ہو، نہ حب ایمانی کے۔ کیوں کہ حب ایمانی بلا اتحاد مذہب، بل کہ بلا اتحاد مشرب ہونی غیر ممکن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے کی ہے۔''[16]

یہی وجہ ہے کہ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں میں ربط و تعلق کو جائز قرار دیتے ہیں۔

''یونانی اور ترک'' میں سرسید نے یونانیوں پر ترکوں کی فتح کو اسلام کی فتح قرار نہیں دیا بل کہ اسے ترکوں کی فتح قرار دیا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں ترکوں کی فتح انگریزوں اور فرانسیسیوں کے تعاون سے ممکن ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ترکوں کی یونانیوں کے ہاتھوں شکست کو اسلام کی نہیں بل کہ ترکوں کی شکست تسلیم کرتے ہیں۔

''آزادیِ رائے'' میں سرسید نے ہر ایک فرد کے لیے آزادیِ رائے رکھنے کو اہمیت دی ہے اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ایک فرد کے مدمقابل نو افراد ہوں تو جیسا استحقاق اپنی رائے کے اظہار کے خاطر وہ نو افراد رکھتے ہیں ویسا ہی استحقاق اس ایک شخص کو بھی حاصل ہونا چاہیے کیوں کہ عین ممکن ہے کہ ان افراد کی یکساں رائے کے

برعکس اس ایک فرد کی رائے زیادہ معتبر اور صحیح ہو۔

سید مقبول احمد کا چوتھا سرسید یادگاری خطبہ "اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد خاں کا مرتبہ" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے پہلی بار فروری ۱۹۹۱ء کو شائع ہوا جو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے زیر اہتمام پیش کیا گیا۔ اس کا "تعارف" خواجہ محمد شاہد جنرل سیکرٹری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) دہلی، نے تحریر کیا۔ جب کہ یہ خطبہ چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پروفیسر مقبول احمد نے بیان کیا کہ ابتدائے اسلام سے پندرھویں صدی عیسوی تک مسلمان قوم ترقی یافتہ قوم تھی۔ اس کے برعکس یورپ نشاۃ ثانیہ کے ذریعے عصر حاضر میں داخل ہوا اور ترقی کی منازل تیزی سے طے کیں۔ جب کہ مسلمان اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں ذلت اور بربادی کی اتھاہ گہرائیوں میں جاگری۔ اگر مسلمانوں کے انحطاط کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مذہب کی پابندی کی کمزوری، تعلیم اور اجتہاد کی کمی، سیاسی اور فوجی شکست، جدید سائنسی علوم سے بے گانگی، تعلیمی پس ماندگی اور دیگر وجوہات شامل ہیں۔ پروفیسر صاحب نے تاریخی پس منظر میں انحطاط کی علمی، معاشی، نظریاتی اور فلسفیانہ وجوہات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

جب اٹھارویں صدی میں یورپ کی سیاسی اور فوجی سبقت نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک کو یورپ کا محکوم بنا دیا اور اسلامی دنیا پر حملے ہوئے تو اس کے نتیجے میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں جن میں امام غزالی کی نظریاتی اصولوں پر اسلام کو مستحکم کرنے کی تحریک، اٹھارویں صدی کے آخر میں شیخ عبدالوہاب کی تحریک، شاہ ولی اللہ دہلوی، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ہندوستان، مصر اور افغانستان میں تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد سرسید احمد خاں کی انیسویں صدی میں "علی گڑھ تحریک" خاص اہمیت کی حامل ہے۔ سرسید نے اس تحریک کے ذریعے نہ صرف جدید تعلیم پر زور دیا بل کہ مذہبی اور سیاسی جمود کو توڑنے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ یہ

تحریک بنیادی طور پر مسلمانوں کی معاشی اور سماجی فلاح و بہبود کی تحریک تھی اس کا ذریعہ جدید تعلیم تھی۔ مذہبی تعصبات، غلط عقائد اور رسوم ورواج مسمانوں کی اصلاح میں بہت بڑی رکاوٹ تھے جسے دور کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی کاوشوں کے نتیجے میں تحریک کے فوائد ہندوستان کی ترقی اور فلاح و بہبود کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

گر ہم کتاب کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مصنف نے سرسید کے مذہبی افکار کا کما حقہ مطالعہ کیا ہے اور ان کا تجزیہ کر کے سرسید کے تسامحات پر بیش قیمت رائے دی ہے۔ اسلوب اور اندازِ تحقیق کے حوالے سے کتاب نہایت عمدہ اور وقیع دلائل پر مشتمل ہے۔

سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر (۱۹۹۵ء) از پروفیسر محمد عمر الدین

سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۔کلب روڈ، لاہور نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ یہ تالیف اناسی صفحات پر مشتمل ہے جب کہ آخر میں دو صفحات ''اشاریہ'' پر مشتمل ہیں۔ اس کا انتساب مؤلف نے اپنے پیارے بیٹے صلاح الدین محمود کے نام کیا ہے۔ فہرست میں، ۱۔ سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر، ۲۔ سرسید کی کوششوں کا تاریخی پس منظر، ۳۔ اسلام بہ حیثیت ایک قانون اور فلسفے کے، ۴۔ اسلام بہ حیثیت ایک نظام دینیات، ۵۔ اسلام بہ حیثیت ایک مسلک تصوف کے، ۶۔ احیاء دین اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت، ۷۔ سرسید احمد خاں کی نشوونما کا پس منظر، ۸۔ سرسید کے تصور مذہب کا مرکزی پس منظر، ۹۔ اسلام بہ حیثیت ایک سائنٹیفک نظریے کے، ۱۰۔ سرسید کے یہاں فطرت یا نیچر کا مفہوم، ۱۱۔ سرسید کے یہاں عقل کا مفہوم، ۱۲۔ سرسید کے مذہبی فکر کے چند بنیادی اصول، ۱۳۔ ہستی وصفات باری تعالیٰ، ۱۴۔ عقیدہ روح، ۱۵۔ مسئلہ جبر وقدر، ۱۶۔ مسئلہ حسن وقبح، ۱۷۔ نبوت، وحی والہام اور معجزات، ۱۸۔ ملائکہ، شیطان اور قصہ آدمؑ، ۱۹۔ عالم غیب، عالم مثال اور ملاء

اعلیٰ وغیرہ،۲۰۔معاد اور اس کے متعلقات،۲۱۔قرآن،۲۲۔معاشرتی اور علمی احکام، ۲۳۔سر سید کی عظمت اور ان کے کارنامے کی قدر و قیمت اور ۲۴۔اشاریہ شامل ہیں۔

سر سید حمد خاں کا نیا مذہبی پس منظر کے زیرِ عنوان مختصر حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف اور اہم کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔''اسلام بہ حیثیت ایک قانون کے'' کے عنوان کی ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ مرورِ ایام کے ساتھ جب دینِ اسلام میں قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ ''فقہ'' کا وجود سامنے آیا تو کئی ایک فقہا کا ظہور بھی عمل میں آیا جس سے دین میں کئی ایک مسالک پیدا ہو گئے اور ان کی سرپرستی درباروں نے کی۔اس سلسلے میں مؤلف اپنا نقطہ نظر تحریر کرتے ہیں:

> ''غرض دربار سے توسل اور امرا کی سرپرستی کی بنا پر کہیں ایک مذہب فقہ کو عروج حاصل ہوا اور کہیں دوسرے کو۔جب ایک کو عروج ہوا تو دوسرے کی آزادی میں فرق آیا نیز اس طرح ہر مسلک اپنی جگہ پر سخت کٹر اور بے لچک ہوتا گیا۔اس لیے کہ وہ حکومتوں کی سنگینوں کے سائے میں نشو و نما پاتا تھا اور رینی ضد اور دوسرے مسلک کی مخالفت کے سہارے زندہ رہتا تھا۔
>
> مختصر یہ کہ ان مجادلوں اور مناظروں سے اسلام میں ظاہر پرستی داخل ہو گئی ور باطنی اسپرٹ کمزور ہو گئی۔ظاہری احکامِ شریعت پر زور دیا جاتا تھا اور تزکیہ نفس اور اصلاحِ کردار سے پہلو تہی برتی جاتی تھی۔''[۶۲]

ن فقہی مسالک میں حنفی، شافعی، حنبلی وغیرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔جس طرح فقہ کی تحریک نے اسلام کو ایک قانون کی شکل میں پیش کیا تھا اسی طرح ایک گروہ نے اسلام کو فلسفہ بنانا چاہا۔اس گروہ میں واصل بن عطا، ابوالہذیل، نظام، حافظ، جبائی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔چوں کہ فلسفۂ اسلام اولاً فلسفی تھے اور مذہب سے ان کی دلچسپی ثانوی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے وہ قرآن اور مذہب کو یونانی فلسفے کے مطابق بنا دینا چاہتے تھے۔اس گروہ میں کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔

''اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت'' کے عنوان کے تحت ہندوستان کے مسمانوں کی مذہبی حاست، اخلاقی و معاشرتی حالت اور سیاسی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس کا اس باب میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔
سرسید کے جہاں نیچر یعنی فطرت کو بنیادی اہمیت ملی ہے وہاں ''عقل'' اور ''عقلیت پسندی'' کو بھی سرسید کے ہاں خاص اہمیت حاصل ہے۔ مؤلف سرسید کے تصورِ عقل کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''... بعض لوگ سطحی مطالعے کی بنا پر سرسید کو نظریہ عقلیت (Rationalism) کا پرستار سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ تاریخ فلسفہ میں عقلیت کا استعمال ن نظریوں کے لیے ہوتا ہے جن کی رو سے عقل محض کو (بغیر تجربہ اور مشاہدہ کی وساطت کے) حقیقت تک پہنچنے کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ سرسید اس عقلیت کے قائل نہیں۔ وہ زیادہ تر تجرباتی عقل یا Emperial Reason کے ماننے والے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ عقل جو نیچر کے خارجی در باطنی مظاہر پر غور کرتی ہے اور ان سے حقائق اشیا تک پہنچتی ہے۔ اس حاظ سے سرسید کے نظریہ علم کا رشتہ دیکارٹ اور اسپنوزا جیسے عقلیین کے مقابلے میں بیکن، لاک اور مل جیسے تجربیئن تک پہنچتا ہے۔ وہ استخراجی ستدلال سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اسی حد تک جس کی تجرباتی یا سائنسی ستدلال میں گنجائش ہے۔ غرض سرسید ہر قسم کے علم یقین اور ایمان کا ذریعہ سی عقل کو سمجھتے ہیں۔'' ۶۳

''سرسید کے مذہبی فکر کے چند بنیادی اصول'' کی ذیل میں مؤلف نے پندرہ اصول بیان کیے ہیں جو اسلام کی روح کے منافی نہیں بل کہ عین مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ مؤلف کا خیال ہے کہ سرسید ''ہستی و صفاتِ باری تعالیٰ'' کے تحت خدا کو واحد، واجب الوجود، ازلی، ابدی، خالق، قادر و توانا، علیم، حکیم وغیرہ مانتے ہیں۔ ن کا عقیدہ ہے کہ خدا نہ جوہر ہے نہ عرض ہے، نہ جسم ہے، نہ کسی جگہ میں محدود ہے، نہ اس میں کسی

قسم کا تعدد ہے، نہ وہ اسباب کا محتاج ہے۔[۲۴]

زیرِ نظر کتاب میں سرسید کے ان مذہبی نظریات کو موضوع بنایا ہے جو عام علما کے نظریات سے ہٹ کر ہیں۔ کتاب اسلوبِ نگارش اور استدلال کی عمدہ مثال ہے۔

سرسید اور علومِ اسلامیہ، (۲۰۰۱ء) محمد یٰسین مظہر صدیقی (مدیر)

مجلّہ علومِ اسلامیہ کا خصوصی شمارہ سرسید اور علومِ اسلامیہ محمد یسین مظہر صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ اسے ادارہ علومِ اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے پہلی بار مارچ ۲۰۰۱ء کو شائع کیا۔ یہ تالیف تین سو سترہ (۳۱۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست میں، انتساب تقدیم، ا۔علومِ اسلامیہ اور سرسید۔ مقاصد کا ایک تجزیہ (محمد یسین مظہر صدیقی) ۲۔تفسیرِ سرسید کے عربی مصادر (جمشید احمد ندوی)، ۳۔سرسید کی تفسیر القرآن اور مابعد تفاسیر پر اس کے اثرات (رضی الاسلام ندوی) ۴۔سرسید اور حدیث۔ایک تنقیدی مطالعہ (محمد سلیم)، ۵۔شاہ ولی اللہ دہلوی اور سرسید (محمد یسین مظہر صدیقی) ۶۔سرسید کا تصورِ تعلیم و تربیت (ظفر الاسلام اصلاحی) ۷۔سرسید احمد خاں کا سیاسی نظریہ و منہاج (اسلامی سیاسی فکر کی تاریخ کے سیاق میں) از عبید اللہ فہد ۸۔سرسید احمد خاں عرب دنیا میں (ایک مطالعہ) از محمد صلاح الدین عمری، ۹۔سرسید احمد خاں (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) احمد امین، ترجمہ و حواشی: سید علیم اشرف جائسی، ۱۰۔سرسید کا تاریخی شعور (اقتدار حسین صدیقی)، ترجمہ: جمشید احمد ندوی، ۱۱۔شاہ فدا حسین (محمد مشتاق تجاوری)، سرسید احمد خاں۔منتخب کتابیات (کبیر احمد خاں)، مقالہ نگاروں کا تعارف (مرتب) شامل ہیں۔

مؤلف نے ''تقدیم'' میں اس مجلّہ کی وجہِ تالیف، اس کے مقصد اور حدود کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''موجودہ خاص اشاعت فکرِ سرسید کے بعض گوشوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مقالہ سرسید کا محض تعارف ہی پیش کرتا ہے۔ ان میں سے

ہرایک پر ایک تحقیقی تھیسز تیار کیا جا سکتا ہے۔اس شمارے میں قرآن، حدیث، فقہ، سیاسیات، اصلاح و دعوت اور فکرِ اسلامی میں سرسید کی قلم پر مقالات و مضامین شامل ہیں۔توفیقِ الٰہی ہی ہے کہ مقالہ میں توازن موجود ہے۔سرسید کی فکرِ صحیح کی ستائش کی گئی ہے اور اس کی قدر و مقام و قیمت کی تعین بھی، انحراف و خرافات پر نقد و تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔غالب کی طرف داری کہیں نہیں کی گئی بل کہ سخن شناسی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔اس پیش کش میں ایک جرأتِ رندانہ بھی موجود ہے ناقدینِ سرسید در کنار، مادحینِ سرسید بھی ان کی مذہبی فکر کی بابت کالم کرتے گھبراتے ہیں کہ بھڑوں کو کون چھیڑے، یہ روش صحیح نہیں۔'' ۶۵

''علومِ اسلامیہ اور سرسید۔مقاصد کا ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں محمد یٰسین مظہر صدیقی نے سرسید احمد خاں کی حیات کے ارتقا اور تخلیقات کے حوالے سے خامہ فرسائی کی ہے۔مؤلف کے خیال میں علومِ اسلامیہ پر سرسید کی نگارشات اپنے عنوانات و موضوعات کے لحاظ سے قرآنیات، حدیث، سیرتِ نبوی، سابقہ صحفِ سماویہ، کلام، فلسفہ، تصوف اور کسی حد تک فقہ میں محدود نظر آتی ہیں۔

مؤلف سمجھتا ہے کہ سرسید کی ابتدائی تصانیف صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے اور غیر اسلامی روایات و افکار سے امت کو محفوظ رکھنے کے مقاصد کے تحت لکھی گئیں۔ان کی ان تحریروں میں اس کی وضاحت و صراحت ملتی ہے اور دوسرے تجزیہ نگاروں اور سوانح نویسوں کے مطالعات میں بھی۔تجزیہ نگاروں نے سرسید کی تالیفات کی زمانی تقسیم اور فکرِ سرسید کے ارتقا میں حدِ فاصل قائم کر دی ہے کہ جنگِ آزادی سے قبل سرسید کی فکر روایتی، جامد اور غیر عقلی تھی جب کہ دوسرے دور میں وہ دفعتاً یک عقلیت پسند ہو گئے اور اپنے خاص تعقل اور تفکر کے سبب فکرِ اسلامی سے منحرف ہو گئے تھے لیکن ان کی ابتدائی تخلیقات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تفکر اور تعقل کا عنصر سرسید کی پہلے دور کی تصنیف میں بھی موجود ہے۔مؤلف سرسید کی مختلف تحقیقات کا مختصر

انداز میں تجزیہ پیش کرنے کے بعد ان کے مقصد کا تعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان کی تمام تصانیف ونگارشاتِ سرسید میں دو بنیادی مقاصد اہم ترین معلوم ہوتے ہیں: ایک مسلم تاریخ وثقافت کی حفاظت، دوم مسلمانانِ برصغیر کے مقام ومرتبہ اور حقوق کی مدافعت اور حکومتِ وقت کے دربار میں وکالت۔ان دونوں سے سرسید کی اپنی قوم کے ساتھ بے پناہ محبت اور ان کے حالِ زار کو بہتر بنانے کی مساعی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔''٦٢

''تفسیرِ سرسید کے عربی مصادر'' جمشید احمد ندوی کا مضمون ہے جس میں سرسید کی تفسیر قرآن کی اشاعتوں اور ان کے عربی مصادر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سرسید نے تفسیر کا آغاز ١٨٧٧ء میں کیا۔پہلی جلد ١٨٨٠ء میں شائع ہوئی۔ دوسری ١٨٨٢ء، تیسری ١٨٨٥ء، چوتھی ١٨٨٨ء، پانچویں ١٨٩٢ء میں چھٹی جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔سرسید کی وفات کے بعد سورۂ کہف،، سورۂ مریم اور سورۂ طٰہٰ کی تفسیر کے مسودات بھی مل گئے۔اس طرح سات جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر ١٩٠٤ء میں ڈیوٹی بک ڈپو، علی گڑھ سے ١٨٨٠ء سے ١٩٠٤ء کے دورانیہ میں مکمل ہوئی۔ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سرسید صدی تقریبات کے موقع پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے اسے دوسری بار شائع کرایا۔

سرسید نے اپنی تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں ''انوار التنزیل واسرار التاویل معروف بہ تفسیرِ بیضاوی''، ''تفسیر ابن عربی''، ''تفسیر ابوعلی جبائی''، ''تفسیرِ طبری''، ''تفسیر ابن عباس''، ''تفسیرِ کبیر''، ''تفسیر کشف الاسرار''، ''تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل''، ''تفسیر معالم التنزیل''، ''مجمع البیان''، ''الکشاف عن حقائق التنزیل'' جیسے تفاسیر سے استفادہ کیا۔

کتبِ احادیث میں ''صحیح بخاری''، ''صحیح مسلم''، ''جامع ترمذی''، ''سنن نسائی''، ''سنن ابن ماجہ''، ''کتاب الموطاء''، ''مشکوٰۃ المصابیح'' سے فیض یاب ہوئے۔شروحِ احادیث میں سے ''ارشاد الساری لشرح البخاری''، ''الخیر الجاری''، ''عمدۃ القاری''،

''فتح الباری''، ''الکواکب الدراری'' سے کسب فیض کیا۔ کتب سیر میں ''زاد المعاد''، ''سیرت ابن اسحاق''، ''سیرت ابن ہشام''، السیرۃ المحمدیہ''، ''الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ''، ''کتاب المغازی''، ''المواہب اللدنیہ'' کو مدنظر رکھا۔ کتب تراجم صحابہ میں سے ''الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ''، کو مدِ نظر رکھا۔ علم نحو و بلاغت میں سے ''الاقتراح''، ''الفیہ ابن مالک''، ''خزانۃ الادب''، ''کتاب الایضاح فی علوم البلاغۃ'' کو پیش نظر رکھا۔

علم لغت میں ''تاج العروس''، ''درۃ الغواص فی اوھام الخواص''، ''شرح درۃ الغواص''، ''اصحاح''، ''فقۃ اللغۃ وسراعربیہ''، ''القاموس المحیط''، ''لسان العرب''، ''لغات القرآن'' سے مستفید ہوئے۔

علم تاریخ میں ''الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ''، ''الاثر الجلیل لقدماء وادی النیل''، ''تاریخ الرسل والملوک''، ''تاریخ مختصر الدول''، ''الکامل فی التاریخ''، ''کتاب اخبار مکۃ''، ''کتاب العبر ودیوان المبتدا والخبر''، ''المختصر فی اخبار البشر''، ''مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان''، ''تاریخ یعقوبی'' سر سید کے پیش نظر رہی۔

فن جغرافیہ میں ''آثار ابلاد واخبار العباد''، ''فتوح البلدان''، ''المشترک وضعا والمفترق صقعا''، ''معجم البلدان'' سے، جب کہ فلسفہ اور علم کلام میں سے ''الاشارات والتنبیہات''، ''التفہیمات الالہیہ''، ''حجۃ اللہ البالغۃ''، ''شرح مواقف''، ''کتاب العقل والنقل''، ''کتاب فصل المقال وتقریر ما بین الشریعۃ والحکمۃ من الاتصال''، ''کتاب الکشف عن مناھج الادلۃ فی عائد الملۃ وتعریف ماوقع فیھا بحسب التاول من الشبۃ المزیفۃ والبدع المظلۃ'' کو مدنظر رکھا۔

سر سید کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے مؤلف لکھتے ہیں:

> ''مذکورہ بالا مصادر سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر کتنے وسیع اور گہرے مطالعہ کے بعد لکھی تھی۔ ان مصادر کی روشنی میں سر سید علیہ الرحمہ کی تفسیر کی قدر و قیمت آسانی کے ساتھ متعین کی جا سکتی ہے اور ساتھ

ہی ساتھ اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ''تفردات'' میں تنہا نہیں ہیں بل کہ علمائے اسلام کی ایک جماعت ان کے ساتھ ہے۔''ے۲؎

''سرسید کی تفسیر القرآن اور مابعد تفاسیر پر اس کے اثرات'' محمد رضی الاسلام ندوی کا مضمون ہے جس میں انھوں نے سرسید کی تفسیر کا ''تالیف کا پس منظر، تفسیر اور اصولِ تفسیر، تفسیر کی اہم خصوصیات: ا۔تقابلی مطالعہ، ۲۔اسلام پر اعتراضات کا رد، ۳۔عیلیات اور معجزات کی عقلی توجیہ'' پر بات کرتے ہوئے ''مابعد تفسیر پر اثرات'' کا جائزہ لیا ہے۔

''سرسید اور حدیث۔ ایک تنقیدی مطالعہ'' میں محمد سلیم نے ''سرسید اور حدیث کی روایت بحیثیت باللفظ وبالمعنیٰ''، ''سرسید اور تدوینِ حدیث''، ''سرسید اور وضعِ حدیث کا فتنہ''، ''سرسید اور داخلی حدیث''، ''ائمہ حدیث اور داخلی نقدِ حدیث'' جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ مؤلف کے خیال میں سرسید نے محدثینِ کرام کی محنتِ شاقہ کی پذیرائی کرنے کی بجائے وضعِ حدیث کے حوالے سے بحث کی ہے۔ موضوع احادیث کی نشان دہی کرتے ہوئے سرسید نے دراصل ان محدثینِ کرام کے مرتبے کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔

''شاہ ولی اللہ دہلوی اور سرسیدؒ۔ ایک تقابلی مطالعہ'' مؤلف کا اپنا مضمون ہے جس میں انھوں نے تاریخ اسلام کی دو اہم شخصیات کی تعلیمات کا موازنہ پیش کیا ہے۔ اس کے ذیلی موضوعات میں تفسیرِ قرآن مجید، معجزات، نبوت، حشرِ اجساد، تمثیلِ برزخی، مشاہدہ ومکاشفہ، تخلیقِ کائنات، ترتیب آیات وسورِ قرآن کریم، اسلوبِ قرآن کریم، علومِ دین، علوم وکتبِ حدیث، چوتھے درجے کی کتابیں، اجتہاد ومجتہد کی ضرورت، شریعت: احکام ومصالح، جیسے موضوعات پر بحث کرتے ہوئے دونوں کا تقابل کیا ہے اور کسی حد تک سرسید کو فضیلت اور ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔

''سرسید احمد خاں کا سیاسی نظریہ ومنہج (اسلامی سیاسی فکر کی تاریخ کے سیاق میں)'' عبیداللہ فہد کا لکھا ہوا مضمون ہے جس میں حقیقت پسندی کا مسلک، اسباب

بغاوتِ ہند، اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعامل، خیر الدین پاشا کی اقوم المسالک، رافعہ طہطاوی کی مناہج الالباب، شخصی استبداد کی مخالفت، قانون ساز اداروں میں عوامی نمائندگی کی حمایت، معاملات فی الدنیا میں اشتراک، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، تصورِ قومیت، کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر اوپر کے صفحات میں بات کی جا چکی ہے۔

''سرسید احمد خاں عرب دنیا میں: ایک مطالعہ'' میں محمد صلاح الدین عمری نے سرسید کے شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے عرب دنیا میں پائے جانے والے تاثرات کا جائزہ لیا ہے۔

مضمون ''سرسید احمد خاں'' میں احمد امین نے لکھا ہے جس کا ترجمہ اور حواشی کا التزام سید علیم اشرف جائسی نے کیا ہے۔ اس میں مؤلف نے سرسید کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بحث کی ہے اور ان کے کئی گوشوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

مضمون ''شاہ فدا حسین'' میں مفتی محمد مشتاق تجاروی نے سرسید کے نانا دبیر الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا مختصر انداز میں تذکرہ کیا ہے جو ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

''سرسید احمد خاں۔ منتخب کتابیات'' کبیر احمد خاں کا تحریر کردہ مضمون ہے جس میں سرسید کی کتب، سرسید پر تحقیقی و تنقیدی حوالے سے لکھی گئی کتب، مقالات اور مضامین کی تفصیل کا اندراج موجود ہے جو تحقیق کے طالب علم کے لیے ایک رہنما کا کام دینے کے لیے کافی ہے۔

مختصر یہ کہ کتاب اپنے موضوع سے انصاف کرتی ہے اور استدلال اور منطقی استخراج کی بہترین مثال ہے۔ مصنف کا اسلوب اور اندازِ بیان انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

مطالعاتِ سرسید ۲۰۱۸ء، ڈاکٹر ابوصفیان اصلاحی

مطالعاتِ سرسید دراصل سرسید کے قرانیات کا مطالعہ خصوصی ہے۔ پاکستان میں عکس پبلی کیشنز نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کے مذہبی افکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسید کی ہمہ جہتی سے کسے انکار ہوگا؟ قرانیات، اسلامیات، ادبیت، فلسفیات، تعیمات، ملی خدمات اور تقابل ادیان کے تعلق سے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ سرسید کے بہت سے ایسے خیالات ہیں جن سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے شمار اختلافات و اعتراضات بے بنیاد ہیں یا ذاتی عناد کا شاخسانہ، محبین سرسید کا ایک طبقہ وہ ہے جو انھیں بشر سمجھا ہی نہیں یا ان کے مقابلے میں دنیا کی دوسری قیادت وسیدت کو قابل اعتنا گردانتا ہی نہیں اور ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جسے سرسید کی تحریروں میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے ہیں اور بہت سے علما تو انھیں دائرۂ اسلام میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں بل کہ ان کے نزدیک تو وہ شخص بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے جو تکفیر سرسید پر سکوت اختیار کرے۔ ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو سرسید کو سیکولر مزاج اور ترقی پسند اس معنی میں کہنے پر تلا ہوا ہے کہ وہ ایک جدید ذہن تیار کرنے کے متمنی تھے۔ انھیں اسلام اور ملت اسلامیہ ہند سے لینے دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، مذکورہ تینوں طریقۂ انداز کو غلو کہیے یا راہ راست سے بعد مشرقین کا نام دیجیے۔

مطالعۂ سرسید میں معروضیت اختیار کی جائے تو حقیقت کچھ اور ہے، سرسید سے غلطیاں ہوئیں ہیں لیکن ان غلطیوں کے پیش نظر ان کے امتیازات سے صرف نظر کیا جائے، انھیں انگریزوں کا ایجنٹ کہا جائے اور ملت اسلامیہ کا دشمن بتایا جائے یہ ہرگز مناسب نہیں، 'مطالعات سرسید' میں کوشش کی گئی ہے کہ معروضیت اختیار کرتے ہوئے حقیقی سرسید کو پیش کیا جائے، تفسیر سرسید پر اعتراضات کا انبار ہے اور ان کی تفسیری خدمات سے چشم پوشی بھی برتی گئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ سرسید ان ہندوستانی مفسرین میں

سے ایک ایسے مفسر ہیں، جنھوں نے فہم قرآن کی مشکلات آسان کی ہیں، اصول تفسیر کے بعض اہم اور بنیادی گوشوں سے بحث کی ہے، تفسیر سرسید سے قانون فطرت کو منہا کر دیا جائے تو یہ ایک منفرد اور مایہ ناز تفسیر شمار کی جائے گی، بالعموم سرسید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرشتوں، جنوں اور معجزات کو تسلیم نہیں کرتے جو ایک الزام ہے، بات یوں ہے کہ وہ مذکورہ چیزوں کو اس طرح تسلیم نہیں کرتے جو جمہور مفسرین کا نقطۂ نظر ہے۔ اس مجموعہ میں تفسیر سرسید کے کئی پہلوؤں کو موضوع بحث بناتے ہوئے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے کہ سرسید ایک عظیم مفسر تھے، اس عظیم مفسر کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عام طور سے قرآنیات سرسید کی بنیاد اہل علم و فکر کے یہاں ان کی تفسیر پر رکھی گئی ہے، جب کہ قرآنیاتِ سرسید کا حق مقالاتِ سرسید اور تبیین الکلام کے بغیر ادا ہو ہی نہیں سکتا، بل کہ سرسید کا اصل قرآنی رنگ تو 'تبیین الکلام' میں ہے۔ اس میں جگہ جگہ یہ شہادت موجود ہے کہ قرآنیات پر سرسید کی زبردست گرفت تھی، یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تبیین الکلام، تقابل ادیان اور فلسفۂ استشراق کی باقاعدہ پہلی کاوش ہے، اپنی اس معرکۃ الآراء کتاب میں دلائل سے ثابت کیا گیا کہ قرآن کریم ایک محفوظ اور مامون کتاب ہے، اس میں جگہ جگہ اسرائیلیات کو ہدف تنقید بھی بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں کلام عرب سے استشہاد کے سلسلے میں سرسید کی کیا رائے تھی اسے بھی منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔ مفردات القرآن پر سرسید کی عمیق النظری کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں تفسیر سرسید اور تفسیر فراہی کا موازنہ کرتے ہوئے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا فراہی نے سرسید کے اثرات قبول کیے۔ بہت سے مسائل میں دونوں مفسرین کے درمیان فکری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے مصنف کا کہنا ہے:

> ''مطالعات سرسید' میں سرسید کے بہت سے گوشوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان تمام نکات کا یہاں ذکر ہو مناسب نہیں لگتا، صرف دو مسئلوں کا چھیڑنا بہتر ہوگا، ایک تو یہ کہ سرسید کو بہت معمولی عربی آتی تھی، یہ

یک اہتمام کے سوا کچھ اور نہیں، اس مجموعہ میں مختلف مقامات پر بالدلائل وضاحت کی گئی ہے کہ عربی زبان وادب پر انھیں عبور حاصل تھا، نیز اس کی نزاکتوں سے باخبر تھے۔ مفردات القرآن کی تحقیق وتفتیش میں جن گہرائیوں کا ثبوت دیا وہ ان کی عربی دانی پر دال ہے، یہی حال ان کی عبرانی دانی کا ہے۔''٦٨

یک الزام سر سید پر یہ ہے کہ ملت کے نونہالوں کو انگریزی زبان اور انگریزی ثقافت میں رنگنا چاہتے تھے، یہ بھی ایک بے بنیاد الزام ہے، مکاتیب سر سید سے نمایاں ہے کہ وہ نونہالانِ ملت کو بہر حال اپنی تہذیب سے نابدر رکھنا انھیں قطعاً ناپسند تھا، ادارۂ سر سید کے نصاب میں یہ جزء لاینفک بھی تھا کہ اس کے ہر طالب علم کو عربی یا فارسی پڑھنی ضروری ہے، یہی وجہ کہ جدید عربی زبان وادب کو فروغ دینے میں بھی اولیت اسے ہی حاصل ہے 'لجنۃ الادب' ہندوستان کی اوّلین عربی سوسائٹی ہے، عربی اور فارسی زبان وادب کے مختلف گوشوں پر جس تفصیل سے یہاں صراحت کی گئی ہے اس کی مثال دیگر اداروں میں مفقود ہے۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی اپنی اس تخلیقی کاوش کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''امید ہے کہ سر سید کے تئیں یہ حقیر کوشش ضرور ارباب علم وفضل اور سر سید شناسوں کو اپنی جانب منعطف کرے گی، یہ مجموعۂ مقالات اس بطل جلیل کے لیے ایک رتّی کا خراج عقیدت ہے، لیکن اندھی عقیدت نہیں، احقر سر سید کے اندھے عقیدت مندوں اور مخالفین شبلی میں ہرگز شامل ہونے کا خواستگار نہیں، گو کہ یہ راقم الحروف سر سید کا ایک ضعیف ہی مگر ہوش مند پرستار ہے۔ خدا کرے 'مقالات سر سید' کی مزید توسیع ہو اور خاک سار کی ہمت افزائی کے لیے ارباب علم ودانش اس حقیر کاوش کا ضرور مطالعہ کریں تا کہ نقائص سے اسے باخبر کیا جا سکے۔''٦٩

مقالات سر سید کو مصنف نے ۵ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں قرآنیات

سرسید کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ پہلے دو ابواب میں تفسیر سرسید اور اصول تفسیر سرسید پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں تبین الکلام کے تینوں حصوں کا باری باری تین اجزا میں تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ تیسرے باب میں افکارِ سرسید کو موضوع بنایا ہے۔ سرسید اور مستشرقین و عیسائی مبلغین، عربی، فارسی اور دینی علوم کے ساتھ سائنسی مسائل کے حوالے سے سرسید کے افکار کا جائزہ اس باب کے موضوعات ہیں۔ چوتھے حصے اور باب کا عنوان موازنہ ہے۔ اس باب میں ابوسفیان اصلاحی نے سرسید اور شیخ محمد عبدہ کے افکار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''محمد عبدہ اور سرسید کے حالات میں کس قدر یکسانیت ہے، دونوں ہی انگریزوں کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کو سر زمین ہستی سے ناپید کر دینا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں دونوں کی اصلاحی تحریک کے چلانے کی کیا حکمت عملی رہی، اس میں بھی دونوں کافی حد تک متفق نظر آتے ہیں۔'' ۷ے

تبصرہ کے عنوان سے پانچواں باب مکتوباتِ سرسید اور سرسید اور جدت پسندی، 'تذکرہ اہل دہلی' میں عربی اشعار پر محیط ہے۔ قرآنیات کے موضوع پر سرسید کی عالمانہ تحقیق علمی حلقوں کے لیے ایک ایسا منہاج ہے جس پر چل کر تفسیر کے روایتی انداز سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ مقالات، تفسیر قرآن، التحریر فی اصول التفسیر اور مکاتبات الخلان میں ایسے مباحث اٹھائے گئے ہیں جن سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن ان میں وہ اصول و ضوابط پیش کیے گئے جو فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے لیے مفید ہیں، قرآنیات کے سلسلے میں سرسید کے ان افکار کو پیش کیا گیا جن کی وجہ سے علما اسلام کے خیالات پر براہِ راست زد پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں ان کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم ہو گیا، جب کہ یہ خیالات متقدمین کے یہاں موجود ہیں۔ سرسید کی تفسیر میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو ایک مفسر کی راہ کو آسان بناتی ہیں۔ اس کتاب میں سرسید کے اس پہلو کو اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد خاں، سرسیّد، مقالاتِ سرسید، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔۱۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۷۔ ایضاً، ص ۲۰۶۔۲۰۷

۸۔ ایضاً، ص ۲۵۶۔۲۵۷

۹۔ احمد خاں، سرسیّد، مقالاتِ سرسید، جلد دہم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹۔۴۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۸۔۵۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۳۔۶۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔۱۵۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۷۲
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۴
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔۲۳۶
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۴۵
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۷۸
۲۹۔ احمد خاں، سرسید، مقالاتِ سرسید (جلد سیزدہم)، لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۳ء، ص ۹
۳۰۔ ایضاً، ص ۴۹۔۵۰
۳۱۔ ایضاً، ص ۵۲۔۵۳
۳۲۔ ایضاً، ص ۶۱
۳۳۔ ایضاً، ص ۶۱
۳۴۔ ایضاً، ص ۶۹۔۷۰
۳۵۔ ایضاً، ص ۸۹
۳۶۔ ایضاً، ص ۹۲
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔۱۴۱
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۵۰
۳۹۔ ایضاً، ص ۱۷۸۔۱۷۹
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۹۹
۴۱۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۴۲۔ ایضاً،ص ۲۴۴
۴۳۔ ایضاً،ص ۲۴۸
۴۴۔ ایضاً،ص ۲۷۵
۴۵۔ ایضاً،ص ۲۸۲
۴۶۔ ایضاً،ص ۲۸۴
۴۷۔ ایضاً،ص ۳۲۸۔۳۲۹
۴۸۔ ایضاً،ص ۴۰۹۔۴۱۰
۴۹۔ ایضاً،ص ۴۲۰
۵۰۔ ایضاً،ص ۴۶۹
۵۱۔ ایضاً،ص ۵۶۲
۴۸۔ ایضاً،ص ۵۸۵
۴۹۔ ایضاً،ص ۵۸۵
۵۰۔
۵۱۔
۵۲۔ جمال خواجہ، پروفیسر سرسید کی اسلامی بصیرت (تصانیفِ سرسید سے ایک نیا انتخاب)، علی گڑھ. ادارہ علومِ اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷
۵۳۔ ایضاً،ص ۷۰۔۷۱
۵۴۔ ایضاً،ص ۷۴
۵۵۔ ایضاً،ص ۸۱
۵۶۔ ایضاً،ص ۸۷
۵۷۔ ایضاً،ص ۸۸
۵۸۔ ایضاً،ص ۹۳

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۶۰۔ ایضاً، ص ۱۱۵
۶۱۔ ایضاً، ص ۳۶
۶۲۔ پروفیسر محمد عمر الدین، سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۵ء، ص ۶
۶۳۔ ایضاً، ۳۶
۶۴۔ ایضاً، ص ۴۵
۶۵۔ صدیقی، محمد یٰسین مظہر، سرسید اور علومِ اسلامیہ، علی گڑھ: ادارہ علومِ اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۸۹
۶۶۔ ایضاً، ص ۱
۶۷۔ ایضاً، ص ۱۱
۶۸۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، مطالعاتِ سرسید، لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۹۔۸
۶۹۔ ایضاً، ص ۹
۷۰۔ ایضاً، ص ۲۴۷

باب سوم

سر سیّد احمد خاں کے تعلیمی افکار اور ان پر لکھی گئی کتب کا تنقیدی جائزہ

سرسید احمد خاں ایک کثیر الجہات شخص تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں سیاسی، تعلیمی، ادبی، تحقیقی اور مذہبی غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں حصہ لیا۔ انھوں نے نہ صرف علمی میدان میں اپنا گہرا نقش بٹھایا بل کہ ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ وہ اردو کے اولین معماروں میں تھے۔ تعلیمی معاملات میں ان کے خاص نظریات نے علی گڑھ تحریک کی صورت اختیار کی اور دینیات میں بھی انھوں نے فکر وتصور کے نئے راستے دریافت کیے۔ غرض علم وعمل کے تقریباً ہر شعبے میں ان کی عظیم شخصیت نے مستقل یادگار چھوڑی ہیں۔

سرسید کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اردو زبان وادب سے ان کی دل چسپی سب سے زیادہ رہی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بل کہ اسے غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کے نشو ونما وارتقا میں نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کرایا اور اسے عام فہم، آسان اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان بنایا۔ ان سے پہلے نثر میں عام طور پر مضمون ومعنی کو ثانوی اور طرز بیان کو اولین اہمیت دی جاتی تھی۔ مگر انھوں نے مضمون کو اولیت عطا کی۔ تکلف اور تصنع، بوجھل الفاظ اور عبارات آرائی کے خزف ریزوں سے مالا مال کر دیا۔

سرسید احمد خاں کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت اثر پذیر شخص تھے۔ وہ جس ماحول میں رہے اس کا اثر قبول کیا۔ ان کے رجحانات اور مذاق تصنیف کی پیہم تبدیلیاں یہ بھی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی تصانیف مضامین اور اسلوب بیان دونوں ارتقا اور تغیر کا عجیب وغریب نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ابتدائی اور خاندانی روایات میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے ملازمت شروع کر دی تو پرانی ڈگر سے ہٹ کر وہ مستشرقین یورپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پہلی جنگ آزادی (جسے غدر کا نام دیا گیا) کے بعد ان کا ذہن زندگی کے نئے اور عجیب تر مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی میں مغربی خیالات و رجحانات کو فروغ اس وقت ملتا ہے۔ جب وہ انگلستان کا سفر کرتے ہیں۔ انگلستان کے

سفر کے بعد جو رنگ ان پر چڑھتا ہے وہ اخیر وقت تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اور یہی رنگ انھیں اس صدی کے دوسرے ارباب فکر کے مقابلہ میں خاص امتیاز بخشتا ہے۔ ایک ایسا امتیاز جو زندگی کے نئے رنگ یعنی جدید نظریہ حیات کے پہلے بڑے نمائندہ و شارح تھے۔ دوسرے بہت سے لوگوں نے نہ صرف ان سے اثر قبول کیا بلکہ ان کی پیروی کی۔

پہلی جنگ آزادی (غدر) سے پہلے ان کے اندر دو رجحانات نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ پرانے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور دوسرا یہ کہ انگریزوں سے میل جول کی بنا پر ان کے اندر مغربی طرز زندگی اور جدید خیالات کا کچھ نہ کچھ اثر دکھائی دیتا ہے۔ ریاضی، تاریخ اور تصوف کے علاوہ ان کی تصنیفی زندگی کے دور اول میں ان کی تحریروں میں مناظرہ و تقابل مذہب کا رجحان غالب ہے۔ اس دور میں ان کا نقطۂ نظر علمی اور دینی تھا۔ اس کے علاوہ اس دور میں وہ آثار قدیمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس دور کی خاص خاص تصانیف جام جم، انتخاب الاخوین، جلاء القلوب بذکر المحبوب، تحفۂ حسن، آثار الصنادید، فوائد الافکار، کلمۃ الحق، رہ سنت و رد بدعت، ضمیمہ، کیمیائے سعادت، تاریخ ضلع بجنور اور آئین اکبری کی تصحیح وغیرہ ہیں۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد ان کا تبادلہ بجنور سے مرادآباد ہو گیا۔ اس دور میں وہ مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس الزام سے بچانے کے لیے انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ سرکشی بجنور، اسباب بغاوت ہند اور رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا وغیرہ اہم ہیں۔ اس دور میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی، تبیین الکلام، سائنٹیفک سوسائٹی اخبار (جو بعد میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' ہو گیا) اور رسالہ احکام طعام اہل کتاب وغیرہ بھی لکھیں۔

تیسرے دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے اظہار خیال میں نڈر اور بے خوف ہو گئے تھے اور پبلک کی مخالفت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے ذہن پر جدید انداز فکر نے غلبہ پا لیا تھا۔ انگریزوں کی صحبت و

رفاقت نے جو رنگ ان پر چڑھایا تھا وہ تیز تر اور شوخ ہو گیا تھا۔ اس رجحانات کو ان کی اس دور کی تصانیف میں بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دور کی اہم تصانیف اس طرح ہیں۔ سفر نامہ لندن، خطبات احمدیہ، تہذیب الاخلاق ''ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو'' وغیرہ۔

اس طرح سرسید کے فکر وعمل کے دو ہی اہم میدان تھے ایک مذہب دوسرا سیاست لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی ہر لحاظ سے مسلم ہے۔ ان کے نزدیک علم وادب صرف تفریحی مشغلہ نہ تھا بل کہ ان کے لیے یہ چند مخصوص خیالات وعقائد کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ وہ ادب کو مقاصد زندگی کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔

سرسید احمد کا محبوب مشغلہ تصنیف وتالیف اور مطالعہ تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شعر وادب کی ترقی کے لیے کوشش نہ کرتے۔ اردو نثر ونظم کی خامیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے انھوں نے اہل قلم کو بہت سے مفید مشورے بھی دیئے۔

سرسید کے تعلیمی افکار میں ہمیں جا بہ جا تضاد نظر آتا ہے۔ یوری تہذیب وثقافت سے متاثر ہو کر مغربی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقوام مغرب کی ترقی کا سبب ان کی ترقی یافتہ تعلیم ہے۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ تعلیمی نظام برطانیہ کو ترقی یافتہ شکل میں نہیں بل کہ فطری طور پر نشو ونما کے عمل سے گزر کر حاصل ہوا ہے، اس لیے ہمیں اپنے نظام تعیم کو مغربی نظام تعلیم کی ترقی یافتہ شکل کی روشنی میں نئے سرے سے استوار کرنا چاہیے۔ وہ ایک طرف مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں اور دوسری طرف نئی نسل کے اسلامی کردار کی بھی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ خواتین کی تعیم کے سلسلے میں ان کا معیار بالکل بدل جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر سرسید احمد خاں کے قوم پر بے شمار احسانات ہیں۔ ان میں تعلیمی لحاظ سے قوم کو ایک راستے پر لانا بھی کسی قدر احسان سے کم نہیں۔

یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی ہے

کہ ان کا ادبی سرمایہ خالص ادبی معیار سے قابلِ ذکر ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی انشا پردازی، طرزِ بیان، ان کی نثر اور ان کی مقالہ نگاری، غرض ان کا کل سرمایہ تحریر اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

سر سید کا علمی کارنامہ (۱۹۶۴ء) از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی تالیف سر سید کا علمی کارنامہ ۱۹۶۴ء کو اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سے شائع ہوئی۔

یہ تالیف سترہ حصوں پر مشتمل ہے۔ ''فہرستِ مضامین'' میں پیش لفظ، جامع الصفات ہستی، علمی و فنی دست گاہ، حیاتِ جاوید معلومات کی کان، نئی معلومات پر لکھنے کی ضرورت، عہدِ سر سید کی ایک جھلک، ابتدائی ماحول اور حصولِ علم کی جدوجہد، تشنگی علم بڑھتی رہی، اساتینِ علم و فن کا فیضِ صحبت، شعر و ادب سے ذوق، تصنیفی کارنامے، ابتدائی دور، دورِ وسطیٰ، دورِ آخر، سر سید کا کتب خانہ، اعتماد علی النفس، ضمیمہ (الف)۔ فہرست تصانیفِ سر سید، ضمیمہ (ب) تراجم شائع کردہ سائنٹفک سوسائٹی اور مطبوعاتِ کانفرنس اکیڈمی شامل ہیں۔ یہ تالیف اسی (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

مذکورہ تالیف کا پیش لفظ سید الطاف علی بریلوی نے تحریر کیا، جو چار صفحات پر مشتمل ہے۔ ''جامع الصفات ہستی'' کے زیرِ عنوان سر سید کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے مؤلف رقم طراز ہیں:

> ''کسی قوم میں ایسی جامع الصفات ہستیاں شاذ و نادر پیدا ہوتی ہیں جو اپنی فطری استعداد اور طبعی صلاحیتوں سے اگر ایک طرف بنی نوعِ انسان کے ساتھ نیکی اور بھلائی کر کے ان کو ہر قسم کے فوائد پہنچاتی ہیں اور اپنی اعلیٰ نسانیت اور شرافت کا ثبوت دیتی ہیں! تو دوسری طرف وہ اپنی قوم میں مذہبی، سیاسی، علمی اور عقلی حیثیت سے ایک انقلاب عظیم برپا کر کے ہر قسم کی دینی و دنیوی ترقیوں کی طرف قوم کا رخ پھیر دیتی ہیں۔ ایسے محسنِ انسانیت

ور مصلحِ قوم مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"[1]

سر سید احمد خاں کی تعلیمی، اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بل کہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کے حوالے سے حالی کی "حیات جاوید" بہت بڑا حوالہ ہے۔ ان کے علم و فضل اور مختلف علوم و فنون میں ان کی دسترس اور تصنیف و تالیف ان کو جید عالم ثابت کرتے ہیں۔ ایک ولندیزی عالم کے حوالے سے مؤلف کا خیال ہے کہ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ سے بڑے عالم ہیں اور سر سید کی اسلامی خدمات ان دونوں سے بڑھ کر ہیں۔ بعد ازاں "حیاتِ جاوید کے حوالے سے سر سید کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مؤلف نے سر سید سے متعلق ملنے والی نئی معلومات پر لکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ سر سید کے مذہبی خیالات کے حوالے ہالینڈ کے ایک عیسائی جے۔ ایم۔ ایس پالیون کے مقالے کا حوالہ دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سر سید نے ایک عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے اسلام کے معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو مذہب کی حدود سے الگ تھلگ رکھنا پسند نہیں کیا۔

عہدِ سر سید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مؤلف نے مسلمانانِ ہند کے تنزل اور مغلیہ سلطنت کی تباہی کا ذکر کیا۔ انگریز بہت حد تک غالب آ چکے تھے۔ اسلامی معاشرے کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے دگرگوں حالات میں بھی اسلامی علوم و فنون کا قدیم تعلیمی نظام باقی تھا۔ محدثین، فقہا، حکما، اطبا اور اہلِ فن کی کثرت تھی۔ دہلی میں خاندانِ ولی اللہی اور لکھنؤ میں فرنگی محل کے اربابِ علم کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلمان شرفا وضع داری اور قدیم روایات پر نازاں، ورغمِ ماضی اور فکرِ فردا سے آزاد، آئندہ لیل و نہار سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ وہ حالات تھے، جن میں سر سید کی پیدائش ہوئی۔

بتدائی تعلیم والدہ سے حاصل کی۔ ان کی بسم اللہ سلسلہ نقشبندیہ کے ایک جید عالم حضرت غلام علی نے پڑھائی، جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلیفہ اور سجادہ نشین

تھے۔ سرسید کے والدِ ماجد اور ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے بھی انھی کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی تھی۔ مولوی حمید الدین سے خالقِ باری، کریما، مدن نامہ جیسی فارسی کتب پڑھیں۔ دیگر اساتذہ سے گلستان و بوستان پڑھی۔ عربی زبان کی کتب شرح ملا، شرح تہذیب، مَیبذی، مختصر المعانی اور مطول ما انا قلت پڑھیں۔ علمِ ریاضی کا شوق تھا تو اپنے ماموں سے معمولی درسی کتب، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیئت، آلاتِ رصد میں برجندی، مثل اعمال کرہ، اعمالِ اصطرلاب وغیرہ پڑھیں۔ خاندانی طبیب حکیم غلام حیدر خاں سے مثل قانونچہ، موجز، معالجاتِ سدیدی، شرحِ اسباب اور نفیسی امراض عین پڑھیں۔

"تشنگیِ علم بڑھتی رہی" کے زیرِ عنوان بیان کیا گیا ہے کہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کے بعد مطالعہ کتب کا مشغلہ جاری رہا۔ دہلی کے بعض اساتذہ اور اہلِ علم مولانا صدرالدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، مرزا غالب وغیرہ کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ انتیس برس کی عمر میں جب منصف مقرر ہوئے تو دوبارہ مطالعے کا شوق ہوا تو بہت سی کتب کا مطالعہ کیا۔ خاص طور پر فقہ کی کتب قدوری، شرح وقایہ، الشاسی اور نورالانوار وغیرہ پڑھیں۔ موسوی فیض الحسن صاحب سہارن پوری سے حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقات کے کچھ قصائد پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے حدیث میں مشکوٰۃ شریف، جامع ترمذی کا ایک حصہ اور صحیح مسلم کے بعض اجزا پڑھے پھر قرآن مجید کی سند لی۔

"اساتینِ علم و فضل کا فیضِ صحبت" کے عنوان کے تحت جن علمی و ادبی مجلسوں سے کسبِ فیض کیا، ان مجالس میں مفتی صدرالدین آزردہ، صہبائی، شیفتہ، مومن، غالب، ضیاالدین احمد خاں و دیگران شرکت کرتے تھے۔ مؤلف نے سرسید کی کتاب راہِ سنت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ باتیں تو ان مجالس کی یادگار ہیں، جن کی یاد آنکھوں میں آنسو لاتی ہے۔ کجا وہ صحبتیں، کجا وہ صحبتیں، کہاں وہ آزردہ، کہاں وہ شیفتہ اور غالب و مومن، کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما و صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے۔

''شعروادب سے ذوق'' سر سید کے عہد میں شعروسخن کے چرچے عام تھے، اس لیے سر سید نے بھی کچھ عرصہ شاعری کی اور ''آہی'' تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت میں صرف ہوئی
نہ کچھ خدا کی عبادت ہوئی نہ کچھ بتوں کی چاہ

سر سید کا جی تصنیف وتالیف میں لگتا تھا، اس لیے اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اپنے بڑے بھائی احتشام الدولہ نواب سید محمد خاں کے رسالے ''سید الاخبار'' میں بہت زیادہ لکھا، جس کی وجہ سے انھیں مضامین لکھنے کی کافی مشق اور مہارت ہوگئی۔

''تصنیفی کارنامے'' کے زیرِ عنوان مؤلف نے سر سید کی تصنیفات وتالیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ سر سید کے تصنیفی دور کا آغاز ۱۸۴۰ء میں ہوتا ہے اور اس کا اختتام ۱۸۹۷ء میں سر سید کی وفات پر ہوتا ہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے ریاضیات، قانون، تاریخ، سیاسیات، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام جیسے مشکل لیکن اہم موضوعات پر تقریباً چالیس کتب تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ یہ تصنیفات وتالیفات اور تراجم تین ادوار پر محیط ہیں۔ پہلا دور ۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک محیط ہے، جس میں چند علمی اور مذہبی رسالے لکھے اور ترجمہ کیے۔ دوسرا دور ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ہے، جس میں تاریخی کتب کی تصنیف وتدوین ہوئیں۔ تیسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۷ء تک محیط ہے، جس میں اعلیٰ علمی اور مذہبی تصنیفات وجود میں آئیں۔ دورِ وسطیٰ اور دورِ آخر بہت زیادہ اہم ہیں۔ وسطی عہد میں۔ آثار الصنادید کے ساتھ ساتھ تاریخِ فیروز شاہی، آئینِ اکبری اور تزکِ جہانگیری اس عہد کی اہم تصنیفات ہیں۔ دورِ آخر سر سید کی تصنیف و تالیف کا سنہری عہد کہا جا سکتا ہے۔

''تصانیف'' کے عنوان کی ذیل میں کتب کے عنوانات وموضوعات اور فکروفن کے حوالے سے مختصر ابحاث شامل کی گئی ہے۔ ان کتب میں انتخاب الاخوین، جامِ جم، جلاء القلوب بذکر المحبوب، تحفہ حسن، تسہیل فی جر الثقیل، آثار الصنادید، فوائد الافکار

فی اعمل الفرجار، قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین، کلمۃ الحق، نمیقہ در بیان مسئلہ تصورِ شیخ، سلسلۃ الملوک آغاز کیمیائے سعادت شامل ہیں۔ دوسرے عہد میں تاریخِ بجنور، آئینِ اکبری کی تصحیح، تاریخِ سرکشیِ بجنور، اسبابِ بغاوتِ ہند، تبصرہ بر کتاب مسلمانانِ ہند از ڈاکٹر ہنٹر، تبیین الکلام، تاریخِ فیروز شاہی کی تصحیح اور لغتِ زبانِ اردو شامل ہیں۔

مؤلف تصنیفی و تالیفی عہد کی تقسیم اور پھر کتب کی ترتیب کے حوالے سے ذہنی پراگندگی کا شکار دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ آغاز میں ان ادوار کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ بعد ازاں دو ادوار بنا دیے۔ پہلی تقسیم کے مطابق ''آثار الصنادید'' دوسرے عہد کی تصنیف قرار پاتی ہے، جب کہ دوسری تقسیم کے مطابق پہلے عہد کی تصنیف بنتی ہے۔

''سر سید کا کتب خانہ'' کے عنوان کے تحت سر سید کی لائبریری کے حوالے سے انگریز سوانح نگار کرنل گریہم کی رائے شامل کی گئی ہے۔

''اعتماد علی النفس یا احساسِ برتری'' کی ذیل میں سر سید کے احساسِ تفاخر اور احساسِ برتری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مؤلف کا خیال ہے کہ سر سید کو اپنے علمی کارناموں اور تحقیقات پر بہت اعتماد اور وثوق تھا، اس لیے وہ اپنے خیالات، نظریات اور دلائل پر مصر رہتے تھے، خواہ ان کے خلاف مضبوط اور ٹھوس دلائل ہی کیوں نہ پیش کیے جاتے۔ جس وصف کو مؤلف نے سر سید کی خوبی بنا کر پیش کیا ہے، وہی وصف عام خیال کے مطابق ''ہٹ دھرمی'' کہلاتا ہے۔

آخر میں ضمیمہ (الف و ب) کے بعد مطبوعات کانفرنس اکیڈمی، سعیدہ منزل متصل سر سید گرلز کالج، بی روڈ، ناظم آباد۔ کراچی کا ذکر شامل ہے۔

اس کتاب میں سر سید کے تعلیمی اور علمی کارناموں پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے سر سید کی تمام تر علمی کاوشوں کا احسن طریقے سے احاطہ کیا ہے۔ کتاب دراصل سر سید کی تعلیمی سرگرمیوں کے بیان میں ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ان تمام اداروں کا

تذکرہ کیا ہے جن کا سرسید سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رہا۔

سرسید اور ہندوستانی مسلمان (۱۹۷۹ء) از نورالحسن نقوی

سرسید ور ہندوستانی مسلمان نورالحسن نقوی کی تالیف ہے جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ نے ۱۹۷۹ء کو شائع کیا۔ یہ تالیف دو سو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست میں حرفِ آغاز (نورالحسن نقوی)، مقدمہ (پروفیسر خیلق احمد نظامی، سرسید اور ہندوستانی مسمان، سیاسی نظریات، مذہبی افکار و عقائد، تصورِ تعیم، اصلاحِ معاشرت، نظریہ شعروادب، ادبی خدمات، اسلوبِ نگارش، سرسید کی تصانیف اور مطالعہ سرسید جیسے عنوانات شامل ہیں۔ کتاب کا غالب حصہ سرسید کے علمی اور تعلیمی کارناموں پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی وجہِ تالیف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی اور تعلیمی تحریک کی تاریخ میں سرسید کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ تو ان کے ذکر کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ چناں چہ اہلِ قلم برابر اس طرف توجہ کرتے رہے ہیں لیکن سرسید ایسی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے کہ ان پر کتنا ہی کیوں نہ لکھا جائے تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ کئی برس پہلے راقم الحروف کے دل میں بھی اس موضوع پر کام کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں سرسید کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں مضامین لکھے جو بعض ادبی جلسوں میں بھی پڑھے گئے۔ اب کتابی شکل میں پیش کرتے وقت ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان میں جا بجا ترمیم و اضافہ کیا گیا۔''[۲]

''مقدمہ'' میں خلیق احمد نظامی نے سرسید کے اوصاف کا احاطہ نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔

مؤلف نے ''سرسید اور ہندوستانی مسلمان'' کے زیرِ عنوان سرسید کے اصل

کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف نے حد درجہ عقیدت کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے قوم کو خوابِ گراں سے جگایا، اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا، اسے جذبہ عمل سے روشناس کر کے ادبار سے نکالا۔ ان کے خیال میں اگر نبوت کا سلسلہ باقی ہوتا تو سرسید پیغمبر کے مرتبے پر فائز ہوجاتے۔ اقبال کے نزدیک سرسید کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے آنے والے زمانے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ سرسید کے دیگر کارناموں میں ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کی تصنیف، مسلمانوں کی بہتری کے لیے مسلسل تدابیر کرنا، قیامِ انگلستان کے دوران اڈیسن اور اسٹیل کے رسالوں (اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر) کا مطالعہ کیا تو ان سے بہت متاثر ہوئے تو ان کی طرز پر ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کا فیصلہ کرنا، مخالفت کے باوجود قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کاوشات جاری رکھنا، جدید تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاش کرنا، مذہب اسلام کو درپیش مختلف چیلنجوں سے مردانہ وار نمٹنا، جدید تعلیم سے مذہب کو لاحق خطرات کی نشان دہی اور ان خطرات کو دور کرنے کے لیے مساعی کرنا، سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی اس وقت راہ نمائی کرنا جب کہ مسلمانوں کو باغی قرار دے کر ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، بری رسوم خصوصاً شادی اور غم کے موقع پر مضحکہ خیز رسوم کے تدارک کے لیے اقدامات اٹھانا، جن رسوم کو عین دین سمجھ لیا گیا تھا، بری عادات جیسے تعصب، تنگ نظری، بغض و عداوت، نمود و نمائش، کج بحثی، ماضی پرستی اجداد پر بے جا غرور، خوشامد پسندی، خودغرضی وغیرہ کی روک تھام کے لیے فکری اور عملی سطح پر اقدامات کرنا، اردو زبان و ادب کی خامیوں پر قلم اٹھانا، غزل کے عاشقانہ مضامین، قصائد میں جھوٹ، مبالغہ اور خوشامد جیسے عیوب اور نثر میں عبارت آرائی، لفاظی اور وزن و قافیے کی پابندی سے ہٹ کر نظم و نثر کے عیوب پر سخت تنقید کرنا، اپنے مضامین اور تصانیف کے ذریعے جدید نثر کی بنیاد ڈالنا وغیرہ شامل ہیں۔

''سیاسی نظریات'' کے زیرِ عنوان مسلمانوں کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی (جس میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں شامل

تھیں لیکن ہندو بنیا اپنی عیاری اور چالاکی کے ذریعے انگریز سرکار کا منظورِ نظر ہو گیا اور سارا الزام مسلمانوں پر دھر دیا) کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا زمانہ تھا۔ اس جنگ میں سرسید احمد خاں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انگریزوں کی حمایت کسی خوف یا لالچ کے بجائے جان و مال کے زیاں کا اندیشہ تھا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں یہ شورش ایک سال کے اندر اہلِ ہند کی ناکامی کی صورت میں ختم ہو جائے گی اور انگریز مکمل طور پر برسرِ اقتدار آ جائیں گے۔ فوجی کاروائیوں میں ابتری اور بدنظمی، درباریوں اور افسروں کی انگریزوں سے ساز باز، مشیروں کی نا اہلی اور بد دیانتی، روپے کی کمی، بادشاہ کا خوف زدہ ہونا اور اس بات پر افسوس کرنا کہ باغی کیوں مسلط ہو گئے، جیسے وجوہات سرسید کے پیشِ نظر تھیں۔ یوں انگریز فوجوں سے نبرد آزما فوجیوں کے سامنے واضح مقاصد نہیں تھے جس سے ان میں بے دلی کے آثار بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ غرض انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی اور مسلمان قوم پر ادبار کے بادل چھا گئے:

> ''قوم کی بربادی کے آثار اب چاروں طرف نظر آتے تھے۔ انگریز افسروں کا خیال تھا بجنور میں جو جو لوگ چودھریوں سے برسرِ جنگ رہے ان سب کو باغی قرار دیا جائے۔ سرسید کا اصرار تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی سرکار کا خیر خواہ نہ تھا اور یہ ان کی باہمی جنگ تھی۔ ان کی تجویز تھی کہ سرکاری فوج کے داخل ہوتے وقت جو لاگ مقابلہ کریں صرف وہی باغی قرار دیے جائیں۔ اگر مع نواب محمود خاں سب لوگ حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی نہ مانا جائے۔ بڑی ردوکد کے بعد یہ تجویز منظور ہو گئی مگر احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں نے مقابلے کیے۔ یہ مقابلے نہایت معمولی تھے مگر ہزاروں آدمی مارے گئے بہر حال سرسید کی کوششوں سے یہ ضلع تباہی سے بچ رہا اور بقول حالی ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔ لیکن قوم کی جو تباہی سرسید کے پیشِ نظر تھی اسے دیکھ کر انھیں بہت

تکلیف ہوتی تھی۔''[۱۳]

''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں بغاوت کی اسباب پر سرسید نے روشنی ڈالی ہے اور پرزور دلائل کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کو بغاوت اور شورش کے الزام سے بری کرایا۔ اس حادثے کے منظم سازش ہونے کو تسلیم نہ کیا۔ اسے جہاد تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت کی لاپرواہی، نااہلی اور عاقبت نااندیشی کے سبب پے در پے غلطیاں سرزد ہوتی رہیں اور ان کے انسداد کی کوشش نہیں کی گئی۔ پادریوں کے جارحانہ وعظوں سے چشم پوشی، یتیم بچوں کو پادریوں کے حوالے کرنا، مشنری اسکولوں میں عیسائیت کی تعلیم، پادری ایڈمنڈ کا گشتی مراسلہ جس کے مطابق محکوم رعایا کو زبردستی مذہب عیسائیت کرنے پر زور دینا جس سے ہندوستانیوں کی دل آزاری اور رعایا کی شکایات کا ازالہ تو درکنار شکایتوں کا نہ سنا جانا ہندوستانیوں کو بہت شاق گزرا۔

''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں انگریزوں کے وفادار مسلمانوں کے خیر خواہانہ کارناموں کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف ''اسباب بغاوتِ ہند'' تو دوسری طرف ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' سرسید کی دورنگی یا دورخی کو ظاہر کرتی ہیں۔

نگریزوں کو نصاری کہنے کے باعث بہت سے مسلمانوں کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں کیوں کہ نگریز سمجھتے تھے کہ یہودیوں کی طرح مسلمان بھی انھیں ناصری یعنی قصبہ ناصر یہ کا رہنے والا کہتے ہیں۔ سرسید نے ''تحقیق لفظِ نصاری'' لکھ کر اس غلط فہمی کا ازالہ کیا۔ ''رسالہ احکامِ طعام'' لکھ کر مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ عیسائیوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ ''تبیین الکلام'' کی تصنیف کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ توریت وانجیل کی تفسیر، قرآن وحدیث کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ سرسید تعصب سے بالاتر ہو کر ہندوستانی قومیت کے علم بردار بن گئے تھے۔ ان کے خیال میں انگریز، مسلمان، ہندو، سکھ اور دیگر مذہب کے لوگ صرف ہندوستانی ہیں۔ ان کے ظاہری نام تو صرف مذہب کے باعث ہیں۔ درحقیقت

ایسا تھا نہیں۔

اردو زبان کی حمایت میں سرسید احمد خاں مرتے دم تک کوشاں رہے۔ آخری مضمون جو انھوں نے اردو کی حمایت میں لکھا تھا وہ ان کی وفات سے صرف نو دن قبل شائع ہوا۔ اردو کی مخالفت ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ اردو کے مخالفین کے جارحانہ رویے نے انھیں مشتعل کر دیا تھا، اس لیے وہ حدِ اعتدال سے گزر گئے۔ اس اردو ہندی تنازعے کا سرسید پر اور ان کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کے اندازِ فکر پر گہرا اثر ہوا جس نے ہندوستانی تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ متحدہ قومیت کا تصور ختم ہوگیا ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہب، تمدن اور زبان جیسی تین بڑی رکاوٹیں حائل ہوگئیں۔ کانگریس کی مخالفت سرسید کا ایسا قدام تھا جس کی جتنی ستائش کی جائے، کم ہے۔ بنگال میں سیاسی بیداری کے آثار سب سے پہلے ظاہر ہوئے۔ یہاں سے ایک نظم ''ستارہ مشرق'' اور فرضی مکالمہ مابین فرید الدین ورام بخش ہوا تو سرسید کو ناگوار گزرا کیوں کہ مسلمان پھر سے انگریزی عتاب کا شکار ہو سکتے تھے۔ بعد ازاں ہندو کا تعصب اور تنگ نظری کھل کر سامنے آ گئی۔ نہرو رپورٹ نے ہندو مسلم اتحاد کا پول کھول دیا۔

''مذہبی افکار و عقائد'' کے عنوان کے تحت واضح کیا گیا ہے کہ سرسید مسلمانوں خوش حال اور تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی اصلاح ایڈیسن اور اسٹیل کے رسالوں ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کی طرز پر کرنے کے خواہاں تھے۔ ان دونوں مغربی مفکرین نے اپنا دامن مذہبی مباحث سے بچائے رکھا لیکن سرسید احمد خاں مذہبی مباحث کو نظر انداز نہ کر سکے۔ اس طرح ان کے اصلاحی کاموں کو بھی مسلمانوں میں شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ وقار الملک اور حالی کے ساتھ ساتھ دیگر ہمدردوں نے سرسید کو ٹوکا بھی لیکن وہ کہاں باز آنے والے تھے؟ متنازعہ مذہبی مباحث نے ان کے کردار کو مشکوک کر دیا۔ مذہبی مسائل میں دخل اندازی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں اسلام پر عیسائی مبلغین اور انگریز مصنفین کی جانب سے اعتراضات کیے جا رہے تھے اور تعلیم

یافتہ نوجوان مذہب کی ان باتوں کو ماننے سے انکار پر مصر تھے جو عقل کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ فروعات کے دین سے اخراج کی طرف سرسید نے خصوصی توجہ دی کیوں کہ آغاز میں یہودیوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بہت سی حدیثیں وضع کر کے مشہور کر دیں اور پھر فقہا کی موشگافیوں کے باعث بہت سی جھوٹی باتیں اسلام میں راہ پا گئیں۔ سرسید نے ان غلط رویوں کا تدارک کرنے کی کوشش کی۔ سرسید تقلید کے سخت مخالف تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی ''تقلید'' ہے۔ سرسید اسلام کو دینِ فطرت تسلیم کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن خدا کا قول ہے اور فطرت خدا کا فعل۔ یوں اس کے قول و فعل میں تضاد ممکن نہیں۔

سرسید نے اسلام اور عقل میں تطبیق پیدا کی جوان کا اہم دینی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اسلام کو عقلی معیار پر پرکھنے کی بنیاد ڈالی اگر چہ ان سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی اسلام کو برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے میدان میں لانے کے خواہاں تھے۔ جمال الدین افغانی بھی جدید علوم کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلام کا دفاع کرنا چاہتے تھے۔

معجزات و کرامات سے انکار کے باعث سرسید ہدفِ ملامت بنے کیوں کہ وہ مذہب کو فطرت اور عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں اتنے آگے نکل گئے کہ وہ معجزات اور کرامات کے منکر بن گئے۔ عقل جسے وہ کئی بار ناقص اور نارسا کہنے کے باوجود عقل کی کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد نہ ہو سکے اور ان رکیک لغزشوں کا شکار ہو کر رہے۔

معراج کے حوالے سے وہ تشکیک کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مؤلف رقم طراز ہیں:

> ''معراج کے سلسلے میں مختلف احادیث نقل کر کے سرسید یہ ثابت کرتے ہیں کہ بخاری، مسلم، ترمذی اور ابنِ ماجہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ اسریٰ (مکہ سے بیت

لمقدس تک کا سفر) جسم کے ساتھ اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر روحانی تھا۔دوسری جماعت اول سے آخر تک پورے جسم کے ساتھ مانتی ہے اور تیسری جماعت پوری معراج کو روحانی سفر قرار دیتی ہے۔حضرت عائشہ،حضرت امیر معاویہ اور شاہ ولی اللہ اس آخری جماعت میں شامل ہیں ور سر سید ان کے ہم خیال ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اتنی مختلف روایتوں کی موجودگی میں اگر کوئی شخص جسمانی معراج کا قائل نہ ہو تو اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی حدیث کے دو مطلب نکلتے ہوں اور ان میں سے ایک عقل کے مطابق ہو تو ور دوسرا عقل کے خلاف تو اس مطلب کو قبول کر لینا چاہیے جو عقل کے مطابق ہو۔اس موقع پر وہ ابن رشد کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ اگر عقل ور نقل میں اختلاف ہو تو نقل پر غور کرنا چاہیے۔مسلسل غور اور جستجو سے ضرور کوئی ایسا پہلو نکلے گا جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہو جائے۔''[۱۴]

سر سید ''نبوت'' کو من جانب اللہ خیال کرتے ہیں لیکن نبی نبوت کی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ صلاحیت مسلسل پروان چڑھتی رہتی ہے۔''وحی والہام'' ان کے نزدیک ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔وحی کے بارے یہ خیال کہ یہ وہ پیغام ہے جو فرشتے کے ذریعے نبی تک پہنچایا جاتا ہے اور الہام خدا کا وہ پیغام ہے جو کسی واسطے کے بغیر انسان کے دل میں آتا ہے۔سر سید کے خیال میں وحی بھی الہام ہے جو نبی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔وحی کے بارے میں ان کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ صرف نبیوں تک محدود نہیں بل کہ فیضِ خداوندی ہے جس سے کوئی بھی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ وحی والہام جس کا تعلق روح کی تربیت اور اخلاقی تعلیم اور انسان کی انسانیت یا دوسرے الفاظ میں مذہب سے ہے وہ انھی ہستیوں سے مخصوص ہے جن کے اندر ملکہ نبوت موجود ہوتا ہے۔یہ متضاد خیالات سر سید کے نظریات کو کم زور بنا دیتے ہیں۔

کتاب اللہ سرسید کے نزدیک کوئی پہلے سے بنی بنائی کتاب نہیں۔ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب پہلے سے تیار نہیں ہوتی بل کہ حسبِ ضرورت نبی کے دل میں سوال پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اللہ کی طرف سے جواب ملتے رہتے ہیں۔ ثبوت یہ کہ قرآن ایک ساتھ نازل نہیں ہوا بل کہ وقت کے تقاضے کے مطابق آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہیں۔

روح کا وجود سرسید کے نزدیک ایک حقیقت ہے لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں کہ انسان اس حقیقت سے شناسا بھی ہوسکتا ہے۔ روح کو سرسید ایک لطیف پیکر اور ایک مستقل بالذات جوہر تسلیم کرتے ہیں جس کا فنا ہونا ممکن نہیں، البتہ شکل وصورت بدل سکتی ہے۔ چناں چہ ان کا عقیدہ ہے کہ حشر کے دن جب روحیں اٹھیں گی تو وہ اپنا ایک لطیف جسم رکھتی ہوں گی۔

مسئلہ جبر وقدر کا نظریہ اختلافی نوعیت کا رہا ہے۔ سرسید کا اس بارے میں خیال ہے کہ یہ ایک تمدنی، طبعی اور عقلی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک اسے کلامِ پاک میں تلاش کرنا غلط ہے۔ ان کی رائے ہے کہ قرآن میں خدا نے جہاں اپنے اختیار کا ذکر کیا ہے وہاں اپنی معبودیت کا بیان مقصود ہے۔ انسان کے مجبور ہونے کی طرف اشارہ نہیں۔ اس طرح جہاں یہ کہا گیا کہ انسان اپنے اعمال کی سزا پائے گا وہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ انسان مختار ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی خلقت اور جبلت اس کے افعال کی ذمہ دار ہے اور انسان میں نیک وبد کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت موجود ہے جسے نورِ قلب اور نورِ فطرت کہا جاسکتا ہے تو وہ معتزلہ کے نزدیک آجاتے ہیں اور انسان کو اپنے افعال کا مکلف قرار دیتے ہیں۔ سرسید کے خیال میں انسانی عمل کا مدار تین چیزوں پر ہے۔ ایک؛ خارجی اسباب، دوسری نظامِ جسمانی کی مختلف کیفیتیں اور حالتیں اور تیسری؛ انسانی ارادہ۔

قصہ آدم، ملائکہ، شیاطین، سرسید کے خیال میں تماثیل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کی ملکوتی قوتوں کو ملائکہ اور حیوانی ونفسانی خواہشات کو شیاطین کا نام دیا گیا ہے۔

ان کے خیال میں شیطان کا انسان سے باہر کوئی وجود نہیں۔ اجنہ سے وہ ایک قوی ہیکل قوم مراد لیتے ہیں اور ثبوت کے لیے قرآن میں مذکور قصہ سلیمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جنت اور جہنم ان کے نزدیک استعارے ہیں اور جزا و سزا محض روحانی کیفیتیں۔ حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا، آسمان سے من وسلویٰ اترنا، فرعون کا غرقِ دریائے نیل ہونا، حضرت موسیٰ کا خدا سے ہم کلام ہونا اور ان کے عصا کا اژدہا بن جانا، یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں سرسید ان کے ظاہری معنی میں قبول نہیں کرتے بل کہ وہ معنی اخذ کرتے ہیں جو قرینِ عقل ہیں۔

عیسائی مبلغین اور سرولیم میور کے اسلام پر اعتراضات کے مسلمانوں کی جانب سے جوابات کو سرسید محض برائے جواب ہی گردانتے ہیں کیوں کہ ان اعتراضات کے جوابات قطعاً کسی کو معلوم ہی نہیں تھے۔ جیسے ایک بار ایک پادری نے سانحہ کربلا پر اعتراض کیا کہ جب حضرت محمد سرورِ انبیا ﷺ تھے تو خدا تک ان کی رسائی چنداں دشوار نہیں تھی اور جب کربلا میں ان کا چہیتا نواسا دشمنانِ اسلام کے نرغے میں تھا تو وہ خدا کے پاس فریاد کیوں نہ لے کر گئے اور خدا نے فرشتوں کی فوج بھیج کر حضرت امام حسین کی مدد کیوں نہ کی۔ مسلمان مولوی نے جواب دیا کہ جی ہاں ہمارے پیغمبر فریاد لے کر اللہ میاں کے پاس گئے تھے مگر اللہ میاں ان کی بات سن کر رو پڑے اور بولے کہ میں کیا کروں؟ میرے تو سگے بیٹے کو یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے جواب محض برائے جواب ہوتے تھے اور عوام ان سے محظوظ ہوتے تھے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس زمانے میں اس ''اینٹ کا جواب پتھر'' نے بڑا کام کیا اور عام مسلمانوں کو یہ یقین دلانے میں مدد کی کہ انھی کا دین سچا دین ہے۔

'خطباتِ احمدیہ' سرسید کا نہایت وقیع اور قابلِ قدر کارنامہ ہے جس میں انھوں نے سرولیم میور کے ہر اعتراض کا مکمل اور مدلل جواب دیا ہے۔ اس کتاب کو نہ صرف ہندوستان میں سراہا گیا بل کہ انگلستان میں بھی اس کو بڑی پذیرائی ملی۔ خاص طور پر

انصاف پسند عیسائی مصنفوں نے اس کوشش کو بہت سراہا۔ ذیل میں ایسے مصنفین کے تعریفی کلمات درج کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سرسید احمد خاں کو کافر، ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ (Dr. W Hooper, Divinity College Lahore)

۲۔ کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب شائع کی ہو۔ (آرنلڈ کا اعتراف)

۳۔ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرین کتاب میں بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے سے اتفاق کریں گے۔ (کرنل گریہم)

۴۔ تحقیق کا میدان ولیم میور کے ہاتھ سے ایسا گیا ہے کہ اب کبھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ (بہ قول بعضے مصنفین)

سرسید کو طلاق کے فلسفہ اسلام پر اعتراض ہے کہ اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دے کر عورت کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ تعدادِ ازدواج کو سرسید فطری تو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عدل صرف روٹی کپڑے میں نہیں بل کہ سب بیویوں سے یکساں محبت کرنے میں بھی ہونا ضروری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے کثرتِ اولاد کو روک دیا ہے۔ جہاد اور غلامی کے حوالے سے سرسید نے مدلل انداز میں جواب دیے ہیں۔

سرسید کے مذہبی عقائد کے بارے میں منفی تاثر کو مؤلف نے قیاس آرائیوں پر مبنی قرار دیا ہے۔ انھیں دہریہ، نیچری، کافر، ملحد، اور کرسٹان کہنا کسی صورت درست نہیں۔ اس کے لیے سرسید کی ایک تحریر کا خلاصہ درج کیا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

"خدائے ذوالجلال ازلی ابدی خالق وصانع تمام کائنات کا ہے، قرآن مجید بلاشبہ کلامِ الٰہی ہے اور جس قدر کلامِ الٰہی نبی اکرم پر نازل ہوا وہ سب

محفوظ ہے۔اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوسکتی جو خلافِ حقیقت یا خلافِ
واقعہ ہو۔جہاں ایسا شبہ ہوتا ہے وہاں یا تو ہم سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں
غلطی ہوئی ہے یا پھر اس حقیقت یا واقعہ کو ہم نے غلط سمجھا ہے۔رسول
کریم ﷺ کے سوا کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس کا قول و فعل رسول ﷺ کے
قول و فعل کی سند کے بغیر دینی معاملات میں قابلِ تسلیم ہو اور جس کے تسلیم
نہ کرنے سے کفر لازم آتا ہو۔اس کے برخلاف اعتقاد رکھنا شرک فی النبوت
ہے۔دینیات میں سنتِ نبوی ﷺ کی اطاعت پر ہم مجبور ہیں لیکن دنیوی
مور میں مجبور نہیں۔احکام منصوصہ احکام دین بالیقین ہیں اور باقی تمام
جتہادی و قیاسی مسائل سب ظن ہیں۔انسان ایمان پر اس لیے مکلّف ہے
کہ وہ عقل رکھتا ہے۔اس لیے لازمی ہے کہ وہ احکام جن پر نجات کا مدار ہے
عقل انسانی سے خارج نہ ہوں۔جن کاموں کے کرنے کا انسان کو حکم
دیا گیا وہ اچھے اور جن سے باز رہنے کو کہا گیا وہ برے ہیں اور پیغمبران کا حسن
و قبح بتانے والے ہیں۔مذہب اسلام کے تمام احکام مطابق فطرت
ہیں۔جو قویٰ خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کیے ہیں ان میں وہ بھی ہیں
جو انسان کے کسی فعل کے ارتکاب کے محرک ہوتے ہیں اور وہ بھی جو اس فعل
کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ان تمام قویٰ کے استعمال پر انسان مختار ہے
مگر ازل سے خدا کے علم میں ہے کہ فلاں انسان کن کن قویٰ کو کس طرح
کام میں لائے گا۔احکامِ دین الٰہ کی طرف سے ہیں اور ان کی دو قسمیں
ہیں۔ایک وہ جو دین کے اصلی احکام ہیں اور فطرت کے مطابق
ہیں۔دوسرے وہ جن سے ان اصلی احکام کی حفاظت مقصود ہے مگر اطاعت
ور عمل میں ان دونوں کا درجہ برابر ہے۔رسول خدا کے تمام افعال و اقوال
سچائی پر مبنی تھے،مصلحتِ وقت کی نسبت رسول کی طرف سخت بے ادبی ہے
جس میں خوفِ کفر ہے،مصلحتِ وقت سے وہ مراد ہے جو عام لوگوں نے

مصلحتِ وقت کے معنی سمجھے ہیں۔یعنی ایسے قول یا فعل کو کام میں
لانا جو درحقیقت بے جا تھا مگر مصلحتِ وقت کا لحاظ کر کے اس کو کہہ
دیا یا کرلیا۔'' ۵؎

''تصورِ تعلیم'' کے زیرِ عنوان سرسید کے تعلیمی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں اور ہندوؤں نے تعلیمی ادارے قائم
کرنا شروع کر دیت تھے لیکن مسلمان چوں کہ مشقِ ستم ٹھہرائے گئے تھے اور پس ماندہ
رہ گئے تھے۔انگریزی سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی تھی،اس لیے ہندوستان
کے مختلف گوشوں سے آوازیں اٹھنے لگیں کہ انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے پر تل
گئے ہیں۔مسلمان اس معاملے میں سب سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔جدید
تعلیم سے متنفر ہونے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اب تک انھوں نے جس سرزمین پر بھی قدم
رکھا،ایک فاتح کی حیثیت سے رکھا اور اپنے علوم وفنون کو رائج کیا تھ۔یہ پہلی بار تھا کہ
مسلمانوں کو کسی فاتح قوم سے سابقہ پڑا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ جب انھیں کسی اور کی
زبان اور ان کے علوم سیکھنا پڑتے تھے جو انھیں کسی صورت قبول اور گوارا نہیں تھا۔
جدید تعلیم سے بے زاری مسلمانوں کو پس ماندہ کرتی چلی گئی۔

آغاز میں تو سرسید نے ہندو اور مسلمانوں دونوں کی تعلیم پر زور دیا لیکن بہت جلد
ان کا تصورِ تعلیم بدلا اور وہ مسلمانوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر سمجھنے لگے۔راجا رام
موہن رائے پہلے شخص تھے جنھوں نے جدید تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔قدیم علوم
اور پرانے نظامِ تعلیم کو انھوں نے فضول،مضر اور جہالت کی تاریکی میں اضافہ کرنے
والا بتایا۔سرسید کی بھی یہی رائے تھی۔اور جدید عوم کی اہمیت سے وہ شروع ہی سے
واقف تھے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے پر رضامند نہ ہوں گے۔یہی
وجہ تھی کہ وہ انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔سوسائٹی اسی مقصد کے
لیے قائم کی گئی تھی۔آگے چل کر انھوں نے ایک ورنیکلر یونی ورسٹی کی تجویز بھی پیش
کی۔ان کی خواہش تھی کہ یونی ورسٹی میں ایک ایسا شعبہ قائم کیا جائے جس میں اہم علوم

وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے اور اس میں تعلیم پانے والوں کو باقاعدہ امتحان کے بعد دیسی ہی سندیں دی جائیں جیسی انگریزی تعلیم پانے والوں کو دی جاتی ہیں۔اس تجویز کے ساتھ یہ پیش کش بھی کی گئی تھی کہ انگریزی کتابوں کا ترجمہ کرانے کی ذمہ داری لینے کو سائنٹیفک سوسائٹی تیار ہے۔اس تجویز کو پسند کیا گیا اور سائنٹیفک سوسائٹی کی پیش کش کو سراہا گیا لیکن عذر یہ پیش کیا گیا کہ دیسی زبان میں درسی اور امدادی کتب کا ایسا ذخیرہ موجود نہیں ہے کہ یہ منصوبہ بروئے کار لایا جاسکے۔

سرسید کو ایک بار اندازہ ہوا کہ حکومت پنجاب یونی ورسٹی کو ورنیکلر یونی ورسٹی بنانا چاہتی ہے تو انھوں نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا۔کیا وہ ٹٹی ہمارے سامنے پھر گاڑی جاتی ہے؟ چند عاقبت نااندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے مگر دوراندیش آدمی ان تمام باتوں سے رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس ومایوسی سے گورنمنٹ کی اور ان یورپین اعلیٰ درجے کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک ہیں دیکھتے ہیں۔شاید حکومت کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لیے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لیے پتلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت بھی یہی مسئلہ درپیش تھا کہ مشرقی علوم کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے؟ بہ ظاہر تین صورتیں قابلِ عمل تھیں۔قدیم علوم وفنون کو برقرار رکھا جائے،صرف جدید علوم کی طرف توجہ کی جائے یا پھر دونوں کی پیوند کاری کی جائے۔مضامین کی کثرت نے تیسری صورت کو ناممکن بنا دیا تھا اور قدیم وجدید کے معاملے میں سرسید کا نقطۂ نظر بہت پہلے واضح ہو چکا تھا۔پھر بھی اس کالج میں قدیم علوم اور جدید علوم کے دو شعبے الگ الگ قائم کیے گئے۔جدید علوم کا شعبہ برابر ترقی کرتا رہا لیکن قدیم علوم کا شعبہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

سید محمود کو یہی شکایت رہی کہ اس شعبے کو نظر انداز کر دیا گیا۔
ذریعہ تعلیم کے مسئلے پر سرسید نے بہت غور و فکر کیا اور وقتاً فوقتاً اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔ ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں سے پتا چلتا ہے کہ اس بارے میں ان کی رائے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔ سعید احمد اکبرآبادی بھی شاکی رہے کہ سرسید کے نظریات تعیم کے بارے میں بدلتے رہے اور وہ کسی ایک نظریے پر ٹک نہ سکے۔ شروع میں تو وہ دیسی زبان میں تعلیم و تدریس کے حق میں تھے اور بڑی شدو مد کے ساتھ اس کی وکالت کرتے تھے، جب یہ خیال دل میں راسخ ہو گیا کہ انگریزی کو ذریعہ تعیم بنائے بغیر چارہ نہیں تو انھوں نے اتنی ہی شدت سے اس کی موافقت میں اظہارِ خیال کیا۔ غرض یہ کہ زمانے کی رفتار کو دیکھ کر سرسید نے نظامِ تعلیم اور ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں اپنے موقف میں تبدیلی کی۔
تعیمِ نسواں کی طرف سرسید نے اتنی توجہ نہ دی جتنی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ وہ سب سے پہلے لڑکوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے بعد ازاں محمڈن کالج سے تعلیم پانے والوں نے تعلیمِ نسواں کی طرف توجہ دی اور اس سرزمین پر لڑکیوں کی تعلیم کے معقول اسباب مہیا ہو گئے۔ جب زنانہ ہاسٹل اور گرلز کالج قائم ہوا تو تعیمی نضا نسبتاً بہتر تھی۔ لیکن اعتراضات پھر بھی کیے گئے۔ پس ماندہ طبقے کی تعیم کے بارے میں سرسید نے جو رویہ اختیا کیا وہ قابلِ ستائش نہیں اور بہ ظاہر ناقص معوم ہوتا ہے۔ ایجوکیشن کمیشن کے اس سوال پر کہ آیا ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگ اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری اداروں میں دی جاتی ہے وہ ان کے بچوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا تھا کہ: ان کو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔ تعلیم میں سرکاری مداخلت کے وہ سخت خلاف تھے۔ ان کا خیل تھا کہ جب تک لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں

تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ۔ پھر جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے اور شائستگی اور تربیت تک پہنچو گے تب تمھاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریوں کی لالچ کی کچھ بھی حقیقت معلوم نہیں ہوگی۔ امید ہے کسی نہ کسی دن ایسا ہوگا۔

کل ہند نظامِ تعلیم کا نظریہ بھی سرسید نے پیش کیا۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں سرسید کی خواہش تھی کہ ملک کے گوشے گوشے میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

''اصلاحِ معاشرت'' کے عنوان کے تحت مسلمانوں کے زوال، ان کی اقتصادی بد حالی، جہالت، فروعات کو عین دین سمجھ بیٹھنا، تقلید پرستی، غلط رسوم و رواج، کاہلی، خوشامد، ریاکاری، تعصب، بحث و تکرار، آدابِ خورونوش سے غفلت، قومی نفاق، ظاہر داری، ناشائستہ گفت گو، مصنوعی زبان اور دیگر بے شمار عیوب کی نشان دہی کی گئی ہے اور بعدازاں اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالوں اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا سرسید نے کیا جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۷ء تک برابر نکلتا رہا اور اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ اس رسالے کے ذریعے معاشرتی اصلاح، آزادیِ رائے، مذہبی عقائد کی درستی، تعلیم کی اشاعت و فروغ، قدیم علوم سے اجتناب، خواتین کی تعیم، صدقِ مقال، ضبطِ اوقات، طرزِ گفت گو، صفائی اور لباس، تجارت کی ترقی، دین اور دنیا کا الحاق، دنیا سے بے تعلقی، عبادت کا مفہوم، رجائیت پسندی، خود اعتمادی، قومی ترقی، کامیابی جیسی اعلیٰ خصوصیات کو پروان چڑھانے پر زور دیا گیا۔

تہذیب الاخلاق کا اصلی مقصد قوم کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا بل کہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک کا پیدا کرنا تھا۔

''نظریہ شعر و ادب'' کی عنوان کے تحت یہ صراحت کی گئی ہے کہ سرسید شعر و دب کے بارے میں اپنے نظریات کو ربط اور تسلسل کے ساتھ بیان نہ کر سکے، اس لیے انھیں باضابطہ تنقید نگار کہنا مشکل ہے لیکن وہ اردو کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے شعر و نثر

کے مسائل پر اتنی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ غور کیا، اس کی خامیوں اور خرابیوں کی نشان دہی کی؛ ان کو دور کرنے کی تدبیریں بتائیں۔ اہلِ قلم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان تدبیروں پر عمل کریں حالی نے پہلی بار شرح و بسیط کے ساتھ شاعری کے بارے میں اپنے خیالات ایک طویل مقالے یعنی مقدمہ شعر و شاعری کی شکل میں پیش کیے۔ نثر میں غالب کی زندہ نثر کے علاوہ کوئی خاص کام دکھائی نہیں دیتا۔ اردو شاعری سے سرسید سخت بیزار تھے اور اس میں مبالغہ آرائی، عبارت آرائی کے سخت مخالف تھے اور اردو شعر کو ''نیچرل شاعری'' کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں نیچرل شاعری سے شاعری مراد ہے جو معنی اور انتخاب الفاظ کے لحاظ سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے مطابق ہو۔ بہ اعتبار معنی شاعری کے نیچرل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بات امر واقعہ کے خلاف نہ بیان کی جائے جس قسم کے واقعات دنیا میں واقعتاً رونما ہوتے ہیں انھیں موضوع شعر بنایا جائے۔ بیان کے لحاظ سے شاعری کے نیچرل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش اس زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیوں کہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر ان نیچرل سمجھ جائے گا۔ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنے کو سرسید بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے اور ادائے مطلب میں سہولت رہتی ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ اردو میں عربی، فارسی اور انگریزی زبان کے الفاظ کو خاص طور پر داخل کیا جائے۔

سلوب کی شناخت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے کہ یہ تحریر فلاں شخص کی ہے۔ گویا الفاظ کے انتخاب، محاوروں کے استعمال، فقروں اور جملوں کی ساخت سے قلم کار کو پہچان لیا جاتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ

لکھنے والا ایک ہی قبیل کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتا رہے، جب کوئی مصنف مختلف اور متنوع مضامین پر قلم اٹھاتا ہے تو ہر جگہ یکساں اسلوب برقرار نہیں رہ سکتا۔ سر سید افادی ادب کے علم بردار تھے۔ وہ ادب کو محض وقت گزاری کا ذریعہ اور دل بہلانے کا وسیلہ نہیں مانتے تھے۔ اس بات پر وہ یقین رکھتے تھے کہ ادن سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں مدد لی جا سکتی ہے، قوموں کے اخلاق درست کیے جاسکتے ہیں اور خواب غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو جگایا جاسکتا ہے۔

''ادبی خدمات'' کے عنوان کی ذیل میں سر سید کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے ساتھ ساتھ انھیں سراہا بھی گیا ہے۔ تصنیف وتالیف کا شوق اور سلیقہ جس قدر سر سید میں تھا، ویسا شوق اور سلیقہ شاید ہی کسی اور مصنف کے ہاں دکھائی دیتا ہو۔ نو عمری سے ہی سر سید کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں کے رسالے ''سید الاخبار'' سے ذوقِ تصنیف پروان چڑھا اور ۱۸۴۲ء کو رسالہ ''جلاء القلوب بذکر المحبوب'' سے تصنیفی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں آثار الصنادید کے علاوہ چند رسائل تصنیف کیے تھے۔ بعد ازاں تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء) رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند (۱۸۵۹ء) لائل محمڈنز آف انڈیا (رسالہ خیر خواہانِ مسلمان ۱۸۶۰ء) توریت وانجیل کی تفسیر ''تبیین الکلام (۱۸۶۲ء) زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام بھی بڑا کارنامہ ہے۔ سفرِ انگلستان کے بعد تہذیب الاخلاق (۱۸۶۹ء) کا اجرا قوم کی اصلاح کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

''اسلوبِ نگارش'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ سر سید کا طرزِ تحریر ہمارے ادب کا ایسا موضوع ہے جس پر مختلف آرا کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ ایک طرف سر سید کو ''جدید نثر کا معمارِ اول'' کہا گیا تو دوسری جانب ان کی نثر کو بے مزا، پھسپھسا، کرخت اور ناخوشگوار بھی بتایا گیا۔ وہ یہ ہے کہ اسلوب (Style) کے مسئلے پر بہت کم

غور کیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے ادب پر شاعری اور خاص طور پر غزل کا غلبہ رہا ہے۔ غزل ہمارے مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم ادب کی ہر صنف میں غزل کی خصوصیات تلاش کرتے ہیں۔ ناول و افسانہ ہو، کوئی علمی یا تنقیدی مضمون ہو، ہم اس کے جملوں میں شعر کی خوبیوں دریافت کر کے رمز و ایما یا ترصیعی نوعیت کا استعارہ تلاش کر کے وجد کرنے کے خوگر ہیں۔ ابھی تک ہماری نثر کے مجموعی حسن تک آسانی سے نہیں پہنچتی۔ ہم شبلی، محمد حسین آزاد اور مہدی افادی کی نثر پر جھوم سکتے ہیں مگر حالی، سرسید اور عبدالحق کی نثر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔

سرسید کے اسلوب میں بعض معائب بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کی نثر کے محاسن، ان معائب پر حاوی نظر آتے ہیں۔ ان کی نثر کے محاسن میں انگریزی زبان کے الفاظ کا خوب صورت استعمال، متروکات سے اجتناب، عظمت و جسامت پسندی، اسلوب کی ہمہ رنگی، طنز و ظرافت شامل ہیں۔ بعد ازاں غالب اور سرسید کی نثر کا تقابل کیا گیا ہے۔ سرسید کی نثر ایسی ہے کہ جسے پڑھتے ہوئے مفہوم قاری یا سامع تک منتقل اور الفاظ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ غالب کی نثر میں بالفاظ آسانی سے اپنا وجود کھونے پر راضی نہیں ہوتے۔ ان کی نثر ادبی نثر ہے۔ استعارے سے دونوں نے کام لیا ہے مگر غالب کے استعارے ترصیعی ہیں اور سرسید کے توضیحی۔ غالب کی ادبی نثر ذہن کو انبساط دیتی ہے تو سرسید کی علمی نثر ذہن کو روشنی عطا کرتی ہے۔ دونوں کے میدان جداگانہ ہیں، دونوں کی ضرورتیں مختلف ہیں، اس لیے دونوں کا پیرایہ اظہار بھی الگ الگ ہے۔ موضوع اپنا اسلوب خود تلاش کر لیتا ہے چناں چہ دونوں کے موضوعات نے اپنے لیے مناسب طرزِ اظہار کا انتخاب خود کر لیا۔

آخر میں ''سرسید کی تصانیف'' کی ذیل میں سرسید کی کتب اور ''مطالعہ سرسید'' کے عنوان کے تحت سرسید پر تنقیدی کتب شاملِ کتاب ہیں۔

اردو کی علمی ترقی میں سرسید اوران کے رفقائے کار کا حصہ (۱۹۸۴ء)

از اے۔ایچ کوثر

اے۔ایچ کوثر کی تالیف اردو کی علمی ترقی میں سرسید اوران کے رفقائے کار کا حصہ ۱۹۸۴ء میں لائبریری پروموشن بیورو، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۲۱۔جامعہ کراچی سے شائع ہوئی۔یہ تالیف ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تالیف ''تفصیل موضوعات'' کے زیر عنوان فہرست مرتب کی گئی ہے۔
مصنف نے اپنی تصنیف کے مقصد کا تعین کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''میرے پیش نظر صرف یہ نہیں ہے کہ اس دور کے علمی کارناموں کا جائزہ پیش کیا جائے بل کہ یہ بھی ہے کہ اس فکری انقلاب کی تاریخ بھی لکھی جائے جس نے اردو ادب کو سب سے زیادہ امتیازی حیثیت بخشی اور یہ بتایا جائے کہ مختلف لوگوں میں سرسید اوران کے رفقا نے کس طرح نئے اور انقلابی فکار پیش کرکے اردو زبان کو علمی اعتبار سے غیر معمولی ترقی دی اور اسی کے ساتھ اردو بولنے والی قوم کو بھی زندہ کیا۔دراصل اس دور کا یہ فکری انقلاب ہمیت کے اعتبار سے اس کے علمی کارناموں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔کیوں کہ اسی کے توسط اوراسی کی روشنی میں آئندہ اعلیٰ درجے کے علمی کام کی بساط تیار ہوئی۔اس دور کے بعد جو علمی کام ہوا اس میں لوگوں نے بڑی حد تک اسی دور سے انشرح اور الہام حاصل کیا اور بہت سے ایسے شعبے ہیں جن میں سرسید اوران کے رفقا کی علمی رہنمائی کو اردو زبان میں دوام کی حیثیت حاصل ہوگئی اوران لوگوں کو ابھی تک اپنے اپنے فن میں امام ورموجد کی حیثیت حاصل ہے۔میں نے اس مقالے میں انھیں پہلوؤں کو واضح اور روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۲]

باب اول کا عنوان ''سرسید سے پہلے اردو کا علمی ورثہ'' ہے، جس میں (الف) کے

تحت، اردو کی ابتدا۔ سلطنتِ دہلی۔ سلطنتِ بہمنیہ کا زوال۔ صوفیاے کرام اور اردو۔ عین الدین گنج العلم۔ قلی قطب شاہ۔ مولانا عبداللہ۔ مخدوم جہانگیر سمنانی۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ ولی اللہ۔ شیخ محمود۔ اردو پر مذہب کے اثرات۔ (ب) کی ذیل میں اردو سے دوسری زبانوں میں تراجم، اردو میں تراجم، اردو میں تخلیقات، غیر ملکی مصنفین اور اردو (ج) کے مندرجات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور اور اردو، اورینٹل سیمنری (۲) فورٹ ولیم کالج، قیام، مقاصد، عملہ، تصنیفات، مصنفین، اتالیق ہندی کی آسان مشقیں، معلم ہندوستانی، بیاضِ ہندی، عملی خاکے، ہندی عربی آئینہ، قصصِ مشرقی، گل کرائسٹ، میر امن، میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میرزا علی لطف، مرزا کاظم علی جواں، امانت علی شیدا، مظہر علی خاں ولا، شیخ حفیظ الدین احمد، خلیل علی خاں اشک، مولوی اکرام علی منشی، بینی نارائن، حمید الدین بہاری، انشا اللہ خاں انشا، عبداللہ ہاشمی، سراج الدین علی خاں آرزو، منشی محمد ابراہیم، شاہ اسماعیل شہید (د) دہلی کالج۔ قیام، مقاصد، ایجوکیشنل کمیٹی، ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی، دلی کالج اساتذہ، مولوی مملوک علی، ماسٹر رام چندر، پیارے لال آشوب، مولوی ذکاءاللہ، مولوی کریم الدین، شیو نارائن، مدن گوپال، سبحان بخش، حسن علی خاں، نور محمد، دہلی کالج کی تصانیف شامل ہیں۔

باب دوم ''سرسید کا سیاسی اور تہذیبی پسِ منظر'' کے زیرِ عنوان تشکیل دیا گیا ہے، جس کی ذیل میں سیاسی، تجارتی، تعلیمی، لارڈ ولزلی رزولیوشن، نصابِ تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ، سنسکرت کالج بنارس، فورٹ ولیم کالج، اینگلو انڈین کالج، جے نرائن کالج، آگرہ کالج، دہلی کالج، لارڈ میکالے، لارڈ ولیم بینٹنگ، انگریزی تعلیم، تعلیمی پالیسی، تحریکِ آزادی کے اسباب، تحریکِ آزادی کا پسِ منظر، ناکامی کے اسباب، مسلمانوں کا زوال، سرسید احمد خاں، پیدائش، خاندانی حالات، انگریزوں سے مصالحت، رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند، عیسائی مشنری کے مبلغین، مسلمانوں کی ملازمت کے مسائل، Legislative کونسل میں مسلمانوں کی شرکت کی تجویز، ۱۸۲۷ء کا تعلیمی کمیشن،

انگریزی کے ساتھ دیسی زبانوں کی تعلیم کی اہمیت، جدید تعیم کی اہمیت جیسے ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

باب سوم میں ''سرسید احمد خاں کی علمی تحریک کے مقاصد اور طریقہ کار'' کے عنوان کے تحت (الف) سرسید احمد خاں کی علمی تصانیف وتالیف، مقالات خطبات علی گڑھ تحریک کا مقصد، سرسید احمد خاں کی ابتدائی تعلیم وتربیت، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت، انگریزوں اور مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت اور کوشش، قومی اصلاح، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، سماجی، اقتصادی، مقصدی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے اسباب اور غلط فہمیوں کا ازالہ، تصانیف، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام، انڈین نیشنل کانگرس کا قیام، اردو، فارسی، دیوناگری رسم الخط، البرٹ بل، یونائیٹڈ انڈیا، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن مبدل بہ محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کا قیام اور مقصد، آثار الصنادید، جدید تعلیم کی اہمیت، اصلاح معاشرت میں تعلیم کا کردار، مسلمانوں کی مذہبی عدم واقفیت اور مذہبی شعور کی ضرورت، مذہب اور عقلیت جدید سائنسی نظریہ، اسلام اور اس کی مخالفت، مسلمانوں کے انحطاط کا سبب، مذہبی وعلمی تعصب، (ب) علمی تحریک کا معاشرتی واخلاقی مقصد اسلامی معاشرت میں اضافی رسم ورواج کی شمولیت اور ان کی اصلاح کی ضرورت، اخلاق کی اہمیت وضرورت، علوم دین ودنیاوی کی ضرورت، رسم ورواج، اخلاق، کردار کی اصلاح۔ (ج) سرسید کی علمی تحریک کا عملی طریقہ کار، علوم جدیدہ کی تحصیل کا تعلیمی وعلمی اقدام، مدرسہ غازی پور کا قیام، انگریزی زبان کی واقفیت کی ضرورت، جدید تعلیم کی تحصیل دیسی زبان کے ذریعہ، سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام اور مقاصد، التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان درباب تعلیم اہلِ ہند، لٹریری اور علمی کتابوں کا ترجمہ کروانا، اردو اور انگریزی زبان میں اخبار کی اشاعت قومی مغائرت، مذہبی تعصب کو ختم کرنا، غازی پور سے علی گڑھ تبادلہ، سائنٹیفک سوسائٹی کا عملہ، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سیاسی اخلاقی، معاشرتی اور علمی مسائل پر مضامین کی اشاعت، علی گڑھ سے بنارس تقرری، اردو تراجموں پر سر ولیم میور کا انعام کا اعلان، علمی مذاق کا فروغ،

اردو لٹریچر کی تاریخ، اردو لغت، سائنٹیفک سوسائٹی کی ترجمہ شدہ کتابیں، سفر انگلستان، تعلیمی اداروں کا مکمل جائزہ، قیام انگلستان کے دوران اعزازات، خطباتِ احمدیہ، تعلیمی تجاویز، کمیٹی خواستگار ترقی و تعلیم مسلمانان، رسالہ تہذیب الاخلاق، اجرا اور نوعیت، اصلاحی تعلیمی، تہذیبی کارہائے نمایاں اور ردِ عمل، تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار۔ (د) علمی تحریک کا تعلیمی رُخ: علم کی تعریف، وسعت، مقصد، مدرسہ کی ضرورت، جدید تعلیم میں روحانیت و مذہبیت کا فقدان، سرکاری مدارس کے مقصد، مدرسۃ العلوم کی ضرورت اور نوعیت، مدرسۃ العلوم کا قیام اور انتظام، اردو ہندی لسانی تنازع کے اصلاحی مشن پر اثرات، کلکتہ یونی ورسٹی اور الہ آباد یونی ورسٹی سے کالج کا الحاق، علی گڑھ کالج، علی گڑھ یونیورسٹی، نواب سلطان جہاں بیگم والیِ بھوپال، علی گڑھ یونی ورسٹی کی خدمات، آل انڈیا ایجوکیشنل کا قیام، مقاصد اور اجلاس جیسے موضوعات شامل ہیں۔

مذکورہ باب میں بتایا گیا ہے کہ سرسید کی خواہش تھی کہ مسلمانانِ ہند بری عادات اور غلط رسوم ورواج سے نجات حاصل کرلیں۔ رسوم ورواج کی اندھی تقلید کو قابلِ تعزیر سمجھتے ہوں کیوں کہ یہ انسانی ترقی کی راہوں کو مسدود کردیتی ہے:

> ''سرسید چاہتے تھے کہ جو بری عادتیں، غلط رسم ورواج مسلمانوں میں رواج پاچکے ہیں ان سے چھٹکارہ حاصل کریں۔ ن کے خیال میں رسم وراج کی ندھی تقلید کرنا کم عقلی اور کم علمی پر مبنی ہے۔ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وراپنی تمام قوتوں کو عمل میں لاتا ہے اپنی فہم، سمجھ بوجھ سے کام لیتا ہے صحیح وغلط میں تمیز کرتا ہے وہی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ رسموں کی تقید سے انسانی ترقی مسدود ہوجاتی ہے۔ اس لیے اچھی عادات واعلی قدار کو بلاتعصب مذہب وقوم اختیار کرنا چاہیے۔''[۷]

باب چہارم کا عنوان ''سرسید کے علمی کارنامے'' ہے، جس کی ذیل میں (الف) رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، غلط فہمیاں، تبیین الکلام، لائل محمڈنز آف انڈیا، لوکل سیلف

گورنمنٹ، دوقومی نظریہ، انڈین نیشنل کانگریس، یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ۱۸۸۸ء، انتخابی طریق کار سول سروس، جداگانہ انتخاب، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء، محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا، ۱۸۹۳ء۔ (ب) تعلیم: برطانیہ کی تعلیمی پالیسی، نئی حکومت سے اتحاد و تعلیم کی اہمیت، قومی ترقی و تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تعلیمی نظریہ فکر، مغربی تعلیم، قومی تعلیم کا جامع نظام، قوم میں اعلیٰ تعلیم کے ذوق کی اہمیت، الہ آباد یونی ورسٹی ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت، پنجاب یونیورسٹی، اخلاقی و مذہبی تعلیم کی اہمیت، علی گڑھ کالج، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، دینیات کی نصابی کتب پر عدم اطمینان کا اظہار، جدید اسلامی علم الکلام، تعلیم نسواں، مردوں کی تعلیم کی اہمیت، تعلیمی آزادی، عظیم یونی ورسٹی کا منصوبہ، تعلیم بالغاں، سرسید کے اصول و نظریہ تعلیم۔ (ج) تہذیب و تمدن اصلاحِ معاشرہ:۔ تہذیب کے معنی، تہذیب و تمدن کا فرق، تہذیبی نظریہ اور اس کے مختلف پہلو، موجودہ صورتِ حال، اسلامی تہذیب کے صالح عناصر اور نئی تہذیب کے محاسن کے امتزاج کی تجویز، قدیم تہذیبی تصور کی غیر افادیت، تہذیب الاخلاق، اصلاحی پروگرام، تہذیبی شائستگی کے ذریعوں کی پانچ اقسام، ضابطہ اخلاق، شائستگی اور حکومت، آزادی رائے، عقائد مذہبی کی درستگی، تعلیم اطفال، تعلیم و تربیت کے مالی وسائل، قومی ہمدردی، عزت و غیرت، ضبطِ اوقات، تصحیح اخلاق، گفتگو، رہن سہن، صفائی کے آداب، اپنی مدد آپ کا نظریہ، شخصی کردار، مسلمانوں کی بے حسی، دینِ اسلام، کاملیت، وضاحت، پیری مریدی سے عدم اتفاق، رسوم و عادات، رسوم و رواج کی پابندی کے نقصانات، فکری، صلاحیت۔ غیر اسلامی رسوم، غیر اسلامی مضرر سموں کو ترک کرنے کی ہدایت، کھانے کے آداب، رسم رواج کی تبدیلی کا مقصد، عیسائی مشنریز، قومی مسائل، عورتوں کے حقوق، عقدِ ثانی، رسموں کی اصلاح، اخلاقی خرابیوں کی وجوہات، خوشامد، دشمنی، تعصب، فخر و غرور، اوصافِ حمیدہ، قومی اصلاح کی کوشش۔ (د) مذہب: دینی جمود، وہابی تحریک، شاہ ولی اللہ کی تحریک علم الکلام، علم الکلام کے مقصد، دینی تجدد اور تفکر، تشکیک اسلامی تعلیم کا غلط انداز سے پروپیگنڈہ،

مذہب کی حرمت وحفاظت کے لیے معترضین کے جوابات، رائف آف محمد ﷺ کی اصلیت، اعتراضات وجوابات، خصبات احمدیہ، تفسیر القرآن، مسلمانو ں کی مذہبی زندگی کی تجدید کا خاک ہ، پندرہ اصول، جدید نظریہ حیات، اسلامی تعلیما ت کی عقلی وفکری توجیہات، مذہبی خیالات کی بنیاد قرآن مجید، احادیث کو قرآن کے برابر نہیں مانتے، تعیمات اسلام، سلام میں حاشیہ آرائی، اسلام کے بنیادی عقائد ومسائل، معاشرتی وعلمی مسائل، تعداد ازدواج، جہاد، سود، اسلام مکمل ضابطہ حیات، اسلام کی حرمت و حفاظت، تشکیک کا سدّ باب۔ (ر) زبان وادب: ادبی ماحول، ۱۸۶۷ ہندی تحریک کے مقاصد، ورنیکلر یونی ورسٹی کا منصوبہ، سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام، علی گڑھ کالج اورینٹل فیکلٹی، اردو کی عدالتی وسرکاری حیثیت، اردو اخبار، غالب کی نثر، آثار الصنادید، تہذیب الاخلاق کی علمی وادبی حیثیت، ادب میں مقصدیت، ادب میں مقصدیت، طرزِ ادامیں سادگی، اردو علمی تحریروں میں خلوص کی اہمیت، جذبات نگاری، قومی اصلاح، فلسفہ الٰہیات، اردو میں مغربی افکار واسالیب کا اثر، مقالہ نگاری، اردو میں نئے الفاظ کی شمولیت، نظم ونثر میں وسعت، بلند نظری اور سادگی، انجمنِ پنجاب، اردو ادب کی تاریخ۔ (س) اردو کی ادبی ترقی میں سر سید کا حصہ: اردو لٹریچر، ادبی حیثیت، مسلمانوں کے ذہنی، فکری، علمی ادبی جمود میں زندگی کی تحریک، اردو خطابت کا بہترین نمونہ، اردو میں خصبات نگاری کے فن کی ایجاد، اردو صحیفہ نگاری، بے لاگ وبے باک صحافت، اسباب بغاوتِ ہند، تہذیب الاخلاق، علم وصحافت کی پیوند کاری۔ (و) تاریخ پس منظر، جامِ جم، آثار الصنادید، تاریخ ضلع بجنور، تاریخ سرکشی ضلع بجنور، آئینِ اکبری کی تصحیح، تزکِ جہانگیری وتاریخ فیروز شاہی کی ادارت، تبیین الکلام، خطباتِ احمدیہ، تاریخ نگاری کا مخصوص طرزِ نگارش، صداقت، صاف گوئی، غیر جانب داری، تاریخ کا جدید ترقی پسندانہ نظریہ، اسلام کی تاویل۔ تاریخ اور عقل کی روشنی میں، غلط تاریخ اور اس کے اثرات کا اندمال، آپالوجی فار محمد اینڈ قرآن از ڈیون پیرٹ، پریچنگ آف اسلام از آرنلڈ، سر سید اور فلسفہ تاریخ، تہذیب الاخلاق، قومی وحدت،

سید احمد کی تحریک جہاد اور جمال الدین افغانی کی تحریکِ اسلام کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ، جدید تعلیمی نظام کی ضرورت اور سرسید کی بصیرت، تحقیقی میدان میں بصیرت اور اثرات، تصحیح آئین اکبری، قوم کی علمی کم مائیگی کا احساس اور تجویز۔ (ہ) متفرق موضوعات: تسہیل فی جرثقیل، جیلا القلوب، قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا خلاصہ، فوائد و افکار فی اعمال الفرجار، تحفہ حسن، رسالہ قول متین در ابطال حرکت زمین، رسالہ راہِ سنت و رد بدعت، رسالہ قدیم نظام دیہی ہندوستان، ہومیوپیتھی طریقہ علاج، ہیضہ کا علاج ہومیوپیتھی کے طریقہ پر، طب یونانی کی ترقی کے لیے اس کی تعلیمی ضرورت کا احساس، یادداشت نسبت ترقی اراضی وامدادِ کاشتکاران، بنک ہائے زراعتی کتب خانے اور عجائب گھر کی ضرورت، لندن کا سفر، سفرنامہ کتابوں پر تبصرے اور تنقید، سرسید اور اردو کی علمی قدر، حدیث کی کتابوں کی قدر، الفاروق سے متعلق مضمون، زندگی کے جدید نظریات فکر اور عملی زندگی میں ان کی افادیت، سرسید کی علمی تحریک کے اثرات، اردو جدید افکار و نظریات کے اظہار کا وسیلہ۔

باب پنجم ''سرسید کے رفقائے کار کی علمی خدمات'' کے زیرِ عنوان (الف) مولانا الطاف حسین حالی: ابتدائی تعلیم، ملازمت، قدیم رنگ، تغزل، مغربی علم و دب کے اثرات، مشرقی ادب میں افادیت کا رجحان پیدا کیا۔ اردو نظم میں جدید شاعری کا آغاز، مسدس مدوجزرِ اسلام، اصلاح بذریعہ شعر، مختلف اصنافِ شعر سے متعلق اصلاحی مشورے، سادگی، اصلیت اور جوش، نئے سائنسی رجحانات کی شمولیت، اردو نثر میں جدید سوانح نگاری، اور جدید اصول تنقید کے قواعد منضبط کیے۔ شیخ سعدی، مرزا غالب اور سرسید احمد خاں کا انتخاب حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، سرسید کی نیک نیتی، مسلمانوں سے محبت اور خلوص، سرسید سے اختلافی مسائل اور ان سے محبت، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں مضامین کی تصنیف، تعلیم، مذہب، تصوف، اخلاق معاشرت، فلسفہ اور تاریخ پر مضامین، کتابوں پر تنقید اور تبصرے، تعلیمی ترقی اور اردو کی حمایت میں تقاریر، جدید تعلیم کی افادیت و اہمیت پر مضمون، ندوۃ العلما

کی اصلاح، نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم کے متعلق تقریر، تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور، سماجی مسئلہ کا حل، اعلیٰ تعلیم کے حصول میں سرسید سے موافقت، صنعت وحرفت کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی، پیشہ ورانہ تعلیم کی اہمیت، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے قیام کی تجویز کا خیر مقدم، مذہبی تعلیم میں سرسید سے اتفاق، مضمون الدین یسرہ کے ذریعے اسلام کی وضاحت، تقلید، بدعات، رسم ورواج کے خراب اثرات کی وضاحت، اپنی مدد آپ، تجارت کی خوبیوں اوراس کے عمدہ اثرات پر مضمون، سیاسی نظریہ فکر میں سرسید سے اتفاق، اردو زبان کی وسعت، فروغ، درستی، اصلاح کے باب میں مفید مشورے، اردو کو قومی زبان بنانے کی تجویز، اردو لغت، قواعد نظم ونثر کی کتابوں اور اخبارات ورسائل کی اشاعت، حالی کی خاص علمی وتنقیدی روش، آزاد کی تذکرہ نویسی پر رائے، فرہنگِ آصفیہ، سیرۃ النعمان، منطق استقرائی، انوار الاخلاق، ایوانِ انور، نشائے نورمحمد، قوانین دولت، فلسفہ تعلیم، سوانح عمری حضرت محمد امیر مینائی، حیات النذیر، تحفۂ جاوید، رسالہ ادیب، رسالہ معارف، رسالہ اتحاد، رسالہ آفتاب، رسالہ اردو پر تبصرے، اردو میں جدید تنقیدی نظریات، اصولِ سوانح نگاری، علمی مضامین کو روشناس کرایا۔ سلاستِ زبان کی نظیر قائم کی۔ (ب) مولانا شبلی نعمانی: پیدائش، تعلیم، علی گڑھ میں قیام، علی گڑھ کالج، تاریخی ذوق، جدید اثرات، مسلمانوں کی اصلاح، جدید زبان وعلوم کی افادیت واہمیت، تحقیق تنقید وتاریخ کا شوق، الکلام وعلم الکلام کا اجراء (Heros of slam) کا سلسلہ، شبلی جدید علم وفن کی افادیت کے معترف تھے، مرعوب نہ تھے۔ مضمون مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم جدید زبان وعلوم کی تحصیل پر زور، نیشنل اسکول ۱۸۸۳ء۔ ۱۸۸۷ء کا رزولیوشن، چوتھا اجلاس، تیرھواں اجلاس، تاریخ، سوانح، تحقیق وتنقید سے دل چسپی، المامون، النعمان، سفر روم مصر، شام، قسطنطنیہ، سفرنامہ، لفاروق، الغزالی، سیرت النبی انتقال، سیرۃ النبی ﷺ کی تکمیل، سید سلیمان ندوی، مضمون کتب خانہ سکندریہ، الجزیہ تعلیمی، دینی، تاریخی، سیاسی، رسائلِ شبلی، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، سرسید اور شبلی کے کماں تاریخ نگاری کا

اعتراف، مقصد تاریخ، اسلوبِ اردو، ذریعہ اظہار، فن تاریخ، اصولِ تاریخ نویسی، ایڈیٹر شعبہ اردو، رسالہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، سرسید اور اردو لٹریچر، املا و صحتِ زبان کے مضامین، اردو ہندی تنازعہ، شعبہ انجمن ترقی اردو، الکلام اور اس کے حصے، عقائد، عبادات، اخلاق، اور تعداد ازدواج، اسلام کی بے تعصبی، تاریخِ اسلام پر تقاریر، شبلی اور اردو تنقید، جدید اسلوب، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، علی گڑھ سے لگاؤ، ندوۃ العلما، دارالمصنفین، نقالی اور تقلید کی مخالفت۔ (ج) نواب محسن الملک: پیدائش، تعلیم، ملازمت، سائنٹفک سوسائٹی کی ممبر شپ، علی گڑھ میں قیام، مدرستہ العلوم، اردو تحفظ کے جلسے کا انتظام، اردو کی اہمیت، سرسید کے نظریات سے اتفاق اور مذہبی مباحث میں اختلاف، شیعہ سے سنی ہونا، اردو تصانیف، قانونِ مال، قانونِ فوجداری، آیاتِ دینیات، تقلید و عمل بالحدیث، مسلمانوں کی تہذیب، مکاتبات الاخلاق فی اصول التفسیر وعلوم القرآن، مضامین تہذیب الاخلاق، مکاتیب، خطبات، وفات، مسلمان سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کیوں نہیں کرتے؟ اول انعام یافتہ مضمون، متوازن و معتدل فکر، نیچر، اجتماعیت، مقصدیت اور جدیدیت، متوازن و نرم اسلوب، علمی، اخلاقی، مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں پر مضامین، امام غزالی کے اثرات، اعتدال پسندی، اندھی تقلید سے اجتناب، مضمون ندوۃ العلماء وخیالات اصلاح، عالمانہ انشاء پردازی، اصلاحِ تمدن، رسم و رواج، تہذیب و شائستگی، مسلمانوں کی گزشتہ و موجودہ حالت، اشاعتِ اسلام، مذہبی تفرقہ کو ختم کرنا، اردو کی حفاظت پر تقاریر و خطابات، تعلیم کی ضرورت و اہمیت و مسلمانوں کی تہذیب پر تقریر، مسلمانوں کے زوال کے پانچ اسباب، ۲۸ دسمبر ۱۸۹۰ء کو الہ آباد کانفرنس کی تقریر بہ عنوان ''یونان کی ترقی اور یورپ کے تنزل اور پھر ترقی کے اسباب، اشاعتِ اسلام، کانفرنس کے خلاف اعتراضات و نکتہ چینیوں کا جواب، ۲۹ دسمبر ۱۸۹۳ء کا ریزولوشن، ندوۃ العلماء کے قیام کے بارے میں رائے، ۱۸۹۳ء خطبۂ صدارت، جدید تعلیم کی اہمیت اور اس کے اسلام کے منافی نہ ہونے کی غلط فہمی کا ازالہ، اردو بطور سرکاری زبان، اس کی

اہمیت، لاہور کانفرنس، مسلم یونی ورسٹی کے خیال سے اتفاق، اس کی ضرورت، اسباب، سرسید کی علمی تحریک میں حصہ، بورڈنگ ہاؤس کے قیام کی تجویز۔(د) نواب وقارالملک: پیدائش، آبائی وطن، تعلیم، سرسید تحریک میں شمولیت، حیدرآباد دکن میں ملازمت اور استعفے، یورپین اسٹاف کی تقرری کی مخالفت، آنریری سیکرٹری شپ علی گڑھ کالج سے لگاؤ، اردو ہندی تنازعہ، مسلم وفد میں شمولیت، کانگریس کے بارے میں رائے، مضامین، تقاریر، خطوط، فرینچ ریزولوشن اینڈ نپولین، ہیئتِ جدیدہ اور معجزہ قرآنی، توکل، رسم و رواج کی پابندی، جاہلانہ تقلید، فخر، غرور، تعصب کی برائیاں، مسلمانوں کی اصلاح، شیریں بیانی، اعتدال، محبت اور دوستی، تہذیب و شائستگی، تعلیم کی کمیٹیاں اور سررشتہ تعلیم، دیوبند اور ندوۃ العلما سے تعلق، مذہبی تعلیم کی تجویز، پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس کی صدارت، مذہبی تعلیم کی اہمیت، تجارت پیشہ حضرات کے لیے تعلیم کی ضرورت، سیاسی بصیرت، علی گڑھ کالج، جدید زبان و بیان و علوم وفنون کی تعلیم، اردو کی اہمیت، انتقال۔ (ر) مولوی چراغ علی: پیدائش، خاندان، تعلیم، سرسید سے ملاقات، علی گڑھ میں قیام، ملازمتیں، انتقال، سرسید کے حامی، مذہب سے لگاؤ، رسالہ تعلیقات، منشورِ محمد اور مخبر صادق کے نام سے مضامین، کئی زبانوں پر عبور، اعلیٰ کردار و صفات، اسلام و قرآن کی اہمیت پر یقین، مطبوعات، تہذیب الکلام فی حقیقت الاسلام، مجموعہ روایات استحقاق، تدبیر الاسلام فی تحریر الامتہ والغلام، تحقیق مسئلہ زوجات، کرٹیکل ایکس پوزیشن آف پوپولر جہاد، ریفارم اینڈ دی مسلم اول، محمد ٹرو پروفیٹ، حیدرآباد دکن انڈر سالارِ جنگ، قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ دفع الذام از غزوات اسلام، اسلام کی دنیوی برکتیں، العلوم الجدیدۃ الاسلام (ناتمام)، تہذیب الاخلاق جلد سوم کے مضامین احسان عام، قرآن کے معدنِ حکمت اور مسلمانوں کے مصدر ہونے کا ذکر، الحج الظاہر فی حریۃ الہاجرہ، یورپ اور قرآن، عیسیٰ مسیح ابن مریم رسول اللہ، طرزِ تحریر، عقلی استدلال، اسلامی اصول و قواعد کی بنیاد، قرآن مجید، معلومات علمی، اسلام کی حمایت، لفظی عبارت آرائی سے گریز۔(س) محمد حسین آزاد

پیدائش، تعلیم، اردو اخبار کا احیاء، کردار کے اوصاف، ملازمتیں، انجمن پنجاب کی بنیاد اور آزاد کا حصہ، سیکرٹری، جدید اردو نظم کی زندگی، مضمون علم انشاء، اردو نظم مثنوی ''خواب امن''، سرسید تحریک کے اثرات، آزاد سنٹرل بک ڈپو، گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں ملازمت، شمس العلماء کا خطاب، انتقال، مطبوعات، قصص ہند حصہ اول و دوم، نیرنگِ خیال، آبِ حیات، اردو قاعدے، ریڈریں، ردو قواعد۔ محبت کرن کا پھول، نگارستان فارس، سخن دانِ فارس، دربار اکبری، ڈرامہ اکبر بیاض محمد حسین آزاد، کائناتِ عرب، لغتِ آزاد، تذکرہ علماء، سپاک ونماک، الہیاتِ جونورستان، نظمِ آزاد، خمکدہ آزاد، انشاء پردازی کا انوکھا اسوب اور نیرنگِ خیال، آبِ حیت، جدید تذکرہ وتنقید، جذبہ کی جدت و فراوانی، اولین محقق، ادبی مؤرخ، نقاد مز نگار، ڈرامہ نویس، لسانی مفکر، تعلیمی مصنف، جدید اردو شاعری کے معمار۔ (و) مولوی نذیر احمد دہلوی: پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت، درس وتدریس، ملازمتیں، مغربی زبان کی تحصیل کی ضرورت، سلوت، بورڈ آف ریونیو کے ممبر، مطالعہ کی عادت، مطبوعات، مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محسنات، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ، ایامیٰ، منتخب الحکایات، چند پند، موعظہ حسنہ، ترجمہ قرآن شریف، الحقوق والفرائض، الاجتہاد، عقائدِ اسلامی کا عقلی ثبوت، امہات الامہ، ادعیہ القرآن، رسالہ مبادی الحکمت، مصائب غدر، مینیفک فی الصرف، رسم الخط، نصاب خسرو صرف صغیر، مجموعہ لیکچر حصہ اول و دوم، نظمِ بے نظیر، مطالب قرآن، (نا مکمل) تاریخ دربار تاج پوشی کا ترجمہ، مغربی علوم وفنون کی قدر شناسی، سرسید تحریک کے اثرات، ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں لیکچر، مراۃ العروس، بنات النعش، اور توبۃ النصوح کی تعلیمی تحریک، علوم جدیدہ کے ہر فن کے کامل افراد تیار کرنے کی ضرورت، ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۰، سائنس کے بارے میں نظریات، مذہبی واخلاقی تعلیم کی ضرورت پر زور، اسلام جامع دستور العمل، دینِ فطرت اور امن وسلامتی، تہذیب وشائستگی کا مظہر، زندگی کا ترقی

پسندانہ نصب العین، سرسید کے اثرات، انتہاپسندی کی مخالفت، جدید سائنسی علوم حاصل کرنے کی ضرورت سے اتفاق، سرسید تحریک کی افادیت وخلوص سے اتفاق، علی گڑھ کالج اوراسلامیہ کالج کی ترقی، انجمن حمایت اسلام میں تقاریر، سرسید میموریل فنڈ اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ایجوکیشنل کالج دہلی، طب مشرق کے احیا میں حصہ، اصلاحی اداروں کی بنیاد، اولین ناول نگار، صاحب طرز ادیب، زورِ خطابت، علمیت شوخی وظرافت، مدرسہ طبیہ فن خطابت، تعمیری تنقید۔ (ہ) مولوی ذکاءاللہ دہلوی: پیدائش، خاندان، پس منظر، تعلیم، ریاضی سے خصوصی لگاؤ، ملازمتیں، وفات، ریاضی وطبیعات کی تصانیف، خطاب، تعلیم نسواں، کردار علم کی قدر شناسی، سرسید کے اثرات، اردو میں ریاضی، سائنس، سیاست، تاریخ، جغرافیہ، طبیعات کی کتابوں کے تراجم کی مہم، اردو کی حمایت، جدید سائنسی علوم اردو میں، علی گڑھ کالج کی ترقی، شمالی ہندوستان میں جدید مغربی علوم کی ترویج کی کوشش، معاصرین میں سب سے زیادہ مطبوعات، طرز تحریر سادہ وسلیس، تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں، ۳۰۰ مضامین، ریاضیات، تاریخ وجغرافیہ، علم وادب، علم واخلاق، طبیعات وہیئت، سیاستِ مدن، تاریخِ ہندوستان جلدیں، ملکہ وکٹوریہ، کرزن نامہ، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خان، تاریخِ انگلشیہ، آئین اکبری مشرق روایات کا پاس، ہیرو پرستی، مذہبی رواداری، شخصی حکومت سے اتفاق، تعلیمی مفکر، تعلیمِ نسواں کے حامی، مادری زبان ذریعہ تدریس، اردو زبان سے محبت، انگریزی زبان ذریعہ تدریس، سرسید تحریک سے گہرا تعلق، مغرب کی اندھی تقلید سے اختلاف، مسلمانوں کی اصلاح بذریعہ تعلیم، علم دوستی وعلم پروری، اردو کی علمی ترقی میں ذکاءاللہ کا حصہ، جیسے موضوعات شامل ہیں۔

مؤلف نے منشی ذکاءاللہ کے تعلیمی اور ذریعہ تعلیم بارے خیالات اور نظریات حوالے سے متضاد بیانات دیے ہیں۔ جہاں ایک طرف وہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کو مسلمانانِ ہند کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور اس کے اوصاف اجاگر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہاں دوسری جانب انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم

بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ آخر کیوں؟ ذیل میں دو اقتباسات کا بہ غور مطالعہ کیجیے:

''انگریزی زبان کا مسلسل استعمال خواہ بچپن ہی سے کیوں نہ کیا جائے اس طرح سے ہم اپنے خیالات مادری زبان میں ادا کرنے کی بجائے اس میں دا کرنے لگ جائیں ہمیں قومیت سے بیگانہ کر دے گا۔ اگر ہم مشرقی باشندے رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس زبان سے غفلت نہ برتنی چاہیے جسے ہم نے اپنی ماں کی گود میں سیکھا ہے۔ ہمیں اپنی ہی قوم کی اور عملاً اپنی عورتوں کی نظروں میں غیر ملکی نہ بن جانا چاہیے۔ ہماری مادری زبان اپنے ندر ہماری تمام مقدس یادداشتیں اور روایتیں رکھتی ہے۔ یہ پہلی بولی ہے جس کا استعمال ہم اپنی نوعمری میں اپنی ماؤں کے ساتھ بات چیت کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ اسے بھول جانا یا اسے حقارت کی نظر سے دیکھنا پنی قومی سیرت کی تعمیر میں ایک نہایت اہم عنصر کو ضائع کر دیتا ہے۔۔۔ جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے اردو زبان ہمارے مذہب کے ساتھ نہایت گہرے روابط رکھتی ہے اس کا طرزِ تحریر ہمیں اپنی مقدس زبان عربی کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے بہت سے الفاظ عربی ماددوں سے مشتق ہیں۔ انگریزی کی خاطر اردو کو چھوڑ دینا اور مسلمان بچوں کو اس طرح سے تربیت کرنا کہ وہ ردو اچھی طرح لکھ پڑھ نہ سکیں بل کہ انگریزی میں لکھنے کو ترجیح دیں۔ درحقیقت مذہب اسلام سے غیریت برتنے کا نہایت ہی یقینی ذریعہ ہے کہ انگریزی میں ترقی کرنے کی موجودہ انتہائی محبت کے باعث اردو زبان سے نفرت کی گئی تو پھر سوائے چند طلبا کے کون ہمارے مقدس قرآن کی عربی زبان کے مطالعے سے محبت رکھے گا۔''[۸]

مزید لکھتے ہیں:

''انھوں نے زمانہ اور حالات کی رفتار دیکھ کر تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر مان لیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے لیے جدید سائنسی

ور جدید ٹیکنیکل علم کی تحصیل ضروری سمجھتے تھے۔ وہ تعلیم ہی کو سیاسی، معاشرتی ور اقتصادی ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تعلیم ہی ان کا محبوب و من پسند موضوع تھا۔ وہ مسلمان قوم کی جہالت، تعلیمی پستی سے بے حد آزردہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کی اہمیت و ضرورت سب پر منکشف ہو جائے سب تعلیم سے فیض یاب ہوں۔ انھوں نے اسی مقصد کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کر دی۔"[9]

چھٹا باب "تحریک سرسید کے اثرات" کے زیرِ عنوان (الف) پس منظر: سرسید اسکول اور اردو علم و ادب، سرسید تحریک، زبان کی اصلاح او رتہذیب مضمون نگاری، اسالیب بیان، سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، وحید الدین سلیم، ادبی اور تنقیدی مقالات مولوی عبدالحق، تحقیق و تنقید سلیس زبان میں، مقدمات، مقدلات، تقاریر، مضامین سید سلیمان ندوی، تاریخ، سیرت، شاعری پر مقالات، عبدالرحمان بجنوری، عبدالماجد دریابادی، صحافت، مقالات مضامین، اردو زبان میں ظرافت کی چاشنی، آل احمد سرور، وقار عظیم، عبادت بریلوی، سید عبداللہ۔ (ب) نظم: مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، اختر شیرانی، اسرارالحق مجاز، علی سردار جعفری، ناصر کاظمی، احمد فراز۔ (ج) تاریخ و سوانح نگاری. سرسید، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی، عبدالسلام ندوی، ریاست علی ندوی، مسعود علی ندوی، محمد امین زبیری، اکرام اللہ ندوی، حفظ الرحمان سوہاروی، سعید احمد اکبر آبادی، عبدالرشید نعمانی، ندو العلماء، دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، قاضی محمد سلیمان، مولانا شاہ نجیب اکبر آبادی، اسلم جیراجپوری، سید امیر علی۔ (د) تنقید و تحقیق: اصول، ادبی تنقید، عبدالحق، ماہرِ لسانیات، سید مسعود حسن رضوی، آلِ احمد سرور، عزیز احمد، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، مجنوں گورکھ پوری، عندیب شادانی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ (ر) مذہب: سرسید الکلام و علم الکلام، محسن الملک، حالی، چراغ علی، سید امیر علی، دارالمصنفین، ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، غلام محمد پرویز، علامہ اقبال۔

(س) شاعری: مولانا الطاف حسین حالی، اکبرالہ آبادی، مولانا حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، مضطر خیرآبادی، عزیز لکھنوی، جوش ملیح آبادی، مولانا ظفرعلی خاں، فیض احمد فیض، علامہ اقبال۔ (ط) تعلیم: پس منظر، اسلامیہ کالج، علی گڑھ کالج، تعلیمی پالیسی، علی گڑھ یونی ورسٹی کا قیام، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سید الطاف علی بریلوی، ندوۃ العلماء۔ (و) طنز و مزاح: رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، سید سجاد حیدر یلدرم، فرحت اللہ بیگ، پطرس۔ (ہ) صحافت۔ سید الاخبار از محمد خان، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا ظفرعلی خاں، تہذیب الاخلاق، دل گداز، مخزن، اردوئے معلی، الہلال، البلاغ، معارف، اردو، نگار، عبدالحلیم شرر، شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، علی گڑھ کالج کے مقاصد، سرسید تحریک کے زیرِ اثر اردو زبان سے ترقی کر کے رود ادب بنا دیا، جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔

آخر میں "کتابیات" اور "اشاریہ" بھی شامل ہے۔

مجموعی طور پر کتاب سرسید کے تعلیمی تصورات پر مبنی ہے۔ کتاب میں ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کی گئی سرسید کی کوششوں اور کاوشوں پر انھوں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب عمدہ اور دل چسپ ہے۔

سرسید کی تعلیمی تحریک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ (۱۹۹۱ء)

از اختر الواسع

اختر الواسع کی تالیف سرسید کی تعلیمی تحریک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ مکتبہ عالیہ، لاہور سے ۱۹۹۱ء کو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ مؤلف نے اپنی تالیف اپنے محترم و معظم والدین سے منسوب کی ہے۔ یہ تالیف ۱۱۹ صفحات پر محیط ہے۔ فہرست میں پیش لفظ (پروفیسر علی محمد خسرو)، تعارف (پروفیسر مشیرالحق)، کچھ کتاب کے بارے میں (اختر الواسع)، سماجی پس منظر، مسلمان اور تعلیم، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

کا قیام، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات (اجمالی جائزہ) اور ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔

مؤلف نے اس تالیف کی نوعیت اور اغراض و مقاصد کا احاطہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''زیرِ نظر کتاب (جو دستاویزی نوعیت کی حامل ہے اور میں اسے انتہائی ادب اور طالب علمانہ انکسار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں) سے میرا مقصد یہ ہے کہ کانفرنس کی ایک اجمالی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد، اس کا دائرہ کار، اس کے منصوبے، اس کی دلچسپیاں، اس کے عزائم اور حوصلے، اس کے خواب خواہ وہ شرمندہ تعبیر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، غرض ایک پوری تصویر کانفرنس کی رفتارِ ترقی کی نئی نسل کے سامنے آ جائے۔ آج یہ ادارہ جس حد تک بھی زندہ ہے اس کا کریڈٹ صرف اسی ایک مردِ درویش اور پیرِ دانا کو پہنچتا ہے جو بے عملی اور بے حسی کی تاریکیوں میں اس چراغ کو اپنی لگن اور خلوصِ بے کراں سے روشن رکھے ہوئے ہے اور اس کا نام ہے خان بہادر الحاج عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی، آنریری سیکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔''[۱۰]

پہلے باب ''سماجی پس منظر'' کی ذیل میں وہ پس منظر بیان کیا گیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کون سے حالات تھے جن میں کانفرنس کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی؟ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا) تاریخِ ہندوستان میں کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے جس نے ہند کے اہلِ دانش کو تدبر کرنے پر مجبور کر دیا۔ سیاسی نظام کی تبدیلی نے زندگی کی اقدار کو بدل کر رکھ دیا جس کا اثر پورے ہندوستانی معاشرے خصوصاً مسلمانوں پر بہت زیادہ پڑا۔ مسلم معاشرے میں مذہبی، اخلاقی اور تمدنی زبوں حالی تو کہیں پہلے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن اس انقلاب کے باعث یہ احساس شدید تر ہو گیا۔ مسلمانوں کی اقتصادی صورت حال بگڑتی چلی گئی

کیوں کہ حکومت، عہدے، جاگیریں اور مناصب ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ انگریز فاتحین نے مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان پر مظالم کی انتہا کر دی۔ ان ہنگاموں کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انھیں عبرت ناک سزائیں دی گئیں تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرسکیں۔ تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند کر دیے گئے جس سے مسلمان بے حد پس ماندہ ہو کر رہ گئے۔

دوسرے باب ''مسلمان اور تعلیم'' کے زیرِ عنوان سرسید کے تعلیمی افکار کو مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سرسید مسلمانوں میں ہزاروں نیکیاں دیکھتے تھے لیکن شائستگی سے محروم، جرأت و بہادری خوف ناک صورت اختیار کر چکی تھی، بے ڈھنگا مگر قوی استدلال، اعلیٰ درجے کی صبر و قناعت مگر بے سود اور بے محل جس سے سرسید کڑھتے رہتے تھے۔ سرسید آکسفورڈ اور کیمبرج کے نظام سے متاثر ہو کر تربیت کو تعلیم کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے تو اسے گھر سے دور کسی ایسے شہر میں بھیج دیا جائے جہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو اور پر فضا مقام پر اس کی تعلیم اور رہائش کا انتظام کیا جائے۔ مذہبی تعلیم کو طلبہ کے ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوم کے ذی علم اور ذی عقل و شعور افراد جمع ہوں اور بحث و تمحیص کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں کہ موجودہ حالت کے پیشِ نظر سلسلہ تعلیم اور جدید علوم و فنون کے حصول کے لیے کون سا طریقہ کار اپنانا چاہیے؟ ان کے خیال میں پرانی اور دقیانوسی تعلیم کے سلسلے میں کیا رد و بدل ہونا چاہیے؟ سرسید کے عہد میں کوئی بھی زبان بس قابل نہ تھی کہ اسے مغربی علوم و فنون کے حصول کا ذریعہ بنایا جاسکے لیکن مادری زبان کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر اس کا استعمال ناگزیر تھا، لہٰذا انھوں نے جدید علوم کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کو ترجیح دی۔ سائنٹیفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اس کی ابتدا کے ساتھ مدرسۃ العلوم اور پھر اسے کالج کے درجے تک پہنچانے کے لیے سرسید کی کاوشیں رنگ لائیں۔ اگرچہ یہ ایک کالج عام مسلمانوں کی تعلیمی

ضروریات پوری نہیں کرسکتا تھا مگر سرسید ان کی تعلیم وتربیت، ان کی معاشرتی اصلاح، ان کی اصلاح، ان کی اقتصادی فلاح وبہبود اور سماجی فلاح کے لیے کوشاں رہے۔ اسی سلسلے میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ علی گڑھ کالج کو وہ ایک تحریک کی شکل دینا چاہتے تھے جسے عملی جامہ پہنانے میں کامیاب بھی رہے۔

تیسرے باب ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام'' کے عنوان کے تحت ایجوکیشنل کانفرنس کے آغاز وارتقا، اغراض ومقاصد اور قواعد وضوابط کا احاطہ کیا گیا ہے جن سے یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ اس کے بانیوں نے کیا خواب دیکھے تھے؟ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں دردمندانِ قوم کا سہ روزہ اجلاس ہوا جس میں ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کے زیرِ اہتمام اس اجلاس کی صدارت مولوی محمد سمیع اللہ خاں نے کی۔ شرکائے کانفرنس کی کل تعداد اکسٹھ تھی۔ صوبہ آگرہ و اودھ سے پینتالیس، پنجاب سید و اور جبل پور (صوبہ متوسط) سے چودہ مندوبین نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ڈیڑھ سو طلبہ بھی موجود تھے۔ سرسید احمد خاں نے ایک تجویز پیش کی جس کی تائید محمد رفیق صاحب (بارایٹ لا) نے کی تھی۔

> ''مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف ضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو ''محمڈن ایجوکیشنل کانگریس'' کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بل کہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں وراس کا انتظام فرمادیں منعقد ہوا کرے گا۔''[۱۱]

اس اجلاس میں سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے نتیجے میں ملازمتوں سے دوری کے عوامل اور محرکات کا احاطہ کیا۔ سیاست میں الجھنے کی بجائے تعلیمی شعور اجاگر کرنے پر زور دیا۔ اس طرز پر ملک کے رئیسوں سے مالی امداد طلب کی

گئی جس طرز پر پنجاب کے رئیسوں نے کی تھی۔

بعد ازاں کانفرنس کے اصول وضوابط، مقاصد، کمیٹیوں کے قیام، اخراجات کا بہی کھاتا کے حوالے سے مکمل تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

چوتھے باب ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات (اجمالی جائزہ)'' کا عنوان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات پر محیط ہے۔اس سلسلے میں کافی تحقیق وتدقیق سے کام لیا گیا ہے۔مؤلف نے کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کی اوران سے حسبِ ضرورت موادحاصل کیا۔ان کی کوشش رہی کہ جو بات کہی جائے ،اس کا حوالہ کانفرنس کے مطبوعہ ریکارڈ سے ہی دیا جائے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ کانفرنس کے بارے میں یہی مآخذ سب سے زیادہ مستند ہو سکتے تھے۔

مسم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کے اجمالی جائزہ کے تحت تعلیمی کام (الف) ابتدائی تعیم (ب) ثانوی تعیم (ج) اعلیٰ تعلیم (د) مذہبی علیم (ہ) صنعت وحرفت کی تعلیم (و) تعلیمِ نسواں اور (ز) عومِ مشرقی کی تعلیم ،اصلاحِ تمدن ، ثقافتی خدمات اور مالیاتی امور (الف. تعلیمی امداد کے لیے وظائف،ب. مسئلہ اوقاف کے مسائل کے حل) کے حوالے سے کانفرنس کی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

''ضمیمہ جات'' کے عنوان کی ذیل میں ایسے ضمائم شامل کیے گئے ہیں جن سے کانفرنس کے بارے میں بہت سی مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

ضمائم میں،آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ایک نظر میں (۱۸۸۶ء تا ۱۹۵۵ء چھپن (۵۶) اجلاس) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کا صوبہ وار گوشوارہ اتر پردیش (۲۶) مہاراشٹر (۶) دہلی (۴) پنجاب پاکستان (۴) مغربی بنگال (۳) تامل ناڈو (۳) سندھ پاکستان (۲) پنجاب (۱) ہریانہ (۱) مدھیہ پردیش (۱) گجرات (۱) راجستھان (۱) بہار (۱) بنگلہ دیش (۱) اور برما (۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سیکرٹری (کل تعداد ۱۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف شعبے اوراس کی طلائی جوبلی کے موقع پران کے

صدور (کل تعداد:۱۱) ابتدائی تعلیم (۱۸۹۹ء تا ۱۹۳۶ء تمیں اجلاس مع متونِ تجاویز) اعلیٰ تعلیم (۱۸۸۷ء تا ۱۹۳۶ء، ۳۴ اجلاس مع متونِ تجاویز) قیام مسلم یونی ورسٹی (۱۸۸۴ء تا ۱۹۲۸ء گیارہ اجلاس مع متونِ تجاویز) مذہبی تعلیم (۱۸۸۶۔۸۷ء تا ۱۹۳۵ء سولہ اجلاس مع متونِ تجاویز) تعلیمِ نسواں ۱۸۸۸ء تا ۱۹۳۴ء اٹھارہ اجلاس مع متونِ تجاویز) مشرقی تعلیم (۱۸۸۶ء تا ۱۹۳۴ء چوبیس جلاس مع متونِ تجاویز) تعلیمِ صنعت وحرفت (۱۸۹۰ء تا ۱۹۳۴ء انیس اجلاس مع متونِ تجاویز) تعلیم صنعت و حرفت (۱۸۹۰ء تا ۱۹۳۴ء انیس اجلاس مع متونِ تجاویز) تعلیمی امداد (۱۸۸۷ء تا ۱۹۳۴ء بیالیس اجلاس مع متونِ تجاویز) اوقاف (۱۸۸۷ء تا ۱۹۳۴ء بارہ اجلاس مع متونِ تجاویز) ترقی اردو (۱۸۹۵ء تا ۱۹۲۸ء اکیس اجلاس مع متونِ تجاویز) اصلاحِ تمدن (۱۸۸۸ء تا ۱۹۳۵ء گیارہ اجلاس مع متونِ تجاویز) نمائندگی ومطالبات (۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۴ء انیس اجلاس مع متونِ تجاویز) خطبہ صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۲۔۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء (ص ۹۱۔۱۰۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں ہونے والی تقاریر/ مقالات کی فہرست (۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۳ء (ص ۱۰۲۔۱۰۸) قواعد منظور شدہ مجلسِ منتظمہ۔منعقدہ ۱۹/اکتوبر ۱۹۲۷ء (ص ۱۰۹۔۱۱۶) مطبوعات آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مع سنہ اشاعت کی ترتیب کے ساتھ (کل تعداد: ۳۷) شامل ہیں۔

یہ موضوع پر ایک تحقیقی کتاب ہے۔سرسید کے ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے کی گئی تعلیمی وعلمی کاوشوں کو سراہا گیا ہے۔زبان وبیان سادہ اور رواں ہے۔

سرسیّد، اقبال اور علی گڑھ (۱۹۸۷ء) از اصغر عباس

سرسید، اقبال اور علی گڑھ اصغر عباس کی تالیف ہے جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ یہ تالیف کل چونسٹھ (۶۴) صفحات پر مشتمل ہے۔اس تالیف کو مؤلف نے ''رسالہ'' کا نام دیا ہے۔ مقصدِ تالیف کا تعین کرتے

ہوئے مؤلف رقم طراز ہیں:

''اقبال علی گڑھ سے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے زادِ راہ میں علی گڑھ کے گہرے اثرات کا جائزہ مقصود نہیں بل کہ اس رسالے میں صرف اقبال اور علی گڑھ کے ربط و تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اقبالیات کے مطالعے میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہ ہو۔''[۲۲]

اس تالیف کی ابواب بندی نہیں کی گئی بل کہ ''شروع کی بات''، سر سید، اقبال اور علی گڑھ'' اور اقبال علی گڑھ میں'' کی ذیل میں طلبہ علی گڑھ کے نام، طلبہ علی گڑھ کے نام نظم کے محذوف اشعار یہ ہیں، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا لیکچر، حضرت علامہ اقبال کے فاضلانہ خطباتِ اسلامیہ علامہ ممدوح علی گڑھ تشریف لے گئے، حضرت علامہ اقبال علی گڑھ میں: طلبا اور اکابر کی طرف سے شاندار خیر مقدم (نامہ نگار خصوصی کے قلم سے) اقبال علی گڑھ میں، مسلم یونی ورسٹی میں علامہ اقبال کا پہلا خطبہ: عقیدت مندانِ حضرت علامہ کا اجتماع (نامہ نگارِ خصوصی کے قلم سے) اسلام کا فلسفی اقبال علی گڑھ کے علمی مرکز میں، علمی مجلسیں، علمی بحثیں اور علمی تذکرے، اسٹوڈنٹس یونین کلب کا سپاس نامہ: بخدمت شریف ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ۔ لا، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سپاس نامہ کا جواب، اسٹوڈنٹس یونین کے جواب میں اقبال کی تقریر کے بعد صدر یونین پرووائس چانسلر مسٹر اے ہارن کی تقریر، اقتباس از رودادِ مجلسِ منتظمہ اسٹوڈینٹس یونین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سر سید اور اقبال، سید کی لوحِ تربت، توقیتِ اقبال اور مآخذ و مصادر شامل ہیں۔

گر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''سر سید اور اقبال'' کے عنوان کی ذیل میں سر سید احمد خاں اور علامہ محمد اقبال کے جو اقوال پیش کیے گئے ہیں، انھیں جمع کیا جائے تو تالیفِ مذکور کا خلاصہ ہو جائے گا:

۱۔ مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے ایسے پست و پامال ہو گئے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی تحریک ان میں نہیں

ہوتی۔(سرسید)

زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہوگا اس میں حرکت مفقود ہوگی۔(اقبال)

۲۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور مضامین خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا اس میں کوشش کی کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔(سرسید)

شاعری میں لٹریچر بہ حیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔(اقبال)

۳۔ کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھائے۔(سرسید)

قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بہ منزلہ قوتِ حافظہ کے ہے۔(اقبال)

۴۔ یہ مسجد (قوت الاسلام) نہایت عجیب و غریب ہے یقین ہے کہ ایسی بڑی مسجد روئے زمین پر نہ ہوگی اور چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ حقیقت میں اپنا مثل روئے زمین پر نہیں رکھتی باوجود اس قدر بلندی اور بڑائی کے ایسی خوش وضع اور خوب صورت ہے جس کا کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔(سرسید)

مسجد قوت الاسلام دہلی کے جلال اور قوت نے مجھے اس قدر مرعوب کیا کہ اس میں نماز پڑھنے کا خیال مجھے ایک جسارت معلوم ہوا۔ اس کا وقار مجھ پر چھا گیا۔(اقبال)

۵۔ غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں ہمیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے کی ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ (سرسید)

میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے میں ایسی حالت میں اسے چھوڑ دوں تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کے مترادف نہ ہوگا۔ (اقبال)

۶۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔ (سرسید)

ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم ہونی چاہیے تا کہ اس طرح روحانی اور مادی امور کو ایک جگہ جمع کیا جائے اس زمانے میں وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زمانہ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے۔ (اقبال)

۷۔

خدا دارم دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانی کہ من دارم

(سرسید)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں اپنا

(اقبال)

سرسید احمد خان کے علمی کارناموں اور کاوشوں کو حالی سے لے کر اقبال تک اور بعد ازاں دورِ حاضر تک سراہا جا رہا ہے۔ علامہ اقبال نے سرسید کی جا بجا تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ اس کتاب میں سرسید اور ان کی تحریکِ علی گڑھ کے حوالے سے علامہ

اقبال کے افکار اور خیالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مقالاتِ سرسید (حصہ ہشتم) سرسید احمد خاں (مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)

مقالاتِ سرسید (حصہ ہشتم) تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین، مصنفہ: سرسید احمد خاں، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی۔ سنہ اشاعت معلوم نہیں۔ تالیف کے چوبیس ابواب ایک سو اناسی (۱۷۹) صفحات پر مشتمل ہیں۔ مشمولات کے عنوانات کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱۔علم ۲۔تعلیم ۳۔انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں ۴۔تعیم و تربیت ۵۔تربیتِ اطفال ۶۔غیر مفید تعلیم ۷۔ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ ۸۔ہماری تعلیم ہماری زبان میں ۹۔ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم ۱۰۔عرض داشت سرسید برائے ورنیکلر یونیورسٹی ۱۱۔طریقہ تعلیم مسلمانان ۱۲۔مذہب اور عام تعلیم ۱۳۔نظامیہ سسٹم تعلیم ۱۴۔مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق گورنمنٹ کا فرمان ۱۵۔مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے گورنمنٹ کی تدبیریں ۱۶۔مسلمان اور تعلیم زبان انگریزی ۱۷۔تعلیمی لحاظ سے کیا ضلع علی گڑھ کے نصیب جاگنے والے ہیں؟ ۱۸۔اضلاع شمال و مغرب میں تعلیم کی ترقی ۱۹۔یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والے طلبا ۲۰۔ہندوستانیوں کی تعلیم ولایت میں ۲۱۔عام تعلیم پرشیا میں ۲۲۔مصر میں علوم کی تعلیم ۲۳۔مصر کی معاشرت وراس کی تہذیب، ۲۴۔محل سرا خدیو مصر کی ناگفتہ بہ حالت۔

''علم'' کی حقیقت جاننے کے لیے سرسید احمد خاں کو محنتِ شاقہ سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلے تو انھوں نے جانوروں اور انسانوں کے درمیان فرق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعد ازاں عقل اور علم کا تقابل کیا تو علم کو عقل سے برتر پایا:

''۔۔۔۔۔۔مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ

خود یہ کام نکال سکتی ہے اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے یہ تو کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور آلہ کے ہے جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا مگر اس چیز کو ہم پہنچ دیتا ہے جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز ''علم'' ہے جس کے معنی دانستن (جاننا) ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔''[۱۳]

''تعلیم'' سے مراد لکھنا پڑھنا سیکھنا ہے۔ تعلیم کے بغیر کوئی بھی زبان سیکھنا ناممکن ہے۔ تعلیم کئی طرح کی ہوتی ہے جیسے اخلاقی، دماغی اور فنی تعلیم یا ٹیکنیکل ایجوکیشن خاص طور سے اہمیت کی حامل ہیں۔ جیسے سنگِ مرمر کو تراشے بغیر اس کا دھندلا پن اور کھردرا پن دور نہیں کیا جا سکتا ویسا ہی حال انسانی روح کا ہے انسان کا دل کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر نیکی اور وصف پوشیدہ رہتا ہے۔ سرسید اپنی تحریروں کے ذریعے نیکی کو اجاگر کرنے میں لگے رہے۔

تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا فاش غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں انسان میں رکھی ہیں انھیں تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا، نسان کی تعلیم ہے اور اسے کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔ لہٰذا انسان کو ایسی تعلیم اختیار کرنی چاہیے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ و شاداب کرے اور دل کے سوتوں کو کھول کر زندگی کو سیراب کرے۔

تربیتِ اطفال کے حوالے سے تعلیم کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے لیکن لڑکوں کے مربیوں پر بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض مقدم ان کے ماں باپ پر ہے لیکن صحیح معنوں میں تعلیم کسی بھی قوم کے متفقہ لائحہ عمل کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اگر پوری قوم اپنے اس فرض سے غفلت برتے تو پوری قوم ہی

گناہ گار اور شرم سار ہوگی۔

''غیر مفید علوم'' کی ذیل میں کچھ علوم کا تذکرہ شامل ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ علوم کیسے مسلمانوں کے لیے منفعت بخش نہیں۔ ''علمِ دین'' غیر مفید نہیں ہو سکتا۔ غیر مفید ہونے کی بحث تب کی جاسکتی ہے جب اس کے فائدے کا متعدی ہونا یا غیر مذہب والوں کے حملے سے اس کی حفاظت منظور ہو۔ جو طریقہ تعلیم مسلمانوں میں رائج ہے وہ ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے لیے بھی مفید نہیں۔ ''علمِ لسان'' میں لغت، صرف نحو، معانی، بیان، بدیع، انشا شامل ہیں۔ یہ علوم کبھی عربی اور کبھی فارسی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے ''لغت'' کے علاوہ کوئی بھی علم مفید نہیں۔ علمِ منطق، علمِ طبعی الٰہی، علمِ حساب، علم ہیئت، علمِ آرات اور علمِ طب بہ وجوہ مسلمانوں کے لیے علومِ مفیدہ کے زمرے میں نہیں آتے۔

''ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم اور گورنمنٹ'' کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے تو خواہاں تھے لیکن وہ اپنے مدرسے یا کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کے حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے ہرگز روادار نہ تھے۔ کیوں کہ وہ خیال کرتے تھے کہ حکومت کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل سرگرمِ عمل رہتی ہے۔

''ہماری تعلیم ہماری زبان میں (تہذیب الاخلاق بابت ۱۸۹۲ء صفحہ ۱۳۳ تا ۱۲۸)'' کا مطالعہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ بے شک دیگر اقوام نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ ان کی تعیلم اپنی دیسی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہے لیکن سرسید کے خیال میں ہندوستانی معاشرہ مختلف اقوام اور مختلف تہذیب و ثقافت رکھتا ہے، لہٰذا اس معاشرے کے لیے کسی ایک زبان پر متفق ہونا لازمی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلِ ہندوستان یورپی علوم و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں تک رسائی حاصل کریں بجائے اس کے کہ تنگ نظر اور متعصب ہو کر پس ماندہ رہ جائیں۔

''ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعیلم'' کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

پنجاب یونی ورسٹی کے قیام کے کسی قدر مخالف تھے۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب یونی ورسٹی صحیح اصوں پر نہیں بل کہ غلط خطوط پر قائم ہورہی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد مردہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کا احیا تھا جو سرسید کے خیال میں اہلِ ہندوستان کے لیے کسی بھی صورت میں مفید نہیں تھا۔ ان کے خیال میں قوم کو مغربی علوم اور مغربی زبان کر اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے اور گورنمنٹ کو بھی چاہیے کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ کی حکمت کو ترقی دینے کا مقصد پیشِ نظر رکھے۔

''عرض داشت سرسید برائے ورنیکلر یونیورسٹی'' کے زیرِ عنوان بتایا گیا ہے کہ ۱۸۶۶ء میں سرسید احمد خاں نے ''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' کی بناڈالی۔ انھوں نے ۱۸۶۷ء کو ایک ایسی یونی ورسٹی کے قیام کی عرض داشت پیش کی اور جسے پھر مسلسل پیش کیا جاتا رہا اور جس کے قیام کے لیے حکومت رضامند نہ تھی، وہ تھی ایسی یونورسٹی جہاں دیسی زبانوں کی ترویج واشاعت کو یقینی بنایا جاسکے۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ فرسودہ مشرقی علوم وفنون یا زبانوں کو ازسرِ نو زندہ کیا جائے اور انگریزی زبان کو ترک کر دیا جائے۔

''طریقہ تعلیم مسلمانان (تہذیب الاخلاق بابت ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ)'' کے عنوان کے تحت واضح کیا گیا ہے کہ ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' نے جو ایک سلیکٹ کمیٹی اس لیے مقرر کی کہ وہ کمیٹی خور وفکر اور باہمی مباحث کے بعد ایک رپورٹ لکھے کہ مسلمانوں کے لیے کون سا طریقہ عمدہ ہے اور کون کون سی زبان اور کون کون سے علوم اور کس کس انداز سے ان کو پڑھائے جائیں؟ اس کے ممبران کی تعداد انیس (۱۹) تھی جنھوں نے مسمانوں کے لیے ایک مشترکہ تعلیمی پالیسی مرتب کی۔ اول یہ کہ قواعد تعلیم مسمانان جن کا قائم کرنا اور جاری کرنا خود مسلمانوں کے لیے لازم ہے۔ علوم میں دینیات کی ذیل میں فقہ، اصولِ فقہ، حدیث، تفسیر، علم سیر اور علمِ عقائد، علمِ ادب میں زبان دانی وانشا پردازی اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ولیٹن، علمِ تاریخ، علم جغرافیہ، علمِ اخلاق، سیشل سائنس یعنی علم قوائے انسانی، علم منطق، علم فلسفہ، علمِ سیاست

مدن یعنی اصول گورنمنٹ، علم انتظامِ مدن یعنی پولیٹیکل اکانومی، علمِ ریاضی میں علمِ حساب، علم جبرومقابلہ، علم ہندسہ فروعات اعلیٰ علم ریاضی کی، علومِ طبیعات میں علمِ سکون، علمِ حرکت، علمِ آب، علمِ ہوا، علمِ مناظر، علمِ برق، علمِ ہیئت، علمِ آواز، علمِ حرارت، نیچر فلاسفی اور علوم خاص بائے مسلمانان میں انجینئری، اینیمل فزیالوجی یعنی علمِ حیوانات، اناٹومی یعنی علمِ نباتات، جیالوجی یعنی علمِ طبقات الارض، منرالوجی یعنی علمِ جمادات، کیمسٹری یعنی علمِ کیمیا کا حصول لازمی قرار دیا جانا چاہیے۔

طریقہ تعلیم وتربیت کے حوالے سے سرسید طلبہ کو گھر سے دور رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ جب تک ہمارے لڑکے گھروں سے علیٰحدہ نہیں ہوں گے اور تربیت حاصل نہیں کریں گے تب تک ہمیشہ خراب، نالائق، جاہل اور کمینہ صفات کے عادی رہیں گے۔ سرسید مدرسۃ العلوم کے ساتھ ساتھ ہر شہر اور ہر قصبہ میں چھوٹے چھوٹے مدارس، مکتب، حفاظتی مکتب کے قیام کے زبردست حامی تھے۔

عمرِ تعلیم کے حوالے سے چھے برس سے دس برس تک، گیارہ سے تیرہ برس تک، چودہ سے اٹھارہ برس تک، انیس سے اکیس برس تک اور بائیس سے پچیس برس تک کی درجہ بندی ''مدرسۃ العلوم'' میں کی گئی تھی۔ سلسلہ تعلیم کے شانہ بہ شانہ نئے کالجوں کے قیام کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا۔ سلیکٹ کمیٹی سے رائے طلب کی گئی تو سرسید احمد خاں، مولوی محمد عارف، مولوی سید عبداللہ، محمد یار خاں، مولوی سید زین العابدین۔ مرزا رحمت اللہ بیگ، موںوی اشرف حسین خاں، مولوی محمد سمیع اللہ خاں اور موںوی محمد اکرام حسین نے تجاویز کو پسند اور منظور کیا جب کہ مولوی سید امداد علی، مولوی قطب الدین حسن، مولوی حمید الدین، منشی محمد سبحان، مولوی محمد اسماعیل، مولوی عبدالرحمان، مولوی حفیظ الدین اور مولوی سید فرید الدین نے معمولی سے تحفظات کے ساتھ ان تجاویز سے اتفاق کیا۔

''مذہب اور عام تعلیم: تعلیم کا عام رواج بلا شمول مذہبی تعلیم کے ناممکن ہے (تہذیب الاخلاق جلد ا نمبر ۲ بابت شوال ۱۲۸۷ھ)'' کی ذیل میں سرسید نے بچوں کی

دنیوی تعیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ اسی میں مسلمانوں کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

''نظامیہ سلسلہ تعلیم (تہذیب ارخلاق جلد اول نمبر ۷ بابت ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ)'' کی ذیل میں اس سلسلہ تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے مسلمانوں کے سلسلہ نظامیہ میں رائج تھا۔ اس سلسلہ میں رائج علوم اور کتب میں علمِ صرف، علمِ نحو، علم معانی و بیان و بدلیع، علمِ ادب، علمِ منطق، علم طبعی الٰہی، علمِ ہندسہ، علمِ ہیئت، علم کلا، علم فقہ، علم اصوں، علم تفسیر، علمِ فرائض، علم وضعِ آلات، اصولِ علمِ حدیث، علم لغت اور علمِ طب شامل تھے۔ سنی اور شیعہ کی تعلیم میں کچھ فرق نہیں سوائے اس کے کہ مندرجہ بالا کتب سنیوں کی ہیں، شیعہ کی کتب الگ ہیں سوائے مندرجہ بالا کتب میں سے چند ایک کے۔ اس سلسلہ تعلیم کو سر سید قوم کے لیے ناکافی سمجھتے تھے۔

''مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے متعلق گورنمنٹ کا فرمان'' اور ''مسلمانوں کی تعیم و تربیت کے لیے گورنمنٹ کی تدبیریں'' کی ذیل میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کے اٹھائے گئے اقدامات کو کافی سمجھتے ہوئے سر سید مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا شکر گزار ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

''مسلمان اور تعیم زبان انگریزی'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ وہ زمانہ اب نہیں رہا کہ مسلمان انگریزی زبان کی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اسے بہ رضا و رغبت حاصل کیا یا بہ امرِ مجبوری۔ بہ ہر حال انگریزی زبان کی تعلیم مسلمانوں کے لیے مفید اور اہمیت کی حامل ہے۔ سر سید نے بعض فلسفیوں کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو امور ظاہر ہوتے ہیں بلاشبہ ان کے اسباب و علل موجود ہوتے ہیں مگر وہ اسباب کیوں کر پیدا ہو گئے اس کا پتا نہیں چلتا۔ یہی قسمت ان اسباب کو پیدا کرتی ہے۔ یہ خیال درست ہے یا غلط مگر مسلمانوں کی تعلیم پر صادق آتا ہے۔ اس بات کے اسباب تو موجود ہیں کہ قوم کو مسلمانوں کی تعیم کا خیال پیدا ہو گیا ہے لیکن اس بات کا سبب معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے دل میں یہ بات سمائی ہے

کہ قوم کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا سامان متفقہ کوشش سے مہیا کرنے کے بدلے چھوٹے چھوٹے ناقص اور بے سود مدرسے قائم کر کے ان کی عمر ضائع کریں۔ اس نامعلوم سبب کو قسمت سمجھ لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو بدقسمتی نے گھیرا ہوا ہے اور وہ بدقسمتی ان کو تعلیم حاصل نہیں کرنے دیتی۔

''تعلیمی لحاظ سے کیا ضلع علی گڑھ کے نصیب جاگنے والے ہیں'' عنوان کی ذیل میں سرسید لکھتے ہیں کہ علی گڑھ کے نصیب ابھی تک نہیں جاگے بلکہ اہلِ علی گڑھ نے ابھی تو سوتے سوتے انگڑائی لی ہے، آنکھیں مل رہے ہیں، بعضوں نے آنکھیں کھولی ہیں لیکن نیند کا خمار ابھی تک باقی ہے۔

''اضلاع شمال و مغرب میں تعلیم کی ترقی'' کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو شمال اور مغرب کے اضلاع سے تعلیمی رپورٹ بھیجی گئی جو سرسید اور قوم کے لیے حوصلہ افزا ہونے کی بجائے حوصلہ شکن اور مایوس کن تھی۔ اس کے باوجود سرسید نے اپنی آرا اور تجاویز دینا مناسب سمجھا اور اصلاحِ احوال کے لیے کوششوں پر زور دیا۔

''یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والے طلبا'' میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان طلبا کے یورپ میں تعلیم کے حصول کے مقصد کو پانے کے لیے ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو نوابوں اور سرداروں سے ڈونیشن لے اور ڈونیشن کی رقم چوبیس روپے مقرر کی گئی۔ ایسوسی ایشن کی کارروائی کے لیے قواعد مرتب کیے گئے۔ ''ہندوستانیوں کی تعلیم ولایت میں'' کے حوالے سے تجاویز مانگنے والوں کو مشورہ دینے سے قبل سرسید یہ دیکھتے کہ وہ لڑکا ذہین، ہوشیار، لائق، ہونہار ہو اور طبعِ سلیم کا مالک ہو تو وہ ولایت جائے۔ اس کے برعکس مشتبہ طبیعت کے حامل طلبا کو ولایت بھیجنے کی رائے وہ نہیں دیتے تھے۔ عمدہ اوصاف کے مالک طلبہ سے سرسید، سول سروس، بیرسٹری، ایگریکلچر، انجینئری، ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے تا کہ وہ حصولِ تعلیم کے بعد ہندوستان لوٹ کر قوم کے لیے معاشی استحکام کا باعث بنے۔

''عام تعلیم پرشیا میں'' کے زیرِ عنوان پرشیا (جرمنی) کے فی مدرسہ طلبہ کے اعداد و شمار پیش کیے گئے جن کے مطابق جرمن فوج میں بھرتی ہونے والوں میں سو میں سے دو ان پڑھ ہوتے تھے لیکن ان اعداد و شمار میں بہ تدریج کمی واقع ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک ہزار میں سے ایک ان پڑھ نکالنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس کے برعکس ہندوستانیوں کے ان پڑھ ہزار فوجیوں میں ایک پڑھا لکھا بھی مشکل سے ملتا ہے۔

''مصر میں علوم کی تعلیم'' کے عنوان کے تحت سرسید جامعہ الازہر کا تقابل کرتے ہوئے اسے ہندوستانی مدرسوں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ ان مدارس کے نظام تعلیم کی یکسانیت اور دیگر برائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

> ''ہمارا مقصد ان تحریروں سے اپنی قوم کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ جو مقدس اشخاص علوم مفیدہ کے حاصل کرنے سے قوم کو باز رکھتے ہیں ور مذہبی تعصب کو کام میں لاتے ہیں اور مذہبی ٹٹی کی آڑ میں لوگوں کو اغوا کرتے ہیں وہ قوم کے، اسلام کے، مسلمانوں کے درحقیقت دشمن ہیں۔ بعضے تو صرف اپنی دکانداری اور مشیخت قائم رکھنے کو اور بعضے صرف اپنا تقویٰ اور تقدس لوگوں میں جتانے کو قوم کو غارت کرتے ہیں ان کا دعویٰ دینداری ادعائے تقدس محض جھوٹا ہے۔ اسلام ایک نہایت روشن اور سچا جوہر ہے۔ اس کو علوم سے اور حقائق اشیا کے معلوم ہونے سے جہاں تک کہ طاقتِ بشری میں ہے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ البتہ علما کی دوکانداری اور مقدسین کے بناوٹی تقدس اور متوہمین کے توہم باطل کو ضرور نقصان پہنچتا ہے۔ پس قوم کو اپنے حال پر خود غور کرنا چاہیے کہ درحقیقت ان کو کیا کرنا چاہیے۔''[۶۲]

''مصر کی معاشرت اور اس کی تہذیب'' کے عنوان کے تحت صراحت سے بتایا گیا ہے کہ مصر کی تہذیب و معاشرت ملی جلی سی ہے جس میں یورپی، مسلمان امراد روسا اور عہدے دار، عیسائی اور متوسط اور ادنیٰ درجے کے مسلمان باشندے موجود

ہیں۔ بعدازاں ان چاروں طبقات کی تہذیب وتمدن کا تقابل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مصری باشندوں اوران کے طرزِ معاشرت کا مقابلہ ہندوستانی تہذیب ومعاشرت سے کرتے ہوئے مصری تہذیب وثقافت کو ہندوستانی تہذیب ومعاشرت سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ قرار دیا گیا ہے۔

آخر میں ''محل سرا خدیو یہ مصر کی ناگفتہ بہ حالت'' کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے لیکن اس کا تقابل ہندوستانی محل سراؤں سے کرکے اسے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس جلد میں سر سید کے علمی وتعلیمی افکارونظریات پر مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ مقالات کی یہ جلد اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ سر سید کا بڑا کارنامہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم کی ترغیب ہی ہے اور اس جلد میں ان کے علمی وتعلیمی افکار پر مضامین کی جمع وتدوین عمدہ اصولوں پر کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، سر سید کا علمی کارنامہ، کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۴ء، ص ۹

۲۔ نور الحسن، نقوی، سر سید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۹ء، ص: ۷

۳۔ ایضاً، ص ۴۸۔۴۹

۴۔ ایضاً، ص ۷۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۲

۶۔ اے۔ ایچ کوثر، ڈاکٹر اردو کی علمی ترقی میں سر سید اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، کراچی، لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء ص ۴۔۵

۷۔ ایضاً، ص ۸۵

۸۔ ایضاً، ص ۳۹۱

۹۔ ایضاً، ص ۳۹۳

۱۰۔ اختر الواسع سر سید کی تعلیمی تحریک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۔۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۲۔ اصغر عباس، سر سید، اقبال اور علی گڑھ، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص ۳

۱۳۔ سر سید احمد خاں مقالات سر سید، حصہ ہشتم، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۰ء، ص ۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔۱۶۳

باب چہارم

سرسیّد احمد خاں کے سیاسی و تاریخی افکار اور ان پر لکھی گئی کتب کا تنقیدی جائزہ

سرسید احمد خاں کی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم ثابت کیا اور حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے افکار کو آگے بڑھایا۔ دو قومی نظریہ کی اصطلاح سرسید نے ہی سب سے پہلے استعمال کی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان جداگانہ ثقافت رسم و رواج اور مذہب کے حامل ہیں اور ہر اعتبار سے ایک مکمل قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی علاحدہ قومی حیثیت کے حوالے سے سرسید احمد نے ان کے لیے لوکل کونسلوں میں نشستوں کی تخصیص چاہی۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لیے کھلے مقابلے کے امتحان کے خلاف مہم چلائی، اکثریت کی مرضی کے تحت قائم ہونے والی حکومت والے نظام کو ناپسند کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی علاحدہ پہچان کروائی اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ان کے لیے تحفظات مانگے۔ سرسید مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کو ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز اے۔او۔ ہیوم کی کوششوں سے قائم ہونے والی آل انڈیا کانگریس سے دور رکھا۔ بعد میں ہونے والے واقعات نے سرسید کی پالیسی کی افادیت کو ثابت کر دیا ان کو بجا طور پر پاکستان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ سیاست سے دور رہتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ تعلیم کے حصول اور معاشی و معاشرتی طور پر بحال پر دیں تاکہ وہ ہندوؤں کے برابر مقام حاصل کر سکیں۔ سرسید ہندو مسلم اختلافات کو ختم کر کے تعاون اور اتحاد کی راہ پر گامزن کرنے کے حق میں بھی تھے۔ انھوں نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی مسلسل کوششیں کیں۔ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ بھرتی کیے اور ہندو طلبہ کو داخلے دیے ہندوؤں نے اردو کے مقابل ہندی کو سرکاری دفاتر کی زبان کا درجہ دلوانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۸۵۷ء میں اردو ہندی تنازعے نے سرسید کو بددل کر دیا اور انھوں نے صرف اور صرف مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی تحریک کے ذریعے کام شروع کر دیا۔ زبان کا تنازعہ سرسید کی سوچ اور عمل کو بدل گیا۔ انھوں نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر کے سیاسی اور دیگر مسائل کے حل

تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

سرسید بتدائمیں ملک کو دستوری مراعات دوانے کے سب سے بڑے حامی تھے۔وہ آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دینے پر مجبور ہوئے کہ ملک کو سیاسی مراعات دینے کی ضرورت نہیں ہے۔بعدازاں وہ انتخابی طرز حکومت دینے کے بھی خلاف ہو گئے تھے کیوں کہ ان کی نظر اور فکر میں ان کے پیش نظر یہ امر تھا کی مسلمان یک عددی اقلیت ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ ہندوؤں کے دست نگر رہیں گے۔ان کا خیال یہ بھی تھا کہ مسلمانانِ ہندانگریزوں کی وفاداری میں اپنا رشتہ خلافتِ ترکی سے بھی منقطع کر لیں گے۔اسی نظریہ کے تحت انھوں نے سید جمال الدین افغانی کے مذہبی وسیاسی افکار کی حمایت اور تائید نہیں کی۔وہ شاید اس بات کا تصور اور ادراک نہیں کر سکتے تھے کہ برطانیہ کو برصغیر میں دوام حاصل نہیں ہوسکے گا اور کچھ عرصہ کے بعد انھیں یہاں سے بے نیل مرام واپس ہونا پڑے گا وہ بین ارقوامی سیاسی تبدیلی اور حکومت کے مدوجزر کا خیال نہیں رکھتے تھے،اس لیے وہ بین الاقوامی سیاسی تبدیلی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب کانگریس کا وجود عمل میں آیا تو سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شمولیت سے دور رکھا۔اس کی مختلف وجوہات ناقدین ادب نے بتائی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس باب میں ان کتب کو زیر بحث لایا جارہا ہے جن میں سرسید کے سیاسی افکار کے حوالے سے تحقیقی یا تنقیدی کام کیا گیا ہے۔

پاکستان کا معمارِ اوّل (۱۹۶۷ء) از صفدر سلیمی

صفدرسیمی کی تالیف ''پاکستان کا معمارِ اوّل'' اشرف پریس۔ایبک روڈ۔لاہور سے طبع ہوئی جس کا سنِ اشاعت دیا گیا۔ادارہ طلوعِ اسلام۔گلبرگ۔لاہور سے نشر کیا گیا۔یہ کتاب دوسو آٹھ (۲۰۸) صفحات پر مشتمل ہے۔''فہرست مشمولات'' میں پیش لفظ،باب اول ''اک جہانِ تازہ کا پیغام''،باب دوم ''پولیٹیکل کردار کی روشنی

میں''، باب سوم''فکرو اجتہاد کے میدان میں''، باب چہارم''قومی تعلیم کے لیے نفیرِ انقلاب''، باب پنجم''نگارش وخطابت کا عراقِ دلنشیں'' اور باب ششم''ایک باغ وبہار شخصیت'' شامل ہیں۔ اس کتاب کا غالب موضوع سرسید کے سیاسی افکار ہے۔

پیش لفظ میں''پاکستان کا معمارِ اول'' کی تالیف کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ذیل میں دیکھیے:

''یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کے نئے دور میں ابھی تک سرسید کے مقام کو کما حقہ اہمیت نہیں دی گئی۔اسی احساس کی بنا پر محترم صفدر سلیمی صاحب کے قلم سے جہاتِ سرسید کے موضوع پر یہ سلسلہ مضامین شائع کیا جارہا ہے۔اس سے قبل یہ سلسلہ ماہنامہ''طلوعِ اسلام'' میں زیرِ اشاعت آچکا ہے اور اب اسے یکجا طور پر سامنے لایا گیا ہے۔''[1]

یہ تالیف دراصل سرسید احمد خاں سے عقیدت کا والہانہ ظہار دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ہر ایک لفظ سرسید سے والہانہ عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔مسلمانانِ ہند کی محبت میں سرسید کو ایسی اونچی مسند پر براجمان کردیا گیا ہے جس کے اوپر اور کوئی مسند دکھائی نہیں دیتی۔بعض حقائق اگرچہ مسلم دشمنی پر محمول کیے جاسکتے ہوں۔ سرسید کو سراپا اوصافِ حمیدہ سے متصف ہستی سمجھا گیا ہے جس میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔''پیش لفظ'' سے پہلے صفحہ''ج'' پر سرسید کا قول نقل کیا گیا ہے جس کے مطابق سرسید نظریۂ پاکستان کے بانی ثابت کیے جاتے ہیں یا کیے جاسکتے ہیں۔ یہ قول ۱۸۶۷ء کا ہے۔

''اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جس کا ظہور'' کے زیرِ عنوان آزادی اور استقلال کی متاعِ بے بہا سے مالا مال آزاد قوموں کی صف میں مسلمانانِ ہند کا وجود سرسید کی دین سمجھا گیا ہے۔سرسید نے اس قوم کی ڈوبتی ہوئی نیّا کو اس وقت پار لگایا جب یہ حالات اور وقت کے شدید تھپیڑوں کی زد میں تھی۔

اس حوالے سے مؤلف کا اندازِ نظر ملاحظہ کیجیے:

''عین اس وقت جبکہ پردۂ افلاک سے ہماری زندگی کا سب سے اندوہ ناک
حادثہ برپا ہوا چاہتا تھا، قومی زندگی کے ایک نامعلوم اور غیر معروف گوشے
سے سرسید علیہ الرحمۃ ایسا گراں مایہ زعیم صبح امید کا ستارہ بن کر نمودار ہوا
وراس نازک اور کڑے مرحلہ پر ملتِ بیچارگاں کا قافلہ سالار بن کر عرصۂ
کارزار میں مردانہ وار کود پڑا۔ یہ جرأتِ رندانہ کس قدر صبر آزما ثابت ہوئی
بس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جہاں سرسید کو سیلابِ بلا کی بپھری ہوئی
موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں اپنی ہی اس کشتی کے مسافر اس کے دشمن
جان بن کر سامنے آگئے جسے بچانے کے لیے اس نے جان کی بازی لگائی
تھی۔ بے گانوں سے بڑھ کر یگانوں کی ''کرم فرمائیاں'' تھیں جو کبھی اس
کے پائے استقلال کے لیے نوکیلے کانٹے بنیں اور کبھی دشمنوں کے ہاتھ کی
تلوار بنیں، لیکن خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں اس ''دیوانے'' پر جس کی
دیوانگی نے بالآخر سب کو مات دی، اس کا جذبۂ صادقہ، اس کا عزم
واستقلال، اس کا خلوص وایثار اور جوشِ کردار، جذب ومستی کے والہانہ کیف
میں تمام موانعات کو زیروزبر کرتے چلے گئے، مخالفت کی
تندوتیز آندھیاں، اس کے عزم صمیم کو غبار آلود نہ کرسکیں۔ بغض وعناد کے
شعلے اس کے جذب ومستی کی مسکراہٹیں نہ چھین سکے۔ حوادث کی بجلیاں اس
کے ولولوں کو شکست نہ دے سکیں۔ مصائب وآلام کی تاریکیوں میں اس کے
خلوص وایثار کی آب وتاب ماند نہیں پڑی۔ اپنی محبوب ملت کی نشاۃِ ثانیہ
درعروج واقبال کی بازآفرینی کے لیے وہ ہر دشمنِ ملت سے ٹکرایا۔ برادرانِ
وطن سے لڑ۔ برطانوی سامراج کے مگروراور اکڑ باز نمائندوں سے لڑا۔
مذہب اور شریعت کے بر خود غلط اجارہ داروں سے لڑا۔ ایک سرسید کی تنہا
جان تھی جو قوم کو موت کے چنگل سے بچانے کے لیے ایک ایک محاز پر
چومکھی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ زندگی کے آخری سانس اور خون کے آخری قطرہ

تک ہر محاذ پر مردانہ وار لڑتا رہا اور بالآخر زخموں سے چور چور ہو کر گرا۔ دمِ مرگ اس کے چہرے پر ایک کامیاب زعیم اور فتح مند قافلہ سالار کی سنجیدہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کی بے مثال فتح مندیوں کا نشان تھی وہ اپنی کشتی کو بھنور سے بچا کر اس کا رخ ساحلِ مراد کی جانب پھیر چکا تھا وراس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لیے اس بنیا کے سینکڑوں کھیون ہار اب یک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ...اور یہی ہے ایک قافلہ سالار کی فتح مندیوں کی دلیل جسے کاتبِ ازل نے سرسید کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔''[۴]

مؤلف نے سرسید پر ملتِ اسلامیہ کی جانب سے لگائے گئے الزامات کے جوابات دینے کی کوشش تو کی اور بھرپور انداز سے کی لیکن وہ اپنی تحریر میں کئی ایک سوالات تشنۂ جواب چھوڑ گئے جیسے یہ سوال کہ ''یگانوں کی کرم فرمایاں'' تھیں جو کبھی اس کے پائے استقلال کے لیے نوکیلے کانٹے بنیں اور کبھی دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ثابت ہوئیں۔'' سے ان کی کیا مراد تھی؟ مان لیا کہ مسلمان ان کے مخالف تھے لیکن مسلمان کون سے دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار بنے؟ آیا وہ دشمن انگریز اور ہندو تھے یا پھر ہندوستان سے باہر دنیا کے کسی کونے میں پائے جاتے تھے؟ حالات وواقعات تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی دشمنی انگریزوں اور ہندوؤں سے تھی جنھیں سرسید مسلمانوں کا دشمن تصور نہیں کرتے تھے تو پھر وہ دشمن کون تھا جو پردۂ غیب میں رہا؟ اس کا جواب مؤلف کو دینا چاہیے تھا۔

''سرسید احمد خاں پولیٹکل کردار کی روشنی میں، ایسی چنگاری بھی یارب! اپنی خاکستر میں تھی'' کے زیرِ عنوان تحریر کرتے ہیں کہ سرسید کی سیاسی تگ وتاز کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس تلخ حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ ''کھلنڈرا نوجوان'' جب شباب وشعور کی وادی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا تو وہ دور عالمِ اسلام اور دنیائے مشرق دونوں کی تاریخ کا ایک نازک ترین مرحلہ تھا۔ ایشیائی قومیں حسرت ویاس کے آنسوؤں سے اپنے سرمایۂ حیات کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اور عالمِ اسلام

بے بسی اور بے آبروئی کی تاریکیوں میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ نہ توان درماندہ قافلوں کا کوئی غمگسار، اور راہ نما تھا ورنہ ان ڈوبتے ہوئے سفینوں کا کوئی کھیون ہار اور ناخدا۔ نہ اس اندھیرے میں امید کی کوئی کرن جلوہ بار تھی اور نہ اس راکھ میں غیرت کی کوئی چنگاری شعلہ زن۔

بے بسی، مایوسی اور شکست کے اس جگر پاش ماحول میں مغربی استعمار کی ہولناکیوں کو اپنے ارمان پورے کرنے کا سنہری موقعہ ہاتھ لگا۔ وہ گدھوں اور کرگسوں کی طرح مشرق کی ''شکارگاہوں'' کی طرف بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی دم توڑتی قوموں کے گوشت پوست اور خون سے کام و ذہن کی آزمائش شروع کردی۔ دیگر ممالک کی طرح برصغیر ہند میں بھی یہ مغربی سامراج عجز و انکسار کی معصومانہ اداؤں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور تھوڑی سی مدت میں یہاں کے سیاہ وسفید پر مسلط ہوگیا۔

زوال وانحطاط اور غلامی کی اس قومی بے چارگی میں کیا کسی کے تصور میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ ایک کھلنڈرا اور لاابالی چھوکرا جو دلی کے گلی کوچوں میں کنکوے اڑایا اور ناچ مجرے دیکھا کرتا تھا اور پھر باپ کی وفات کے بعد تلاشِ روزگار کے لیے انگریزی حکومت کے دفتروں میں مارا مارا پھرتا تھا ... ایک دن اسلامیانِ ہند کی مسیحائی کا شرف حاصل کرے گا۔ اور غم و غصہ اور غیرت وحمیت کی بجلیاں، تدبر و فراست کے دامن میں سمٹائے اس قلندرانہ انداز سے عرصۂ کارزار میں داخل ہوگا کہ ڈوبتی ہوئی نبضیں حیاتِ تازہ سے معمور ہو جائیں گی اور برصغیر کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ لیکن یہ تاریخی معجزہ نمودار ہوا اور اسی نوجوان کے ہاتھوں رونما ہوا جس نے کبھی معاشی پریشانیوں میں صدر امینی کے دفتر میں ایک معمولی سررشتہ دار کی آسامی قبول کی تھی اور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو برٹش امپریلزم کے بڑے بڑے ستون اس کی عظمت کے حضور سرنگوں ہو کر خراجِ تحسین پیش کررہے تھے اور اس کی ملت کا سفینہ بھنور کو شکست دے کر ساحلِ مراد کا رخ کر رہا تھا۔

مؤلف نے ''سرسید احمد خان: ایک بانگِ رحیل۔ کاروانِ فکر واجتہاد کے لیے

(ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی)'' کے زیرِ عنوان واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک قافلہ سالارِ انقلاب کی عظمت کا ممتاز اور موثر ترین پہلو ہمیشہ یہی رہا کہ اس نے قوم کے تصورات میں کس قدر تبدیلی پیدا کی؟ اس کے ذہنی جمود کے تاریک گوشوں کو کسی تب و تاب اور ذوق و شوق سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ندرت فکر و عمل کو کس قدر زندگی، روشنی اور توانائی عطا کی؟ لاریب کہ ایک سپہ سالار جنگی کارناموں سے اپنی اوم کے سر فتوحات کے سہرے باندھ سکتا ہے، بیشک ایک سیاسی زعیم اپنے تدبر و فراست سے ملت کی سربلندی اور عظمت و شہرت کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ ان معرکہ آرائیوں اور کامرانیوں کی اہمیت سر آنکھوں پر، لیکن یہ بھی تو یاد رکھیے کہ جنگی فتوحات کے قصرِ مشید کو مخالفین کی قوتِ بازو کھنڈرات میں بدل سکتی ہے۔ بساطِ سیاست کی ہر کامیابی مہروں کی گردش سے خاک میں ملائی جا سکتی ہے۔ لیکن قوتِ بازو کی تمام معجز نمایاں اور تدبر کی فسوں کاریاں مل کر بھی اس قوم کو شکست نہیں دے سکتیں جس کے فکر و عمل کی توانائیاں ایک داعیِ انقلاب نے شعوری انقلاب کے آبِ حیات سے پروان چڑھائی ہوں۔ وہ قافلہ سالار سرسید احمد خاں تھے۔

سرسید دین کے معاملے میں ایمان علی وجہ البصیرت کا قائل تھا اور مسلکِ تقلید کا شدید ترین مخالف۔ غور و فکر اور علم و بصیرت کے جذبہ و احساس سے انھوں نے دین کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی فکر و بصیرت بالآخر اس نتیجہ تک پہنچی کہ کسی مسئلہ کی صداقت کا معیار صرف خدا کی آخری کتاب ہے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر انھوں نے تفسیر القرآن کا آغاز کیا۔

ہیومن ازم کی تحریک کے امام جولین ہکسلے کو ایک ایسے مذہب کی تلاش تھی جو ایک طرف سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے فیض یاب ہو سکیں تو دوسری جانب اس قدر عمیق اور پُر معنی ہو کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ اس سلسلے میں مؤلف نے سرسید کی تقریر ۱۸۸۴ء کا حوالہ دیا ہے جس کی تلاش میں جولین ہکسلے اڑسٹھ سال کے بعد نکلا۔ سرسید کے خیال میں قرآن مجید ہی ایسا کلام ہے جس

میں یہ صفات موجود ہیں۔

مؤلف نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے مروجہ مذہب کے مطابق صدیوں سے غلام اور لونڈیاں غلام معاشرے کا جزو خیال کیے جاتے تھے۔ مولانا مودودی بھی لونڈی اور غلام کے اس تصور سے باہر نہ نکل سکے۔ ان کے خیال میں سرسید کے علم و بصیرت اور تدبر فی القرآن نے شہادت دی کہ غلامی کا جواز اسلام کے مقدس اور پاکیزہ چہرے پر ایک بدنما داغ ہے، اس لیے سرسید نے خطباتِ احمدیہ، تفسیر القرآن اور پھر رسالہ ابطالِ غلامی میں اس کے خلاف لکھا۔

مؤلف کے خیال میں سرسید، حضور ﷺ سے محبت، معجزاتِ رسولؐ، واقعۂ معراج، حجیتِ حدیث، عقیدہ ناسخ و منسوخ، تقاضائے وقت کا جواب، تعددِ ازدواج، ملوکیت اور اسلام، سرمایہ داری کے نظریہ اور طائرِ پیش رس کے حوالے سے روایتی تقلید سے بالاتر ہو کر عقل و دانش پر مبنی اپنا ایک الگ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے مخالفت کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ ان کے خلاف کتب لکھی گئیں اور رسائل کا اجرا کیا گیا تاکہ ان کی عقلیت پسندی کو رد کیا جا سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ نتیجہ کے طور پر سرسید پر کفر و الحاد کے فتوے جاری کیے گئے لیکن سرسید اپنے افکار و خیالات اور ان کے نتیجے میں عمل سے باز نہ آئے۔

مؤلف ''سرسید احمد خاں قومی تعلیمات کے لیے نفیرِ انقلاب (جمیل تر ہیں گل ولالہ فیض سے اس کے)'' کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ سرسید کی سیاسی بصیرت اور اس کے دوررس نتائج کا کما حقہ جائزہ لینے والے بہت کم ہیں۔ اسی طرح معدودے چند افراد ان کے فکر و اجتہاد کی اصولی اور انقلابی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی معقول صلاحیت رکھتے ہوں گے کیوں کہ عوام کی سطحی نگاہ اور جذباتی روش فکر و نظر کی ان دور اندیشیوں تک رسائی حاصل ہی نہیں کر سکتی۔ وہ تاریخ کے بین السطور اور زمانے کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے رموز و حقائق کا احاطہ بہ مشکل کر سکتی ہے۔ اس عوامی نفسیات کی بنا پر ہمارے عوام کے نزدیک بھی سرسید کی عظمت و شہرت کا معیار وہی

مرکز تعلیم و تربیت قرار پاتا ہے جس کی پُروقار عمارتوں اور پُر بہار سبزہ زاروں میں انھوں نے اپنی قومی نشاۃِ ثانیہ کی صبحِ بہار کو ابھرتے دیکھا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ایک صدی کی مسلسل فکری و سیاسی تگ و دو کے نتیجے میں ہمارا کاروانِ شوق ارتقائی مراحل سے گزر کر نئی منزل تک پہنچا ہے۔

س باب کے دیگر موضوعات میں، سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام، سرسید کی دعا، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا، اردو زبان کے خلاف برادرانِ وطن کی یلغار، انگلستان کا سفر، واپسی، نالۂ نیم شب، دارالعلوم علی گڑھ کا قیام، سرمایہ کی فراہمی، کیا کچھ نہ کیا پُرشکوہ عمارتوں کی تعمیر، عزت و شہرت سے بے نیازی، تعلیمی انقلاب، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، تہذیب الاخلاق کا پیغامِ بیداری، مذہبی طبقہ میں انقلاب، حدیثِ دیگراں، دارالعلوم کی امتیازی خصوصیت اور اسلام سے وابستگی جیسے موضوعات شامل ہیں۔

مؤلف کا ''سرسیّد احمد خاں: نگارش و خطابت کا عراق دل نشیں (آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن)'' کے زیرِ عنوان نقطۂ نظر یہ ہے کہ گزشتہ پچیس برس میں ہماری فتح مندی اور کامرانی کے انقلاب انگیز معرکے کو فراموش کر بیٹھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سرسید جیسی شخصیت بھی کافی حد تک نظر انداز ہوگئی کیوں کہ یہ سراسر سرسید اور ان کے جانشینوں کے خلاف پیدائشی اور گھناؤنے بغض و عناد کا نتیجہ ہے لیکن وہ یہ مانتے ہیں.

> ''تاریخ کے ان مستور حقائق سے جوں ہی ''خود فراموشیوں'' کا یہ پردہ ٹھے گا اور ماضی کے مطلعِ تاریخ سے سرسید جیسے سالارِ انقلاب کی شخصیت پنے درخشندہ کارناموں کے جلو میں ابھر کر سامنے آئے گی تو سب ایک بار پھر یہ محسوس کریں گے کہ ایک صدی قبل صبحِ امید کا یہ روشن ستارہ ہمارے آسمانِ تقدیر پر نمودار نہ ہوتا، اور یہ بانگِ رحیل ہمیں آمادۂ سفر نہ کرتی، تو متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں ہماری موت کا مرثیہ لکھا جا چکا ہوتا، اور اس برصغیر کے نئے خاکوں میں ہماری قومی حیثیت ایک قبرستان سے زیادہ نہ

ہوتی۔ حیاتِ سرسید کو اس تیزی سے بھول جانا ہمارے نزدیک ہماری قومی بدنصیبیوں کا افسوسناک نشان ہے اور سرسید کے جانشینوں کو بالخصوص آج یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ اس متاعِ عزیز کے بارے میں ان کا یہ تغافل ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔۔۔قومی خودکشی، خودفریبی بل کہ خدافریبی کا شاید ہی کوئی ایسا حادثہ تاریخ میں نمودار ہوا ہو کہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک قوم نے ایک صدی تک مسلسل جان لڑائی ہو۔ آگ اور خون کی خندقیں راہ میں عبور کی ہوں اور پھر جب وہ اسلام کے نام پر ایک آزاد مملکت میں اپنا پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئی ہو تو وہاں تشکیلِ دین کی نازک ذمہ داریوں کی امامت میں ان عناصر پر تکیہ کر لیا ہو جو نہ صرف دین کی کسی ایک مستقل قدر پر کبھی آپس میں متفق نہ ہو سکے ہوں بل کہ انھوں نے ان زعمائے ملت کے خلاف اپنی آستینوں میں بغض وعناد اور جوشِ انتقام کی بجلیاں بھی چھپا رکھی ہوں جن کے ایک صدی کے اضطراب مسلسل درستیِ پیہم نے قوم کو اس منزلِ مقصود تک پہنچایا ہو حالانکہ آج کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان عناصر نے نہ صرف سرسیدؒ سے لے کر قائدِ اعظمؒ تک تمام زعمائے ملت سے دشمنانِ دین سے بڑھ چڑھ کر کھلی جنگ کی بل کہ اس تحریک کو بھی اپنی فتنہ انگیز اور گھناؤنی مخالفت کے زہریلے تیروں سے لہولہان کیا جو آزاد اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے سرسید کے پیچ وتاب کی صورت میں ابھری اور اقبالؔ اور جناح کے فکر وعمل سے حاصلِ مراد کو پہنچی۔''[۳۱]

عنوانِ مذکور کی ذیل میں مؤلف نے سرسید کے اوصاف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان خصوصیات میں، حقیقت نگار مصنف، قوتِ استدلال کے عنوان کی تحت سرسید کی زبردست استدلالی قوت، سادگی اور بے ساختگی، ندرتِ فکر اور تجدد پسندی کا اعجاز، چند نقوشِ تحریر کے عنوان کی ذیل میں سرسید کی عمدہ تحریریں شامل کرنا، ایک جائزہ کے

عنوان کے تحت سر سید کی مذہبی، علمی اور تاریخی نگارشات کا مختصر جائزہ، سر سید کا ملکۂ خطابت، اندازِ تقریر کی اثر انگیزیاں، خطابت کی طرح نو، ایک عظیم پارلیمنٹیرین، قانون سازی کا ریکارڈ، تعلیمی کمیشن میں، البرٹ بل پر معرکہ آرا تقریر، جیسی خصوصیات شامل ہیں۔

''سر سید احمد خان: ایک باغ و بہار شخصیت۔ فطرت کا سرودِ ازلی جس کے شب و روز'' عنوان کی ذیل میں سلسلۂ تعارف کی آخری کڑی پیش کی گئی ہے جس کے ساتھ ہی سر سید کی تعارفی کڑیوں کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مؤلف ان کڑیوں کو جوڑ کر باقاعدہ زنجیر کی صورت دے کر بہت شاداں دکھائی دیتے ہیں۔

اس زنجیر کی تکمیل کے اثرات کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''ہم مطمئن اور مسرور ہیں کہ ہماری یہ کوششِ ناتمام وقت کے ایک اہم تقاضے کی بجا آوری کا سامان پیدا کرے گی۔ اس کی بدولت گھناؤنی مخالفت کے بہت سے گرد و غبار ڈھل جائیں گے اور ہماری صبحِ انقلاب کا وہ درخشندہ ستارہ اپنی اس حقیقی آب و تاب سے سب کے سامنے آ جائے گا جس کی تابناکیوں سے مایوسی اور شکست کی تاریک راہوں میں نشاۃِ ثانیہ کی سینکڑوں کرنیں جگمگا اٹھی تھیں اور بہت سے سہانے خواب محسوس و مشہود اور زندہ و پائندہ حقائق میں تبدیل ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بل کہ سر سید کے جانشین آج پہلی بار خود فراموشیوں کے شبستانوں سے انگڑائیاں لے کر اٹھیں گے اور اس عزمِ صمیم سے مالا مال ہوں گے کہ پاک سر زمین میں علی گڑھ تحریک کے احیا کے سامان پیدا کریں اور اس مملکت کی تعمیری امنگوں کو اس روحِ انقلاب سے مالا مال کر دیں جس کی تڑپ اور خلش سے ایک صدی قبل علی گڑھ کے ویرانوں میں زندگی سے بھرپور ہنگاموں نے کروٹ لی تھی اور ذوقِ انقلاب کی ان حیات آفریں لہروں نے برصغیر کے آخری گوشوں تک سب کے قلب و نظر کو متاثر کیا تھا۔''[۲۴]

مؤلف نے سرسید کے مسلم معاصرین میں سید جمال الدین افغانی کو جوشِ کردار سے تو سرسید سے اوپر مقام اور درجہ دیا ہے لیکن چوں کہ ان کے جوشِ کردار میں حقائق سے زیادہ جذبات کی آگ شعلہ زن تھی، اس لیے مؤلف سمجھتے ہیں کہ نتائج کے اعتبار سے ان کی جدوجہد کو وہ تعمیری مقام حاصل نہ ہو سکا جو تاریخ میں اپنے مستقل اثرات مرتب کرے اور ان کے نقوشِ قدم ایک قوم کے طولانی سفر میں نشانِ منزل کی حیثیت اختیار کر جائیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرسید نے اپنے جذبات کو کبھی حقائق کی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے قوم کے لیے جس منزل کا انتخاب کیا وہ شدید مخالفت کے باوجود کاروانِ ملت کی منزل قرار پا گئی۔

عنوانِ مذکور کی ذیل میں سرسید کے خاندانی کوائف، بچپن کے شب و روز، عنفوانِ شباب، ایک نیا موڑ، شکل وشمائل، اوضاع وعادات، منکرات سے پرہیز، مہمان نوازی، جفاکشی، ظرافتِ طبع، مطالعہ و تصانیف میں جذب و انہماک، اخلاق و خصائل، حق گوئی و بے باکی، مرکزِ مہر و وفا خود اعتمادی اور عزم و استقلال، معاف کر دو اور بھول جاؤ، قلندرانہ موت جیسے موضوعات پر اختصار سے بات کی گئی ہے۔

سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃِ ثانیہ، ڈاکٹر قدسیہ خاتون (۱۹۸۱ء)

سرار کریمی پریس الہ آباد نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ خاتون نے س کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

باب اوّل میں تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم نشاۃ ثانیہ کے عظیم اثرات پر محیط ہے۔

باب سوم میں سرسید ۱۸۵۷ء سے پہلے۔ دورِ تشکیل کو موجوع بنایا گیا ہے۔

باب چہارم سرسید ۱۸۵۷ء کے بعد۔ دورِ تکمیل کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

باب پنجم: اس باب میں مصنفہ نے سرسید احمد خاں کی ادبی خدمات پر قلم اٹھایا

ہے۔سب سے ضخیم باب یہی ہے۔

باب ششم میں سرسید احمد خاں کی خدمات کی اہمیت اور نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

نگریزوں کے لائے ہوئے نظام اور اس کے اثرات کا جائزہ بہ خوبی لیا ہے۔
مصنفہ نے باب نمبر ۲ میں انگریزوں کی آمد اور ان کے اثرات پر بہ خوبی بحث کی ہے۔
اس حوالے سے انھوں نے جنگ آزادی از خورشید مصطفیٰ رضوی اور مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد بنگلوری سے استفادہ کیا ہے۔ان کا انداز تحریر انتہائی معروضی ہے۔مختلف حوالے دے کر بالآخر اپنی رائے قائم کرنے کی حکمت عملی نظر آتی ہے۔
انیسویں صدی میں انگریزوں کے ذریعے ان کی ملکی ضروریات اور تجارتی مفاد کے لیے متعارف کرائی گئی سہولیات و ذرائع آمد و رفت کا عام وسیع فائدے پر پابندی ناممکن تھا ان سے ملک کے ہر حصے میں رابطہ بڑھ گیا۔ان افکار کے لیے انھوں نے معین الدین احسن جذبی کی کتاب حالی کا سیاسی شعور سے استفادہ کیا ہے۔مصنفہ کے ہاں اپنی رائے کم نظر آتی ہے اور دیگر سرسید شناسوں کے افکار سے خوشہ چینی زیادہ ملتی ہے۔

باب سوم اور چہارم میں سرسید کی تصانیف خصوصاً دینی و سیاسی افکار کی حامل موضوع بحث بنی ہیں۔انیسویں صدی کا دور ہندوستان میں ایک عظیم تبدیلی، سیلابی کش مکش اور مادی ترقی کا دور تھا جس کے نتیجہ میں ہماری زندگی اور سماج کا گوشہ گوشہ طوفانی و ہیجانی کش مکش میں مبتلا تھا۔طوفان کا رخ موڑ دینے والا یہ ہیجان تیز تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا۔اس کے اچھے اور برے نتائج ایک دوسرے سے پیوست ہو کر غور کرنے والوں کے لیے الجھنیں بڑھا رہے تھے۔مغربی علوم، سائنسی ایجادات، سیاست، حکومت اور معاش ایک ملی جلی کیفیت میں ترقی و تنزلی کی نئی صورتوں کے ساتھ مفید و غیر مفید اثرات اور ان کے واضح نتائج برآمد کر رہے تھے۔جدوجہد، کش مکش اور انتشار کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔مغلیہ زوال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے تسلط کے ساتھ انگریزوں کے مظالم اور ملک گیری کی ہوس نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں فوری طور پر بے حد ابتری پیدا کر دی۔اس ابتری نے اس وقت کے سماجی و

اخلاقی زوال کو وسیع کیا جو قومی و ملکی بربادی کا نشان تھا۔

مغلیہ دور اپنی زوال پذیری کے باعث اس انقلاب سے بے خبر اور غافل تھا۔ زمانے کے تقاضوں کا حل پیش نہ کرنا اور نمو کی طاقت سے ہم آہنگ ہو کر اس کا جواب نہ دینا قوموں کی تاریخ میں جان کنی کی کیفیت رکھتا ہے۔ مغلیہ ہندوستان اب اس حد میں قدم رکھ چکا تھا۔ لہٰذا جب یہ اکھڑی اکھڑی ہوا غدر کا طوفان بنی تو ہندوستان کی قسمت انگریزوں کے ہاتھ آگئی۔ یہ صرف سیاسی محاذ نہ تھا قدم قدم پر مشرق و مغرب کی ٹکر ہو رہی تھی۔ مذہب و عقیدہ، تہذیب و تعلیم، صنعت و معاش سب اس کی زد میں آ گئے تھے۔ ہر منزل پر ہندوستان کو کڑی آزمائش کا سامنا تھا۔

اس پرآشوب دور میں سرسید کے ذہن نے جن چیزوں کا خاص اثر لیا وہ ملک کی سماجی ابتری، اقتصادی بدحالی اور روحانی انحطاط تھا۔ اس کے جو دردناک نتائج ہوئے وہ نشتر بن کر ان کی روح میں اُتر گئے۔ سرسید نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء نے ہندوستانی سیاست کی باگ ڈور بیرونی طاقت کے سپرد کر دی ہے۔ اس طاقت کی ترقی عمارتیں ہندوستان کی بے پناہ دولت کے خزانوں سے بڑی تیزی سے تعمیر ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ برطانیہ ایک بین الاقوامی طاقت بن چکا ہے۔ اس جارحانہ تسلط کے باوجود اسی کے ذریعہ ہندوستان مغرب اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے بھی آگاہ تھے۔ ان سب کے علاوہ انگریزی سامراج کی مصلحت اندیشیاں بھی ان کے سامنے تھیں۔

قدسیہ خاتون لکھتی ہیں:

''اسی لیے سرسید کی صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی محرکات سے آگاہی ضروری ہے۔ اس کے بغیر سرسید کے افکار و نظریات کو صحیح روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا اور نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے علمی و ادبی موثرات کیا تھے۔ اردو سے اس کا تعلق کیا تھا۔ سرسید کی ادبی خدمات عصری ضروریات سے کس طرح عہدہ برآ ہوئیں، اس سلسلے میں مذہبی، سیاسی، اقتصادی تفصیلات بھی آئیں گی۔ دیگر قدیم و جدید تحریکوں کا بھی ذکر ہوگا

ور تاریخی واقعات و حالات بھی پیش نظر ہوں گے۔'' ۵

اس باب میں مصنفہ نے مغلوں کی آمد اور برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور اثرات کا بہ غور مشاہدہ کیا ہے۔ سترہویں صدی کے ہندوستان پر نظر ڈالی جائے تو اس کے سیاسی نظام کی بنیاد جاگیرداری پر تھی جس کی قوت نوابوں، راجاؤں اور جاگیرداروں کی ریاست بندیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں میں منتشر ہو چکی تھی۔ ان کی فوجی طاقت کا انحصار قدیم طرز کے فوجی ہتھیاروں پر تھا جو مغرب کے نئے آلاتِ جنگ سے بہت کم تر درجے کے تھے۔ ہندوستان میں کبھی کوئی مضبوط اور منظم بحری بیڑہ نہ تھا جو سمندر کی طرف سے اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا۔ اسی وجہ سے انگریز طرح طرح کی دست اندازیاں کرتے۔ ہندوستانی مجبور ہو جاتے اور ان کا شکوہ کچھ کام نہ دیتا۔ یہی سبب ہے کہ دیارِ مغرب کے انگریز سوداگر اتنی دور دراز سے آ کر بھی سمندری بیڑے کے ساتھ صرف تجارت ہی نہیں سیاست میں بھی بہت جلد دخل انداز ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی تمام سماجی و تہذیبی بنیادیں مذہب سے اس قدر پیوستہ تھیں جیسے گوشت سے ناخن۔ ساتھ ہی غلط رسوم اور عقائد مذہب کے نام پر اتنی سختی سے رائج ہو گئے تھے کہ مذہب کا جُز سمجھے جانے لگے تھے جن میں کوئی تبدیلی مذہب سے نحراف تھا۔ اسی طرح ہندوستانی تہذیب جو شائستگی اور حسن میں اپنا نام رکھتی تھی اس میں نمو کی طاقت سلب ہونے لگی۔ ہذا یہیں سے اس کے زوال کے حدود نظر آنے لگتے ہیں۔

اس سارے پس منظر میں مصنفہ کی رائے ملاحظہ ہو

''اس سماجی پس منظر میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ بل کہ دونوں اس میں یکساں شریک تھے۔ عوام جو ترقی پذیر سماج کا ایک اہم جز ہوتے ہیں سماج کے سخت بندھنوں کے غلام ہو چکے تھے۔ فرد کی آزادی اور آزاد خیالی سلب تھی۔ راجہ رام موہن رائے کہتے ہیں ہندوستان میں نارمل طریقہ حکومت مطلق العنانی کا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے غلام ہونے کے دیگر سباب تھے۔ دیسی راجوں کا بودا رویہ۔ جنگی آرٹ میں ایشیا والوں کی

یورپ کے مقابلے میں جہالت ہندوستانیوں میں حب الوطنی کی کمی۔ ہماری
تہذیب میں انتہا پسندی اور ذات پات کی کڑی تقسیم جس کی وجہ سے
ہمارے یہاں آپس کی یک جہتی ناپید رہی۔"[۱]

انھوں نے سرسید کے سائنٹیفک اندازِ تحقیق کو رد کیا ہے۔ اسلام کے عقلی نظریے سے تشریح کی مخالفت کی ہے۔ مگر اس کے پیچھے سرسید کی کون سی سوچ متحرک تھی مصنفہ نے واضح بیان کر دی ہے، لکھتی ہیں:

"انیسویں صدی میں خاص طور پر غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین
خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ مشنریوں سے تھا، دوسرا یورپ والوں کے
ن خیلات سے تھا جنھیں دیکھ کر بقول سرسید مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ
وگ ہمیشہ طرح طرح کے الزامات و اعتراضات سے اسلام کو عقل و اخلاق
کا دشمن بتاتے اور انسانی ترقی میں حارج ثابت کرتے تھے مگر ان کے
لزامات کی غلطی اور کم زوری کو بتانا تو در کنار مسلمان ایسے اعتراضوں سے
کان بند کر لینا ہی مذہب کی محبت اور خیر خواہی سمجھتے تھے۔"[۲]

سرسید احمد خاں کی تفسیر میں جو جھول نظر آتے ہیں مصنفہ نے اپنی سی کوشش سے ان کے محرکات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر از پروفیسر عمر الدین، تہذیب الاخلاق اور مکتوباتِ سرسید (مذہبی افکار) ان کے زیر بحث رہی ہیں۔ انداز وہی معروضی ہے۔

باب پنجم کلیدی باب ہے جس میں سرسید کی ادبی خدمات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ سرسید احمد کا سفرنامہ ان کے زیر نظر رہا ہے، لکھتی ہیں:

"ان کا سفرنامہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آغازِ سفر ہی سے انھوں نے ہر
چھوٹی بڑی چیزوں کو بہ غور دیکھنا شروع کیا۔ ہر مفید اور اچھی چیز کے لیے
خواہش مند ہوئے کہ وہ ان کے ملک میں بھی ہوتی۔ یہ علوم و فنون علم و عقل
کی باتوں یا اچھے عادات و اطوار جہاں دیکھنے میں آئے سرسید بے چین

ہوئے کہ کاش ان کی قوم میں بھی یہ باتیں ہوتیں۔ ان کی ان تحریروں سے
بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ملک کے سچے خیر خواہ تھے۔ بلا لحاظ مذہب وملت
ہندوستانی قوم کی بھلائی اور ترقی کے خواہاں تھے۔ مسلمانوں پر خصوصی توجہ
اس لیے دی کہ وہ سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے اور بری حالت میں
تھے۔ ۸

سر سید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور ایک سال رہ کر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔
اس ایک سال کے عرصے میں انھوں نے کیا کچھ نہ کر ڈالا۔ ولیم میور William
Muir کی کتاب کا جواب خطبات احمد یہ کے نام سے تصنیف کیا۔ کیمبرج جا کر خاص
طور پر طریقۂ تعلیم اور درس و تدریس، رہن سہن و تربیت کا بہ غور جائزہ لیا۔ دوسری
قوموں کی ہر اچھی بات کو بہ نظر تحسین دیکھا اور نہایت بے قراری کے ساتھ یہ تمنا کی کہ
ہندوستانیوں میں بھی یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں۔ بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوکز سے بھی
ملے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دعوتوں میں بھی شریک ہوئے۔ حکومت کے انتظام اور
طریقہ کو دیکھا۔ متوسط طبقہ اور عوامی زندگی کا جائزہ لیا۔ ان کی روزمرہ زندگی کا مطالعہ
اور ہندوستانیوں سے اس کا موازنہ کیا۔

مصنفہ نے لکھا ہے:

''جب لندن کے قریب کلفٹن کے عجیب معلق پُل کو دیکھنے گئے تو بے حد متاثر
ہوئے اور لکھا جب یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کام جس کا انجام دینا شاید بادشاہ کی
قوت سے بھی خارج تھا صرف رعایا کی ہمت، سخاوت اور علم و ہنر سے انجام
پایا ہے، تو اس قوم کی اور بھی قدر و منزلت دل میں نقش پذیر ہوتی ہے۔'' ۹

گو مصنفہ نے مکاتیب سر سید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین سے استفادہ کیا ہے جو
کہ اخبار سائنٹیفک سے ماخوذ ہے یعنی یہاں نقد الانقاد والا معاملہ نظر آتا ہے۔ الغرض
قدسیہ خاتون کا یہ مقالہ جو کتابی صورت میں ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا سر سید احمد خاں کو
بہترین خراج تحسین ہے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے، بعد اور پھر مسلمانوں کی

حالت اور نشاۃ ثانیہ سے ہوتے ہوئے سرسید احمد خاں کو مسلم قوم کا ہیرو قرار دیا ہے۔ مگر ان کی تفسیر قرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے مختلف جگہ (کتابوں) سے خوشہ چینی کی ہے۔ یہ بہر حال سرسید شناسی میں ایک اضافہ تو ہے۔

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج۔ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۶ء کے سیاسی حالات کا تجزیہ (۱۹۸۵ء) از ڈاکٹر ثاقب انور

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج۔ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۶ء کے سیاسی حالات کا تجزیہ کے مؤلف ڈاکٹر رفیق زکریا ہیں۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر ثاقب انور نے کیا ہے جسے ترقی اردو بیورو، نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کا سالِ اشاعت اپریل تا جون ۱۹۸۵ء ہے۔ یہ تالیف پانچ سو پینسٹھ (۵۶۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو نے تحریر کیا۔ اسے ماضی کو بھول کر مستقبل کی جانب پُرامید نگاہوں سے دیکھنے والی نوجوان نسلوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ دیباچہ وائی۔ بی چوہان نے لکھا ہے۔ ''کچھ اس کتاب کے بارے میں'' کے عنوان کے تحت اس تالیف کے مقصد کی نشان دہی ہوتی ہے:

> ''دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکنے کے بعد بھی، ہندوستان ہو یا پاکستان، ہر جگہ کے دنوں مذہبی گروہ آج تک آپسی تعلقات میں مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں کر پائے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان کی تخلیق کی وجہ سے پرانے جھگڑے کو ایک نئی جہت حاصل ہوگئی ہے اس کتاب کی وجہ سے دونوں قوموں کے مابین پائے جانے والے شکوک وشبہات اور ڈر اور خوف میں اگر تھوڑی سی بھی کمی واقع ہوگئی اور اگر ان میں ایک دوسرے کے لیے مفاہمت کا تھوڑا سا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری اس ناچیز سعی کا انعام مجھے حاصل ہوگیا۔'' [۱]

''دیباچہ، طبع دوم (انگریزی)'' کے بعد فہرست میں، دیباچہ، کچھ اس کتاب کے

بارے میں، دیباچہ طبع دوم بھی شامل کیے گئے ہیں جو مضامین کی بے ترتیبی کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعدازاں فہرست میں ابواب بندی کی بجائے سرخیاں جمائی گئی ہیں لیکن تفصیلی مندرجات کے بیے کتاب میں ابواب بندی کی گئی ہے۔ فہرست کی ترتیب دیکھیے: پس منظر، سیاسی سرگرمیاں، دستوری ارتقا، انتظامی اصلاحات، انگریزی تعلیم کے اثرات، پریس کا کردار، مذہبی اور سماجی اصلاحات (سرسید)، معاشی تبدیلیاں، فرقہ ورانہ تنازعات، قیادت کی خصوصیات (سرسید...) نتائج، ضمیمے (ا) ہندوستان میں ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۱ء کے دوران ایسی آسامیوں کی تعداد بتلانے والا گوشوارہ جن کا مشاہرہ ۱۵۰/ روپے یعنی ڈیڑھ سو روپے سے کم نہ ہو (ب) دی یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے اصول وضوابط مع مکتوبات سرپرستان وفہرست ملحقہ اسلامی ادارہ جات (ج) مغربی تعلیم کی حمایت میں از سرسید (د) انڈین نیشنل کانگریس کی دستوری تجاویز کے بارے میں دارالعوام میں مسلم عرضداشت (ہ) بالائی ہند کی محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اصول وضوابط (د) سپاس نامہ وفدِ اسلامی مع اسمائے اراکین اور لارڈ منٹو کی جانب سے دیا گیا اس سپاس نامے کا جواب (ز) مسلم آل انڈیا کانفرنس۔ نواب ڈھاکا کا منصوبہ۔ کتابیات۔

پہلا باب "پس منظر ۱۸۵۸۔۱۸۵۷ء" تشریحات وحوالہ جات کے ساتھ چوہتر (۷۴) صفحات پر مشتمل ہے جس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانانِ ہند کو اس انحطاط سے باہر نکالنے کے لیے انفرادی یا اجتماعی ہر دو سطح کی کوششوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے:

> "یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہندوستان میں اپنی بالادستی کے ابتدائی دور ہی سے انگریزوں نے مسلمانوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ نئے حکمراں اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام کی فطری امید شکستگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی بجا لیکن اکثر بے جا طور پر خواہ مخواہ

مسلمانوں کے بارے میں شک کرنے لگے تھے کہ کہیں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی
کے اقتدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی سازشوں میں مصروف نہ
ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی اعلیٰ ترین منتظمین نے مسلمانوں کو دولتِ
برطانیہ کے مقبوضہ علاقوں کے لیے انتہائی خطرناک افراد قرار دیا تھا اور بعض
انگریز عہدیدار تو مسلمانوں سے ایک قسم کی کراہت محسوس کرنے لگے
تھے۔ رابرٹ کائیو نے لارنس سلیون کو ۳۰ دسمبر ۱۷۵۸ء کو جو خط لکھا تھا اس
میں وہ لکھتا ہے ''یہ کوتاہ ذہن اور بدطبیعت مسلمان جذبۂ احسان مندی سے
بالکل عاری ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا سیاسی طریقہ اپنا رکھا ہے جو اس ملک
کے سوا کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ یعنی جو چاہو کر گزرو۔ طاقت کے ذریعے نہیں
بل کہ دھوکے دھڑی کے ذریعے۔''[۱]

مؤلف آگے چل کر اسی باب کے آخر میں مسلمانوں کی حالت میں سدھار کے
حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''کچھ تو ان کی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے اور کچھ سرسید کی ذاتی کوششوں
کے باعث اب حکومت بھی مسلمانوں کی جانب زیادہ توجہ مرکوز کرنے لگی
تھی۔ ابتدأً تو یہ لطف و عنایت برائے نام ہی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ حکومت کی
فراخ دلی میں اضافہ ہوتا رہا اور سال بہ سال ملکۂ معظّمہ کی جانب سے زیادہ
سے زیادہ مسلمانوں کو عطیات و خطابات سے نوازا جانے لگا۔ ان دنوں
چوں کہ افسر شاہی بامِ عروج پر تھی اور ملکہ معظّمہ کے نام میں عوام کے لیے
وہی جادو تھا جو مشرقی فرماں رواؤں کے نام میں ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے یہ
نعمات اور خطابات اس دور کی عوامی زندگی کے آئینہ دار تھے۔ عوامی
رہنماؤں اور حکمرانوں کے مابین کسی نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا یہ
ضروری تھا کہ ان کے تعلقات آپس میں خوشگوار رہیں اور اکثر ایسا ہی
ہوتا تھا اکثر سماجی فلاح و بہبود اور تعلیمی مسائل میں مصروف رہتے تھے سیاسی

شورش پسندی کے خیال کو بھی اپنے نزدیک پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ دراصل
سربرآوردہ ہندوستانی اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ وہ "بادشاہ" سے بڑھ
کر بادشاہت پسند ہیں۔ حتیٰ کہ عوامی سطح پر جب کوئی سیاسی بحث چھڑتی
تو انتہائی وفادارانہ انداز میں، ہر عوامی تنظیم کے منشور کے ابتدائیے میں، خواہ
وہ مسلمانوں کی تنظیم ہو یا ہندوؤں کی، ملکۂ معظمہ کے ساتھ وفاداری
کا پُرشکوہ الفاظ میں اظہار کیا جاتا اور ملکہ معظمہ اپنی جانب سے ہندوستانی
رعایا کے وفادار رہنماؤں کی عزت کرنے سے شاید ہی چوکتیں۔"[۲۱]

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات اس بات پر دلالت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
کہ مسلمانانِ ہند اور حکمران طبقے کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کی اصل وجوہات کی
جانب ویسی توجہ اور سرگرمی نہیں دکھائی گئی جیسی کہ دکھائے جانے کی ضرورت تھی جس
کے نتائج مسلمانوں کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوئے۔

دوسرا باب "سیاسی سرگرمیاں صفحہ ۵۷ سے ۱۶۳ تک محیط ہے۔ ۱۸۸۵ء میں
کانگریس کے قیام سے لے کر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام تک کے
حالات وواقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے اجلاس
میں کلی طور پر ہندو نمائندے موجود نہیں تھے بل کہ چند انگریز، پارسی اور عیسائی بھی شامل
تھے جب کہ دو مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ اس اجلاس میں تمام ہندوستانیوں کی
سیاسی ترقی کا مطالبہ کیا گیا جس کے باعث تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کہ جب مسلمان وہاں
موجود ہی نہیں تھے تو کانگریس کیوں کر تمام ہندوستانیوں کی جانب سے مطالبہ کر سکتی
تھی۔ پہلی کانگریس کی ناکامی کے نتیجے میں کانگریس نے دوسری کانگریس کی مجلسِ
استقبالیہ نے بہ طورِ خاص مسلمانوں کی نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سنٹرل
محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی نے اجلاس میں شرکت کی دعوت
مسترد کر دی جس پر ہندو اخبارات نے کڑی تنقیدیں کیں۔ تیسری کانگریس کی مجلسِ
استقبالیہ نے بمبئی کے سرکردہ مسلمان رہنما بدرالدین طیب جی کو نہ صرف مدعو کر لیا بل

کہ تیسرے اجلاس کی صدارت کے لیے ان کا انتخاب بھی عمل میں لے آئی۔ مؤلف اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''طیب جی نے اپنے صدارتی خطبے میں واضح کیا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ س ملک میں رہنے والے ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی ایک دوسرے سے الگ رہیں اور عام نوعیت کی عظیم اصلاحات اور عظیم حقوق کے حصول کے لیے جو سبھی کے یکساں فائدے کے لیے ہوں مل جل کر کام نہ کریں۔''[۱۳]

س کانگریس کے حوالے سے سر سید اس لیے برہم ہوئے کہ علی گڑھ کے ایک یا دو طلبہ کو بہلا پھسلا کر مدراس کانگریس میں شرکت پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ سر سید نے ساری قوموں کو ملکہ کا وفادار رہنے کا مشورہ بھی دیا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس میں شرکت کی تو انھیں قومی تباہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سر سید کے اندیشوں اور خدشات کی تین بنیادیں تھیں:

۱۔ اگر چہ ہندو اور مسلمان ایک ہی کنویں کا پانی پیتے ہیں ایک ہی شہر کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ پھر بھی دونوں کی حیثیت دو علاحدہ قوموں کی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ بالفرض انگریز اپنی تمام مسلح فوجوں، ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں تو اس ملک پر حکمرانی کون کرے گا؟ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو قومیں ایک تخت پر بیٹھ کر اقتدار کی مساوی طور پر حق دار ہوں؟ قطعاً نہیں اس صورت میں لازماً ایک قوم دوسری پر غالب آ کر اسے دبا دے گی۔ یہ سوچنا کہ دونوں قومیں اقتدار میں برابر کی ساجھے دار ہوں گی، ایک ناممکن اور ناقابلِ تصور امر کی خواہش کرنے کے مترادف ہے۔

۲۔ ہندوستان میں پائے جانے والے حالات کے پیشِ نظر اس ملک کے لیے

نمائندہ حکومت کا تصور مناسب نہیں ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ بالفرض ہمیں امریکیوں کی طرح بالغ رائے دہی حاصل ہو جائے اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو ووٹ ڈالنے کا اختیار حاصل ہو جائے تب کیا ہوگا؟ مسلم رائے دہندگان مسلمان امیدواروں ہی کو ووٹ دیں گے جب کہ ہندو رائے دہندگان ہندو امیدوار کو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو امیدوار کے مقابلے میں چار گنا ووٹ زیادہ حاصل ہوں گے کیوں کہ ان کی آبادی تعداد میں چار گنا زیادہ ہے۔ ان حالات میں مسلمان اپنے مفاد کا تحفظ کس طرح کر پائیں گے؟ اس کی مثال پانسوں کے اس کھیل کی طرح ہو جائے گی جس میں ایک کھلاڑی کے پاس تو چار پانسے ہوں اور دوسرے کے پاس صرف ایک۔

۳۔ مسلمانوں کو اپنے مفادات کے تحفظ اور انتظامیہ میں موثر نمائندگی حاصل کرنے کے لیے انگریزوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں سے دوستی اور محبت کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی جس کے باعث سرسید اس شد و مد کے ساتھ نامزدگی کے اصول کی حمایت کیا کرتے تھے جن کے ذریعہ انھوں نے انتخابی طریقے کے بارے میں لارڈ رپن کی رائے تبدیل کرادی تھی اور وائسرائے کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ لوکل بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے ایک تہائی ارکان نامزد کیے جایا کریں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی تقریر نے تمام ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ ہندو اخبارات نے سرسید پر اتنی ہی شدت سے حملے شروع کر دیے جتنی شدت سے سرسید نے کانگریس کو ہدف ملامت بنایا تھا۔ بنگالی دانشوروں میں میں بھی سرسید کے خلاف کافی غم و غصہ پایا جاتا تھا کیوں کہ انھوں نے بنگالی بابوؤں کے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا تھا۔ سرسید کچھ عرصہ تو خاموش رہے لیکن بعد ازاں انھوں نے ہندوؤں کے

اعتراضات کا تفصیلی جواب دینا ضروری سمجھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ان سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اور شخص یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کے ان دونوں فرقوں میں دوستی اور اتحاد برقرار رہے اور وہ ایک دوسرے کی استعانت کرتے رہیں۔ انھیں خدشہ تھا کہ کانگریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت برائے نام تو انگریزوں ہی کی بنی رہے لیکن ملک کے اندرونی حالات مکمل طور پر اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ سرسید کے یہ نظریات دراصل تھیوڈر بیک (Theo Dore Beek) کے خیالات تھے۔ سرسید نے زور دے کر کہا تھا کہ کانگریس اپنے اجلاس کے دوران کوئی ایسے مسائل پر بات نہ کرے جن کی مخالفت مسلمان من حیث القوم کرتے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید ہندوؤں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ کانگریس کو ہندوؤں کی طرف سے تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت کہا جانے لگا۔ میاں محمد شفیع جو بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بن گئے تھے، نے ایک طویل تردیدی بیان اخبارات میں شائع کروایا اور کانگریس کی اجلاس میں مسلمانوں کی شرکت کی وجوہات پر روشنی ڈالی:

۱۔ ان میں اکثر کا تعلق سماج کے نچلے طبقات سے تھا اس لیے کانگریس کے منتظمین نے انھیں مستقبل کے بارے میں ایسے حسین خواب دکھانے شروع کر دیے جن میں وہ ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتوں کے ساتھ مصافحے کا شرف حاصل کر پائیں گے۔

۲۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جو شہد کی طرح میٹھے الفاظ میں خوشامد اور ستائش کی وجہ سے دھوکا کھا گئے تھے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنھیں کوئی بھی جماعت بہ آسانی پھانس سکتی ہے۔

۳۔ شیعوں کو یہ کہہ کر تحریک میں شامل کیا گیا کہ ان کے مخالفین یعنی سنّی سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔

۴۔ بعض مسلمانوں نے محض ذوقِ تجسس کی تسکین کی خاطر کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ بعض سے شہرت اور تشہیر کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بعض اس وجہ سے شرکت پر مجبور ہوئے کہ وہ مالدار ہندوؤں کے زیرِ اثر تھے یعنی ہندو وکلا کے موکل تھے اور بعض ہندو ساہوکاروں کے مقروض۔ اس طرح وہ اپنے مربیوں کے آگے بے دام غلام بنے ہوئے تھے۔''[۱۴]

کانگریس کی مخالفت صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کی بل کہ منشی نول کشور، راجہ شیو پرساد اور بنگال کے راجا کی طرح بعض بااثر زمین داروں نے بھی کھل کر کانگریس کی مخالفت کی لیکن کانگریس کے منتظمین پر ان کی مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سرسید ایک ایسی شخصیت تھے جو کانگریس کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔

غرض کانگریس کے جتنے اجلاس بھی ہوئے ان میں مسلمانوں کی نمائندگی برائے نام رہی۔ سایانی صاحب نے ان اعتراضات پر روشنی ڈالی جو مسلمان کانگریس پر کرتے تھے:

''۱۔ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا مسلمانوں کے مذہب کے منافی ہے۔

۲۔ اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو جائیں تو حکومت ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرے گی۔ جبکہ ان مشکل دنوں میں اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کو حکومتی سرپرستی کی شدید ضرورت لاحق ہے۔

۳۔ کانگریس کی کامیابی بالآخر برطانوی راج کے خاتمے پر منتج ہوگی جس کے نتیجے میں یہاں ہندوؤں کی حکومت قایم ہو جائے گی۔

۴۔ کانگریس نہ تو ہندوستان کی تمام قوموں کی نمائندگی کرتی ہے اور نہ اس کی نیت نیک ہے اسی طرح اس تنظیم کے اغراض و مقاصد بھی ناممکن العمل ہیں۔

۵۔ مغرب میں حکومت کے مسابقتی امتحانوں، انتخابات اور نمائندگی کے جو طریقے رائج کر رکھے ہیں۔ وہ ہندوستان کے لیے موزوں نہیں

ہیں اور ان طریقوں کو یہاں نافذ کیا گیا تو تمام سرکاری ملازمتوں پر ہندو قابض ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو یکسر سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو جانا پڑے گا۔

۶۔ اس ملک میں ہندو چوں کہ غالب اکثریت میں ہیں اس لیے وہ ہمیشہ کانگریس کی کارروئیوں پر اثر انداز ہوتے رہیں گے اور اسے اپنا آلۂ کار بناتے ہوئے ہمیشہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے استعمال کریں گے۔"[۱۵]

سایانی نے اپنے انداز میں مسلمانوں کو سمجھانے اور کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے مگر مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔

ایلگن کے جانشین لارڈ کرزن کی آمد (جمعہ ۶ جنوری ۱۸۹۹ء) کو مسلم پریس نے اس ملک کے "غریب اور دھتکارے ہوئے مسمانوں" کے لیے نیک فال قرار دیا لیکن لارڈ کرزن کے جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے باوجود اس نے مسلمانوں کو استثنائی مراعات دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ سر سید کی وفات کے بعد بیک (Beek) بھی ایک سال کے بعد فوت ہو گئے۔ ان دونوں اموات کا مسلمانوں کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔ وائسرائے سے لے کر علی گڑھ کے معمولی پڑھے لکھے مسلمانوں تک نے بیک کی موت کا سوگ منایا۔ بیک کی طرح سر سید کے علاوہ کسی ور نے اس قدر جوش اور ولولے اور انتہائی بے غرضی کے ساتھ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام نہیں کیا تھا۔

بیسویں صدی مسلمانوں کے لیے شدید اضطراب لے کر آئی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں اور کانگریس کا الحاق اور بھی زیادہ مشکل ہوتا گیا کیوں کہ مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ کانگریس صرف اور صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ جماعت

تشکیل دی جائے جو مسلمانوں کے حقوق کا صحیح معنوں میں تحفظ کر سکے۔ یوں ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی گئی۔

۱۸ مئی ۱۸۸۲ء کی لارڈ رپن کی قرارداد سے پہلے ہندوستان میں حکومتی مشینری میں عوامی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ قرارداد ہندوستان کے دستوری ارتقا میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا دائرہ کار محض عوامی نمائندگی تک محدود نہیں تھا بل کہ یہ مالیہ محصولات تعلیم، صفائی صحتِ عامہ اور قرضوں کی فراہمی وغیرہ جیسے مسائل کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ اس کی بنیادی غرض و غایت یہ تھی کہ یہ سیاسی اور عوامی تعلیم کا ذریعہ بن سکے۔ ایسے قوانین نافذ کیے گئے جن کے ذریعے مختلف دیہی اور شہری علاقے کے لوکل بورڈوں میں انتخابات کا انعقاد لازمی قرار دیا گیا۔ گورنر جنرل لارڈ رپن نے یہ شرط لازمی قرار دے دی کہ کسی بھی صورت میں نامزد کردہ سرکاری ارکان کی تعداد جملہ تعداد کی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہو گی۔ چیئرمین یا صدر کا بھی انتخاب ہو گا منتخب دیسی ارکان کو "راؤ بہادر" یا "خان بہادر" کے اعزازی القاب سے اس وقت تک یاد کیا جاتا رہے گا جب تک کہ ان کی رکنیت برقرار رہے۔ انتخابات کس صورت کروائے جائیں اس کا فیصلہ خالصتاً مقامی حکومتوں پر چھوڑ دیا گیا لیکن مقامی حکومتوں کو اختیارات دیے جانے کے باوجود اس بات پر زور دیا گیا کہ سرکاری کنٹرول کو خارجی طور پر بروئے کار لایا جائے نہ کہ داخلی طور پر۔ متعلقہ حکام کو چاہیے کہ وہ مقامی اداروں سے متعلق قوانین پر نظرِ ثانی کرے و راس کی جانچ پڑتال کرتی رہے لیکن اسے قوانین مسلط کرنے کا اختیار بالکل بھی نہیں ہے۔

لارڈ رپن کے اس منصوبے کو قدرتی طور پر تعلیم یافتہ حلقوں میں کافی پسند کیا گیا اور اسے نمائندہ حکومت کی جانب پہلا قدم قرار دیا گیا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے امرت بازار پتریکا (Amrita Bazar Patrika) نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی عمل داری کے قیام کے بعد سے یہ پہلا اقدام ہے جس کے ذریعے عوام کے دلوں سے غلامی کے احساس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس

قرارداد پر اینگلو انڈین لوگوں نے کسی قدر تلخ ردِعمل کا اظہار کیا کہ رپن بعض ایسے افراد کی بے جا ناز برداریاں کرنے لگے ہیں جنھیں وہ ''عوامی جذبہ رکھنے والے ذہین افراد'' قرار دیتے ہیں۔ اس قرارداد کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا گیا لیکن حکومت نے اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان رہنماؤں نے رپن کی اصلاح پر اپنی ناراضی کا اظہار کرنا شروع کر دیا کیوں کہ انھیں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ ہندوؤں کی عددی برتری کی بنا پر مسلمان ان کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ اگرچہ اس خطرے کا مکمل احساس ابھی تک مسلمانوں کو نہیں ہوا تھا تاہم دھندلا سا خوف انھیں ہمیشہ بے چین رکھنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے سرسید نے ''نامزدگی'' کے اصول کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے حکومتِ ہند کی قرارداد کا سب سے اہم حصہ قرار دیا۔ سرسید نے واضح کیا کہ کس طرح یہ خطرات درپیش ہو سکتے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ بڑی یا اکثریتی قوم بہ آسانی چھوٹی یا اقلیتی قوم کے مفادات کو غصب کر لے گی اور جاہل عوام حکومت پر الزام تراشی کرنے لگیں گے کہ اس نے ایسے طریقے اپنائے جن کی بنا پر نسلی اور مذہبی منافرتیں اور زیادہ شدید ہو گئیں، اسی لیے سرسید کے خیال کے مطابق حکومت کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں کے نمائندوں کی بڑی تعداد کو نامزد کرنے کے اختیارات کو اپنے پاس محفوظ رکھے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہندوستانی آبادی کے مختلف گروہوں کی نمائندگی میں واجبی اور منصفانہ توازن قائم رکھا جا سکتا ہے جس کا حصول خاص اور سادہ الیکشن کے ذریعے ناممکن الحصول ہے۔

چوں کہ یہ انتخابات عام طور پر غیر موثر اور بے رنگ قسم کے ہوا کرتے تھے اس لیے مختلف قوموں کے مفادات میں تصادم کا کوئی موقع ہی نہیں پیدا ہوا صرف صدر (چیئرمین) کے انتخاب کے وقت جس کا ان اصلاحات کی رو سے غیر سرکاری ہونا لازمی تھا۔ تھوڑی بہت فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہو جایا کرتی تھی اور وہ بھی تمام

صورتوں میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا بنگال کے بعض مقامات کو چھوڑ کر ملک کے دیگر علاقوں میں بلدیاتی معاملات میں بہت کم فرقہ وارانہ منافرت کو ابھارنے کا موقع ملا۔

یکے بعد دیگرے نمودار ہونے والے واقعات نے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو کافی بڑھاوا دیا جس میں کانگریس کے ہر سالانہ اجلاس کے بعد مزید تیز گامی پیدا ہوتی رہی۔ دراصل کانگریس نے اپنے افتتاحی اجلاس ہی میں مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ موجودہ سپریم کونسل اور لوکل لیجسلیٹو کونسلوں میں اصلاحات کے ذریعے کافی تعداد میں منتخب نمائندوں کو شامل کیا جائے۔ بمبئی کے۔ ٹی۔ تیلنگ اور مدراس کے ایس۔ سبرامنی ایر نے اس قرارداد کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ کس طرح ان کونسلوں کی ممبر کی حیثیت سے انھیں اچھا یا برا کچھ بھی کر پانے کا قطعی کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا تھا۔ جب کہ دادا بھائی نوروجی نے یہ واضح کیا تھا کہ یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی تھی کہ اچھی حکومت چلانے کے لیے نمائندگی کا اصول کس قدر ضروری ہوتا ہے ورنہ برطانیہ کے زیر تسلط رہنے کا فائدہ ہی کیا؟ یہ ایک دوسری قسم کی جبری حکومت بن جائے گی۔ ۱۸۸۶ء میں نہ صرف کانگریس نے ''دیسی'' نمائندگی کے اپنے سابقہ مطالبے کو دہرایا بل کہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ بعض اصولوں کی بنیاد پر اس طریق نمائندگی میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں جیسے کہ منتخب اور نامزد کردہ ارکان کی نمائندگیوں میں توازن، مخصوص اور محدود حق رائے دہی (جو عام طور پر بلدیہ جات، ضلعی بورڈوں، یونیورسٹیوں اور چیمبر آف کامرس کے ارکان تک محدود ہو) اور تمام مالی امور کا کونسلوں کے روبرو پیش کیا جانا وغیرہ۔ کانگریس نے اپنی قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کا ہر شہری بلحاظ مذہب، عقیدہ، رنگ و نسل اس بات کا اہل ہونا چاہیے کہ اسے کونسل کی نشست کے لیے منتخب یا نامزد کیا جا سکے۔

کئی برسوں تک کانگریس اپنے ہر اگلے اجلاس میں انھی مطالبات کو کم و بیش انھی الفاظ میں دہراتی رہی لیکن ان کے بارے میں کوئی سرکاری ردعمل ظاہر نہیں

کیا گیا۔ اگرچہ رازدارانہ طور پر حکومت ایسے ذرائع ووسائل تلاش کرنے میں مصروف تھی جن کے ذریعے ان مطالبات کی تکمیل کی جا سکے۔ مثلاً ہندوستان سے اپنی واپسی سے پہلے لارڈ ڈفرن نے خفیہ طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی تھی تا کہ وہ ''دیسی'' نمائندگی کے پورے مسئلے کا جائزہ لے سکے۔ لالہ لاجپت رائے نے تجاویز کے ایک پہلو کو یوں اجاگر کیا کہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں اقلیتوں کے دلوں میں جن میں ابھی ہندوستانی اخوت کی جذبات اتنی اچھی طرح پروان نہیں چڑھے ہیں جتنے کہ آئندہ برسوں میں پروان چڑھ جائیں گے، یہ شک جاگزین نہ ہو جائے کہ کونسلوں میں ان کی قوم کے نمائندوں کی عدم موجودگی کے باعث ان کی کوئی نمائندگی نہیں ہو پا رہی ہے اس لیے ہم نے خاص طور پر اس دفعہ کو ان تجاویز میں شامل کیا ہے، حال آں کہ دراصل اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے (کیوں کہ ہم سب ایک ہیں) تا کہ ایسی تمام اقلیتوں کی نمائندگی خود انھی کے فرقے کے لوگ کر سکیں۔ اودھ کے نمائندے منشی ہدایت رسول اور بمبئی کے نمائندے علی محمد بھیم جی نے ایک ترمیم پیش کہ مسلمان ارکان کی تعداد ہندو ارکان کی تعداد کے مساوی ہو۔ اس ترمیم کے مندرجات اور کانگریس کے علان سے سرسید کو یقین ہو گیا کہ کانگریسی رہنما نہ صرف برطانوی سیاست دانوں کی آنکھ میں دھول جھونک رہے ہیں بل کہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں خدشہ تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں مسلمان وفود کی جانب سے دستوری تجاویز کی حمایت پارلیمنٹ میں یہ غلط تاثر قائم کرے گی کہ مسلمان من حیث القوم ان تجاویز کی تائید میں ہیں اور اگر واقعی ایسا ہوتا ہے تو یہ بات مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہو گی اس لیے سرسید نے اوائل اپریل ۱۸۹۰ء میں ہندوستان کے ۷۰ مختلف شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں کے لگ بھگ ۴۰۰۰۰ دستخطوں پر مشتمل ایک عرض داشت سر رچرڈ ٹیمپل کی معرفت دارالعوام میں پیش کی گئی جس میں عرضی گزاران نے درخواست کی کہ معزز دارالعوام انڈین نیشنل کانگریس کے مطالبے کے مطابق ہندوستانی کونسلوں کے دستور میں اصول انتخاب کو شامل نہ کرے کیوں کہ اس قسم کے

اقدام سے نہ صرف وہ بلا رعایت انصاف جو اب تک برطانوی حکومت کا طرۂ امتیاز رہا ہے، مجروح ہوگا بل کہ عرضی گزاران اور دیگر اقلیتوں کو ان طبقات کی نا قابلِ برداشت غلامی کا طوق پہننا پڑے گا جن کا نقطہ نظر ان کی فلاح و بہبود کے تعلق سے انتہائی جارحانہ ہے۔

جوں ہی اس عرض داشت کی اطلاع عامۃ الناس تک پہنچی۔ ہندو پریس نے سر سید کے خلاف حسبِ معمول تنقید اور ملامت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ سر سید کو ''دی ٹائمز'' کی شکل میں ایک زبردست حمایتی مل گیا جس نے کانگریس کے منصوبے کہ یہ کہتے ہوئے مذمت کی کہ یہ بابوؤں کے ایک چھوٹے سے منظم گروہ کا چالاک ہتھکنڈہ ہے جس کے ذریعے وہ سیاسی اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ کانگریس کو عوام کی نمائندہ جماعت کہلانے کا کوئی حق نہیں لیکن تمام تر خامیوں کے باوجود انڈین کونسلز ایکٹ آف ۱۸۹۲ء کو کانگریس کی فتح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ایکٹ کی منظوری سے قبل سر سید گورنر جنرل کے ایک سرگرم رکن ہوا کرتے تھے لیکن نئے اقدامات کی وجہ سے انھیں علاحدہ ہو جانا پڑا اور ان کانگریسی بیانات کی تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا کہ کانگریسی رہنماؤں کے اس بیان میں قطعی طور پر کوئی صداقت نہیں ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کی گزشتہ چند برسوں کی سیاسی خاموشی کانگریس تحریک کے ساتھ میری رضامندی کے مترادف ہے۔ وہ آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے دستوری مسئلے کا حل نمائندہ حکومت نہیں ہے، لہٰذا انھوں نے پر جوش انداز میں اس توقع کا اظہار کیا کہ خواہ برطانیہ میں قدامت پسند برسرِ اقتدار ہوں یا لبرل یا ریڈیکل وہ یقیناً اس بات کو فراموش نہیں کریں گے کہ ہندوستان کوئی چھوٹا سا ملک نہیں بل کہ کم و بیش ایک براعظم ہے اور یہ کہ اس میں ایک کثیر آبادی بستی ہے جس کے معاشی، اخلاقی، سماجی، مذہبی، طبعی اور تاریخی حالات ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں اور اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے جس میں کبھی ہم خیالی کی فضا دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔ انھوں نے برطانوی عوام کو متنبہ کیا کہ وہ کانگریس کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں کیوں کہ

کانگریس مسلمانوں اور مراٹھوں، برہمنوں اور چھتریوں، نیچوں اور شودروں، سکھوں اور بنگالیوں اور مدراسیوں اور پشاوریوں کو ایک ہی قوم کی لڑی میں نہیں پرو سکتی۔

حکومت مشہور کانگریسی رہنماؤں کو کونسلوں پر نامزد کرتی رہی اور سرسید کے اندیشوں کو حقیقت میں بدل دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سرسید اور دیگر مسلمان رہنماؤں نے مجالسِ مقنّنہ مین نیابت یا نمائندگی کے اصول کی ترویج کی مخالفت ترک کردی اور ایسے ذرائع اور وسائل کو اپنانے لگے جن کے ذریعے مسلمانوں کو دستوری اصلاحات میں ان کا واجبی حصہ مل سکے۔ ان مجالسِ مقنّنہ کے غیر سرکاری ارکان کے اعداد و شمار اس کی دلالت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ گورنر جنرل کی مجلسِ مقنّنہ میں غیر سرکاری ارکان کی ۱۸۹۵ء کی کل تعداد میں ہندوؤں کے مقابلے میں دیگر قوموں کی نمائندگی ۱۸۹۶،۵:۶ء میں ۱۸۹۷،۵:۴ء میں ۱۸۹۷،۵:۵ء میں ۱۸۹۸،۴:۵ء میں ۱۸۹۹،۳:۶ء میں ۱۹۰۰،۴:۳ء میں ۱۹۰۱،۵:۴ء میں ۱۹۰۲،۴:۵ء میں ۵: ۱۹۰۳،۴ء میں ۱۹۰۴،۴:۶ء میں ۶ ۱۹۰۵،۵ء میں ۱۳:۴ اور ۱۹۰۶ء میں ۴:۳ رہی۔

اسی طرح بنگال کی مجلسِ مقنّنہ میں سنین کی مذکورہ بالا ترتیب کے لحاظ سے نسبت ۱۳:۶، ۱۰.۸، ۱۲:۸، ۱۲.۸، ۱۰.۷، ۱۲.۷، ۱۱.۸، ۱۲.۸، ۱۱.۸ اور ۱۱.۸ رہی جس نے مسلمان رہنماؤں کو تدبر سے کام لینے کا درس دیا اور سرسید نے تھیوڈور بیک اور اپنے صاحبزادے سید محمود نے مل جل کر ایک مسودہ تیار کیا جس کے اہم نکات میں (الف) مجالسِ مقنّنہ (Legislative Council) میں نمائندگی، بلدیہ جات میں نمائندگی، ڈسٹرکٹ بورڈز (ضلع بورڈ) میں نمائندگی شامل تھے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ نمائندگی کے اصولوں کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ممبروں کا انتخاب مسلمان ووٹرز کریں اور ہندو ممبروں کا انتخاب ہندو ووٹرز۔'' یہی اصول بلدیہ جات اور ڈسٹرکٹ بورڈز کے ممبروں کا انتخاب کرتے وقت بھی اپنایا جانا چاہیے۔ دستوری اصلاحات کے تسلسل کے ساتھ مرتب ہونے کے باعث مسلمانوں میں علاحدگی

پسندی کا رجحان بڑھنے لگ گیا۔

حکومت کا رویہ اور تلک اور ان کے ساتھیوں کا جارح ہندوازم جس کا مظاہرہ خاص طور پر گنپتی اور شیواجی کے سالانہ جلسوں میں ہوا کرتا تھا۔ کس طرح سیاسی طور پر باشعور مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے تعلق سے خدشات میں مبتلا کر دیتا تھا پہلی بار انھیں محسوس ہوا کہ اگر انھوں نے اپنے آپ کو سیاسی طور پر منضبط نہ کیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ ایسا انضباط یا تو کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کر کے کیا جا سکتا ہے یا پھر مسلمان خود اپنے طور پر یہ کام کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے تو انھیں پس و پیش رہا لیکن بالآخر پانسا ایک علاحدہ مسلم تنظیم کے حق میں پھینکا گیا۔ اس ضمن میں ۶۔۱۹۰۵ء کے دوران واقع ہونے والی دستوری صورتِ حال نے ان "علیحدگی پسندوں کو کافی تقویت پہنچائی، انھوں نے حکومت کو قائل کر دیا کہ جب تک مسلمانوں کے حسبِ منشا ان کے مطالبات کی تکمیل نہیں ہو جاتی اس وقت تک فرقہ وارانہ منافرت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا جس کی نتیجے میں فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ لارڈ منٹو نہ صرف ان کے ہمدرد تھے یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوؤں کی جانب سے دستوری ترقی کے عاجلانہ مطالبات کی روک تھام کے لیے مسلمان کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ جس وقت مسلم وفد نے "علاحدہ رائے دہندگی (Seperate Election) کا مطالبہ پیش کیا تو گورنر جنرل اور سیکریٹری آف سٹیٹ برائے ہند نے بہت زیادہ خوشی کے ساتھ نہ سہی، اپنے منٹو، مارلے اصلاحات میں اس مطالبے کو تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

چوتھا باب "انتظامی اصلاحات" کے موضوع پر محیط ہے۔ ۱۸۸۵ء میں کلکتہ میں منعقد ہونے والے کانگریس کے دوسرے اجلاس میں بعض تجاویز پیش کیں.

۱۔ ہندوستان اور انگلستان میں بہ یک وقت مقابلے کے کھلے امتحانات منعقد کیے جاتے چاہییں۔

۲۔ بہ یک وقت منعقد ہونے والے ان امتحانات میں شرکت کے مساوی مواقع

ملکہ عالیہ کی رعایا کے سبھی طبقوں کو حاصل ہونے چاہیے۔

۳۔ بلحاظ امتیاز (Merit) کامیاب امیدواروں کی درجہ وار فہرست Classifical List مرتب کی جایا کرے۔

۴۔ سول سروس کمشنروں کو چاہیے کہ امتحانی مضامین میں سنسکرت اور عربی کا مناسب لحاظ رکھیں۔

۵۔ امتحان کے لیے اہل قرار دیے جانے والے امیدواروں کی عمر ۱۹ سال سے کم یا سرسی۔ٹی چی سن Sir,C Ailchison کی سفارش کے مطابق ۲۳ سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

۶۔ بیک وقت امتحانات کے انعقاد کا مطالبہ تسلیم کیے جانے کے بعد دستوری سول سروس کے تحت ابتدائی تقررات کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔

۷۔ موجودہ قوانین کے مطابق دستوری سول سروس کے تقررات کو ملازمت غیر متعمدہ کے اراکین اور پیشہ ورانہ مہارت اور صلاحیت رکھنے والے لوگوں کو کھلا رکھا جائے۔

۸۔ موجودہ ابتدائی تقررات کے علاوہ ایسے تمام تقررات جن میں تعلیمی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے مختلف صوبوں میں مقابلے کے امتحانات کے ذریعے کروائے جائیں۔ یہ امتحانات ملکہ عالیہ کی فطری پیدائشی رعایا کے ان تمام افراد کے لیے کھلے ہونے چاہیں جو رہائشی اعتبار سے ان صوبوں کے باشندے ہوں۔

ان تجاویز کی مخالفت ہوئی، مخالفین میں مقتدر اسلامی اخبار کے مدیر منشی محرم علی چشتی، سید حسین بلگرامی نواب منیر نواز جنگ بہادر جیسی شخصیات شامل تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ خدشہ تھا کہ ہندو اکثریت کا دھارا انھیں بہا لے جائے گا۔ حکومت بھی اس بارے میں گرم جوشی کا جذبہ نہیں رکھتی تھی۔ رائل کیشن کی کی رپورٹ کی اشاعت کے چند ماہ بعد سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، لارڈ کراس کا مراسلہ شائع

ہوا جس سے تعلیم یافتہ ہندوؤں کو سخت مایوسی ہوئی۔ لارڈ کراس نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ کمیشن کی سفارشات انتہائی ''وقیع اور موزوں'' ہیں۔ان کے نفاذ کے لیے پارلیمنٹ میں کسی قانون کو پیش کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔انھوں نے دستوری سروس کے خاتمے کے تعلق سے کمیشن کی سفارش کو پسند نہیں کیا اور واضح کیا کہ بہ یک وقت امتحانات کا انعقاد قطعی مناسب نہیں ہے۔۱۹۰۴ء میں کرزن نے ملازمت عامہ کے لیے مسابقتی امتحانات کے طریقے کو ختم کر دیا۔ہندو پریس نے اپنی خفگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔مسلم رہنماؤں اور برطانیہ کے بعض ٹوری Tory حلقوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس وقت پائی جانے والی صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر گورنر جنرل نے حکومت کے مختلف محکموں جیسے پولیس، ریلویز، تعمیراتِ عامہ اور جامعات میں تحقیقات کے لیے مختلف کمیشن اور تحقیقاتی بورڈ قائم کر دیے سرکاری محکموں میں مستعدی کو بڑھانے اور سرکاری خرچ میں کمی کرنے کے بارے میں مختلف کمشنروں کی جانب سے موصول ہونے والی تجاویز کی بنا پر انقلابی تبدیلیوں کے نفاذ میں کرزن خود ہمہ تن مصروف ہو گئے۔کرزن تعلیم یافتہ دیسی باشندوں کو کسی بھی قسم کی سیاسی اور انتظامی سہولیت دینے کے مخالف تھے کیوں کہ انھیں ان کی اہلیت میں شبہ تھا۔ہندوستانی پریس نے کرزن کے اعداد و شمار کو حقیقت کے برعکس قرار دیا۔

ہندوؤں کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کو مسلمانوں نے شک کی نگاہوں سے دیکھا اور ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوئی ٹھوس ترکیب اختیار نہیں کی گئی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریسی رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد پر دھواں دھار تقاریر کیں لیکن وہ تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات کو قابو میں نہ لا سکے۔مزید یہ کہ سرکاری ملازمتوں اور رعایتوں کے تعلق سے کانگریس نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ بھی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا۔مثلاً امرت بازار پتریکا نے حکومت کو اس بات کا انتباہ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی جانب سے برتی جانے والی فیاضی اس وجہ سے ایک

انتہائی غلط اقدام ہے کہ یہ قوم انتہائی گھناؤنے قسم کے جرائم کے ارتکاب کی عادی ہے۔ دوسرے اخبار The Indian nation نے تو ان جرائم کی فہرست بھی مرتب کر ڈالی جن کا ارتکاب حالیہ برسوں میں مسلمانوں نے حکام کے خلاف کیا تھا۔ اسی طرح Hindu Petriot نے مسلمانوں کو حکام کی جانب سے دی جانے والی مراعات کو احمقانہ فعل قرار دیتے ہوئے لکھا: جی ہاں، ہماری حکومت مسلمانوں کی سرپرستی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہی ہے لیکن اس سے حاصل ہونے والے متوقع فوائد جیسا کہ ہم بار بار متنبہ کر چکے ہیں، افسوس ناک حد تک مایوس کن رہے ہیں۔ اس قسم کے جملوں کا جواب مسلمانوں کی جانب سے منہ توڑ طریقے سے دیا گیا۔ مسلم کرانیکل لکھتا ہے کہ ہمارے ہندو ہم وطن بھاری بھرکم تنخواہوں والی ملازمتوں پر قبضہ جما کر سرکاری خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور برہنہ پشت محنت کش مسلمان تپتی ہوئی دھوپ میں پسینہ بہا کر جو کمائی کرتا ہے اس سے حاصل کیے گئے محصولات سے خود کو روزانہ امیر سے امیر تر بناتے چلے جا رہے ہیں جب کہ ہماری قوم آئے دن اعتماد اور آمدن کی حامل تمام اسامیوں سے ہاتھ دھوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں ہے جب ہماری عزت وناموس، زندگی اور آزادی ایک بیرونی قوم کے رحم وکرم پر ہوگی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے کانگریس کے ایسے مطالبات کی حمایت بھی نہیں کی جیسے کہ وزارتِ داخلہ کے اخراجات میں کمی، معاشی استحصال کی روک تھام اور فوجی اور سرحدی اخراجات میں کمی۔ مسلمانوں کو ان تمام مطالبات کے پسِ پشت کسی گھناؤنی سازش کا شبہ ہونے لگا۔ مزید یہ کہ معاشیات کے بارے میں نوروجی اور واچھا کی قابلِ تحسین تحقیقات کے باوجود بیک اور موریس، مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے رہے کہ برطانیہ کے زیرِ سرپرستی ہندوستان غربت کا شکار نہیں ہوا ہے بل کہ اتنا مالدار ہو گیا ہے جتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ ان دونوں انگریز پروفیسروں کے مطابق حکومت کی معاشی پالیسی کے کانگریسی نقادان احسان فراموش طفلانِ مکتب سے بڑھ کر نہیں ہیں جو ایسے موضوعات پر لب کشائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی فہم

سے بالاتر ہوں یا اس سے بھی بڑھ کر اس بگڑی ہوئی مخلوق کی مانند ہیں جو اسی ہاتھ کو کاٹ کھاتی ہے جو ان کے منہ میں نوالہ پہنچا رہا ہو۔

چوں کہ سرسید اور ان کے رفقا کو جدید اقتصادیات سے کما حقہ واقفیت حاصل نہیں تھی اس وجہ سے وہ حقیقت کو سطحیت سے جدا نہ کر سکے۔ انھوں نے خود کو اور اپنے اطراف رہنے والے احباب کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ برطانوی راج میں سبھی ہندوستانی انھی کی طرح خوش حالی اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں برطانوی راج کی بالاتری کے بارے میں ایک مقدس عقیدہ سا ہو گیا تھا، موجودہ نظام میں کسی بھی قسم تبدیلی کا تصور کرتے ہی وہ لرز اٹھتے تھے کہ اس طرح ان کے حالات ابتری کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس کے برخلاف ہندو اس بات پر کمر بستہ تھے کہ انتظامیہ کو ہندوستانیت کے رنگ میں رنگ کر دفتر شاہی کو مغلوب کیا جائے۔ اسی کو اپنی تمنّاؤں کا مرکز جان کر اس کے حصول کے لیے وہ بے جگری سے لڑتے رہے۔

پانچواں باب ''انگریزی تعلیم کے اثرات'' کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ اس عہد کی داستان ہے جس میں مسلمان ہر لحاظ سے پس ماندگی کا شکار تھے۔ تعلیمی پس ماندگی بھی ان میں سے ایک تھی۔ سارے ہندوستان میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ ہو چکے تھے۔ اپنے انتہائی محتاط طریق کار کے باوجود تعلیمی کمیشن کو بھی اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ مسلمانوں کو پیش آمدہ تباہی کے طوفان میں غرق ہونے سے بچائے اور حسب ذیل اقدامات کی سفارش حکومت سے کرے:۔

۱۔ مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے اور اس ضمن میں ہونے والے مقامی بلدیہ جاتی اور صوبائی خرچ کو جائز منظور خرچ تصور کیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے دیسی مدارس کی فراخ دلانہ ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ اپنے نصاب میں غیر مذہبی مضامین کو بھی شامل کر سکیں۔

۳۔ مسلمانوں کے تحتانوی مدارس کے لیے خصوصی معیارات مقرر کیے جائیں۔

۴۔ مسلمانوں کے لیے تحتانوی اور وسطانی سطح تک ہندوستانی کو ذریعہ تعلیم منتخب

کیا جائے بجز ان علاقوں کے جہاں قوم کے افراد از خود کسی اور زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کریں۔

۵۔ دیسی سرکاری زبان اگر ملک کے حصے کی علاقائی زبان نہ ہو تو وہاں اسے سرکاری خرچ پر بہ طور خاص مسلمانوں کے لیے چلائے جانے والے مدارس میں تحتانوی اور وسطانی سطح تک مضمون اختیاری کے طور پر داخلِ نصاب کیا جائے اور اسی زبان میں طلبا کو ریاضی اور حساب کتاب Acconts سکھایا جائے۔

۶۔ جن علاقوں میں مسلمان بڑی تعداد میں رہتے ہوں وہاں سرکاری خرچ سے چلنے والے مدارس میں ہندوستانی اور فارسی زبانوں میں تعلیم دیے جانے کا بندوبست کیا جائے۔

۷۔ چوں کہ اعلیٰ انگریزی تعلیم کے معاملے میں مسلمان قوم خصوصی سرکاری امداد کی مستحق ہے، اس لیے اس معاملے میں ان کی جی کھول کر مدد کی جائے۔

۸۔ جہاں ضروری ہو وہاں مسلمان طلبا کے لیے بتدریج اضافہ پانے والے وظائف شروع کیے جائیں۔

۹۔ سرکاری خرچ پر چلنے والے ہر قسم کے مدارس میں مسلمان طلبا کے لیے ایک خاص تناسب میں فیس کی معافی کا بندوبست کیا جائے۔

۱۰۔ ان مقامات پر جہاں مسلمانوں کے لیے تعلیمی وقف موجود ہوں اور زیرِ نگرانی سرکار ہوں وہاں ان اوقاف سے ہونے والی آمدنی کو خالصتاً مسلمانوں کی تعلیم ہی پر خرچ کیا جائے۔

۱۱۔ جہاں کہیں مسلمانوں کے تعلیمی اوقاف موجود ہوں جنھیں خانگی افراد یا ادارے چلا رہے ہوں ایسے اداروں کو فراخ دلی کے ساتھ امدادی رقوم منظور کر کے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ سرکاری امداد کی بنیاد پر انگریزیہ تعلیم کے مدارس اور کالج کھولیں۔

۱۲۔ جہاں ضروری ہو وہاں مسلم اساتذہ کی تربیت کے لیے نارمل اسکول یا کلاسیں کھولی جائیں۔

۱۳۔ جن مسلم مدارس میں ہندوستانی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس امر کی کوشش کی جانی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے اداروں میں مسلم اساتذہ ہی درس وتدریس کی ذمہ داری سنبھالیں۔

۱۴۔ مسلمانوں کے تحتانوی مدارس کے معائنے کے لیے مسلمان ناظرینِ تعلیمات کو موجودہ کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں مقرر کیا جائے۔

۱۵۔ جو انجمنیں مسلمانوں میں تعلیم کی ترویجِ عام کے لیے قائم ہوئی ہیں انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

۱۶۔ سالانہ تعلیمی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے علاحدہ باب مختص کیا جائے۔

۱۷۔ سرکاری امداد مسلمانوں اور دیگر لوگوں میں کس تناسب سے تقسیم کی جائے۔ اس بارے میں حکومت مقامی کی توجہ مبذول کروائی جائے۔ چوں کہ یہ سفارشات کافی تفصیلی نوعیت کی حامل تھیں جن سے مسلمانوں کی بیش تر شکایات کا ازالہ ہو جاتا۔ اگرچہ حکومتِ عالیہ اور ریاستی حکومتیں ان شکایات کے ازالے کے لیے کسی فوری اقدام سے قاصر تھیں لیکن انھوں نے ان سفارشات کی جانب سنجیدگی سے دھیان دینا شروع کر دیا اور بعد ازاں جو اقدامات کیے گئے ان سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے میں کافی مدد ملی لیکن اس کے نتائج دوررس ثابت نہیں ہوئے۔

۱۹۰۶ء تک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بیس اجلاس منعقد ہوئے جن میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات، مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں اسلامیہ کالج چلا رہی تھی۔ تعلیمِ نسواں کا مسئلہ اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ موجود تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض کٹر مذہبی قسم

کے رہنماؤں کو بھی اس مسئلے کا شدت سے احساس ہونے لگا اور اسے حل کرنے کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ کٹر مذہبیت کی جڑیں مسلم قوم کے خمیر میں اتنی گہری گڑی ہوئی تھیں کہ ایک طویل عرصے تک قوم اس میدان میں خاطر خواہ ترقی نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں بھی سرکاری اداروں میں مسلم طالبات کی تعداد ۷۷۴۴ سے زیادہ نہ تھی اور خانگی اداروں میں یہ تعداد ۴۴۵۵ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس طرح ان کی جملہ تعداد ۱۲۱۶۵۵ تھی جب کہ غیر مسلم طالبات کی جملہ تعداد ۵۲۶۶۹۳۳ تھی۔ اس کے علاوہ صرف ایک مسلمان لڑکی ایسی تھی جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اعلیٰ ثانوی مدارس میں مسلمان طالبات کی تعداد ۱۵۰ سے بھی کم تھی گویا زیادہ تر مسلمان لڑکیاں تحتانوی مدارس ہی میں زیرِ تعلیم تھیں کہاں ان کے لیے یہ بات بہ آسانی ممکن تھی کہ سنِ بلوغ کو پہنچتے ہی تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دیں۔

''چھٹا باب'' ''پریس کا کردار'' پر مشتمل ہے۔ مسلم صحافت کی ابتدا غالباً ۱۸۳۰ء میں شیخ علیم اللہ نامی ایک بزرگ نے کی تھی۔ ان کے اخبار کا نام ''سماچار سُکھ رنجند رو'' تھا جو بہ یک وقت فارسی اور بنگالی زبانوں میں نکلا کرتا تھا۔ دو سال بعد ''ماہ عالم فروز'' منظرِ عام پر آیا ۱۸۳۵ء میں کلکتہ سے صحافی غلام حسین نے ''سلطان الاخبار'' نامی ایک فارسی اخبار جاری کیا۔ دہلی سے بہادر شاہ ظفر روز نامہ ''سراج الاخبار'' اور ہفت روزہ اخبار ''مہر منیر'' نکالتے تھے۔

اردو کا پہلا اخبار غالباً ''آگرہ اخبار'' تھا جو ۱۸۳۰ء میں کسی وقت جاری ہوا۔ اس کے بانی کا نام تا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں دہلی سے ''سید الاخبار'' جاری کیا۔ ۱۸۳۰ء میں مولوی محمد باقر نے روز نامہ ''دہلی اخبار'' جاری کیا جس کے بعد ۱۸۶۰ء تک کوئی دوسرا اردو اخبار میدان صحافت کی زینت نہیں بنا۔

سرسید کا ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' پہلا اہم مسلم اخبار تھا جو ۱۸۶۶ء کو جاری ہوا۔ آغاز میں یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا لیکن بعد میں منگل اور جمعہ کو دو دن شائع ہونے

لگا۔ سرسید اوران کے رفقا نہ صرف سیاسی بل کہ سماجی، مذہبی اور تعلیمی امور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ۷۸-۱۸۷۶ء کے دوران افواہیں اڑیں کہ حکومت دیسی اخبارات بند کرنا چاہتی ہے۔ بہ ہر حال ۱۸۹۰ء میں اس گزٹ کو "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں ضم کر دیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں دو مسلم روزنامے نظر آتے ہیں جن میں سے ایک "سعید الاخبار" تھا جسے مولوی ایم۔ فاضل علی بدایوں (شمالی صوبہ سرحد) سے نکالا کرتے تھے۔ دوسرا اخبار "حیدر آباد کا" ہزار داستان" تھا جسے ۱۸۸۰ء میں سید حسن جشن نے جاری کیا تھا۔ مدراس سے "مسلم ہیرالڈ" خان بہادر احمد محی الدین نے اکتوبر ۱۸۸۴ء میں جاری کیا۔ منگل، جمعرات اور ہفتہ، تین اشاعتیں ہفتہ وار ہوتی تھیں۔ ایک اور مسلم اخبار "قاصدِ ممبئی" تھا جسے ایک تاجر غلام علی غلام رسول چلایا کرتے تھے۔ یہ اخبار نیم مذہبی اور نیم تجارتی تھا۔ اس کے علاوہ مدراس محمڈن ایسوسی ایشن کا ترجمان اخبر "اتفاق" ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ "اخبار دارالسلطنت" کلکتہ، "نجم الاخبار" اٹاوہ (شمال مغربی صوبہ)، "پنجابی اخبار" لاہور، "دکن جرنل حیدر آباد" (دکن)، "وکیل" امرتسر، سیاسی اعتبار سے "پنجاب آبزرور" انگریزی زبان میں، "محمڈن" انگریزی میں دو بار شائع ہوتے تھے۔

ہفتہ وار اخبارات کی تعداد کم و بیش پچاس تھی جن میں "محمڈن آبزرور (جو بعد میں 'مسلم کرانیکل' کہلایا)، "دیسی"، "بنگالی"، "انڈین مرر"، "ہندو پیٹریاٹ"، "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف" اور "امرت بازار پتریکا" وغیرہ شامل ہیں۔

۱۸۸۲ء میں دیسی زبانوں کے پریس ایکٹ کی منسوخی کے بعد کئی ایک دشواریوں کا خاتمہ ہوا۔ "اخبارِ عام"، "کوہِ نور"، "وکٹوریہ پیپر (خبار چشمۂ فیض)"، "مہرِ نیم روز" کانپور، "نجم الاخبار" اٹاوہ (یوپی)، گورکھ پور (یوپی) کے "ریاض الاخبار" اور "فتنہ"، حیدر آباد (دکن) کا "شفق"، جودھپور کا "مارواڑ گزٹ"، لاہور کے "ریفارمر" اور "رفیقِ ہند" لکھنؤ کا "اودھ پنچ"، مدراس کا "شمس الاخبار"، میرٹھ کے "طوطیِ ہند" اور "ظریفِ ہند" اور "ثنائے ہند"، پنجاب کا "ملتان ایڈورٹائزر"، مراد آباد کا "جامِ

جمشید'' اور'' آئینۂ سکندری'' مولوی ایس ایم نصرت علی کے ''نصرت الاخبار''، ''مہر درخشاں'' اور ''نصرت الاسلام'' اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۸۸۸ء میں ''پیسہ'' اخبار کی اشاعت سے اردو صحافت میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مولوی محبوب علی کی کوششوں سے ''مسلمانانِ پنجاب الحکماء'' کے حکیم غلام نبی، ''غم خوارِ عالم'' کے منشی احمد دین، ''کاشمیری'' کے محمد الدین فوق اور ''ملت'' کے مولوی شجاع الدولہ جیسے عظیم مدیر پیدا ہو سکے۔

مذکورہ بالا تمام اخبارات میں ''تہذیب الاخلاق'' سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اخبار ہے۔ دیگر مسلم ہفتہ وار رسالوں میں مولوی ممتاز علی کی اہلیہ کی زیرِ ادارت ''تہذیبِ نسواں''، ''امپیریل پیپر''، ''کشف الاخبار''، ''اخبارِ عالم''، ''انقلابِ عظیم''، ''مخزن''، ''علی گڑھ منتھلی''، ''معارف''، ''الاصلاح''، ''ثنائے ہند''، ''الندوہ'' بھی اہم ہیں۔

ساتواں باب ''مذہبی اور سماجی اصلاحات'' پر مشتمل ہے۔ راسخ العقیدگی کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود سر سید، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ مسلمانوں کو حیاتِ نو کی برکتوں سے اپنا پورا حصہ پانا ہو تو لازم ہے کہ اس سماج میں اصلاحات کے ذریعے تبدیلیاں پیدا کی جائیں۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں میں حالات کی اس نزاکت اور اصلاح کی فوری ضرورت کا احساس سر سید سے بڑھ کر کسی اور کو نہ ہوا۔ انھوں نے مسلمانوں کے اصلاحِ احوال کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کی خاطر سر سید اور ان کے رفقا نے جن باتوں کا پرچار کیا، ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسلام کی عقلی توجیح

۲۔ اسلامی روایات و رسوم کی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تطبیق۔

۳۔ اسلامی تاریخ اور ادب میں فعال دلچسپی۔

۴۔ زندگی کے تعلق سے ایسا جدید رویہ جو اپنی بنیاد کے اعتبار سے تو خالص اسلامی نوعیت کا ہو لیکن عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۵۔ عیسائیوں اور ان کے طرزِ حیات سے متعلق بہتر شعور۔

اس حوالے سے سر سید اور ان کے دیگر رفقا میں مولوی چراغ علی، مولوی امیر علی، سید محمود، مصطفیٰ خاں کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں۔ سر سید کے رفقا میں ہی ان پر تنقید کرنے والے موجود تھے جن میں نواب محسن الملک، شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے ماہ نامہ ''مخزن'' میں لکھنا شروع کیا تو مسلم معاشرے کی اصلاح کی جانب بھرپور توجہ دی۔ فوری طور پر موجودہ دور کے لیے اقبال نے کئی ایک وقیع اصلاحات کا مشورہ دیا جیسے کہ خواتین کے حقوق کا جائز تحفظ اور ان کی تعلیم کا مسئلہ۔ لیکن وہ اس حوالے سے کوئی عملی اقدام نہ کر سکے۔

خواجہ غلام الثقلین اور نیاز احمد جیسے نوجوانوں نے کانفرنس کے منتظمین سے درخواست کی کہ وہ اپنے تحت ایک شعبۂ اصلاح بھی قائم کریں جس کے اغراض و مقاصد میں دیگر باتوں کے علاوہ حسبِ ذیل امور بھی شامل ہوں:

۱۔ شادی بیاہ اور تجہیز و تکفین کے معاملات میں فضول خرچی سے دریغ کرنا، بہ طور خاص لباس اور زیورات کے سلسلے میں۔

۲۔ پیشہ ور بھکاریوں اور صحت مند فقیروں کو خیرات نہ دینا اور ان کی توانائیوں کو بامقصد رخ کی جانب موڑنا۔

۳۔ بچوں کے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی ان کی شادی کر دیے جانے سے ان کے والدین کو باز رکھنا اور ایسی شادیوں کی روک تھام کرنا جو فریقین کی منشا کے خلاف کی جا رہی ہوں۔

۴۔ بچوں اور بچیوں کو زیورات اور زر و جواہر کے استعمال کی اجازت نہ دینا تاکہ ان کے دلوں میں ان اشیا کی رغبت نہ پیدا ہو۔

۵۔ جدید طرزِ زندگی کو اپنانے کے سلسلے میں جن فضول خرچیوں کی عادت پڑ چکی ہو ان سے احتراز کرنا۔

۶۔ اس امر کا خیال رکھنا کہ ایک بھی مسلمان بے روزگار نہ رہنے پائے اور اس امر کا اطمینان کرنا کہ ہر وہ مسلمان جس میں دوسروں کو ملازم رکھوانے کی حیثیت موجود ہو وہ اپنے ایک عزیز یا دوست کو لازماً ملازمت عطا کرے۔

ن خیالات کی ترویج کے لیے ''عصرِ جدید'' نامی رسالہ جاری کیا گیا اور جن میدانوں میں اصلاحی کام کی ابتدا کی گئی اور جہاں کسی قدر کامیابی بھی نصیب ہوئی ان سماجی اور مذہبی رسوم اور رواجوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

۱۔ شادی بیاہ، خاص طور پر برات، رخصتی اور جہیز کی رسوم

۲۔ پیدائش؛ خاص طور پر عقیقہ، بسم اللہ اور ختنہ کی رسمیں

۳۔ اموات: خاص طور پر نو واں، دسواں، چہلم اور برسی کی رسومات

۴۔ دیگر سماجی اور مذہبی تقاریب جیسے کہ عید، محرم، محفلِ فاتحہ، منگنی وغیرہ

مرزا غلام احمد قادیانی کی قادیانی کے تحریک کا تذکرہ بھی مؤلف نے اس باب میں شامل کیا ہے جن کا دعویٰ تھا کہ اس عہد میں ان کا نزول محض مسلمانوں کی اصلاح کے لیے نہیں ہوا ہے بل کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے تین عظیم اقوام یعنی ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی اصلاح کا کام لے۔ ہندو اور عیسائی تو اس سے بالکل متاثر نہ ہوئے لیکن ہندوستانی اسلام پر اس تحریک نے پریشان کن اثرات چھوڑے۔ اس نے اسلام کی تعلیمات میں بنیادی ترامیم کر دیں۔ جیسے ہر قسم کے جہاد کی مخالفت، مہدی کے ظہور سے انکار، غلامی کا بتدریج خاتمہ، تعددِ ازدواج، پردہ اور طلاق وغیرہ۔

مرزا قادیانی کے دعوؤں کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی حلقوں میں شدید نوعیت کے قضیات اٹھ کھڑے ہوئے۔ دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں اس فتنے کی بُرے الفاظ میں مذمت کی گئی اور مرزا کو کافر، دجال، ملحد، مرتد، کذاب، دغاباز وغیرہ جیسے

القابات دیے گئے۔ سرسید نے دین کے دائرے میں رہتے ہوئے مسلمانوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی لیکن مرزا نے دین کے ڈھانچے کو ہی تبدیل کرنا چاہا جس کے نتیجے میں اسے منہ کی کھانا پڑی۔

''آٹھواں باب''معاشی تبدیلیاں'' کے عنوان کے تحت تشکیل پایا ہے۔ ہندوستان کے معاشی میدان میں بھی ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ متعدد تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں جس کی کئی وجوہات تھیں:

اوّل: انگریزی حکومت کے قیام کے باعث یہ ملک مغرب کے کئی جدید معاشی نظریوں اور نئے عملی طریقوں سے واقف ہو۔

دوم: رسل و رسائل کے ذریعوں میں زبردست انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

سوم: برطانوی صنعت کار کاروباری میدان میں اتر آئے۔

چہارم: مال اور عدلیہ کے محکموں کی تشکیل جدید عمل میں آئی۔

اس دور میں دو قسم کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا جن میں باغ بانی اور فیکٹریوں کا قیام شامل ہے۔ صنعتِ باغ بانی شروع سے ہی انگریزوں کی ملکیت میں رہی۔ ۱۸۶۰ء میں باغات میں کافی اضافہ ہوا۔ ان باغات میں چائے، کافی، نیل اور پٹ سن شامل تھے۔

ہندوستان کی دو سب سے اہم صنعتیں کپاس اور پٹ سن رہی ہیں۔ سوت کا پہلا کارخانہ ۱۸۵۱ء میں بمبئی کے قریب قائم ہوا۔ ۱۸۷۲۔۷۳ء تک صرف ۲۰ ملیں قائم ہو سکیں لیکن ۱۸۷۹ء تک ان کارخانوں کی تعداد ۵۶ تک پہنچ گئی۔ ۱۸۸۲ء تک پٹ سن کے کارخانوں کی تعداد ۲۰ ہو چکی تھی جن میں ۲۰۰۰۰ افراد کام کرتے تھے۔ یہ صنعت کپاس کی صنعت کے برعکس یورو پین لوگوں کی ملکیت میں رہی۔ ان صنعتوں کے علاوہ کوئلے کے حصول کے لیے کان کنی کے لیے جدید ذرائع استعمال کیے جانے لگے۔

۱۸۸۳۔۸۴ء تک سوت کے ۴۷ کارخانے لگائے گئے تھے پھر ۱۸۹۳۔۹۴ء تک

ان کی تعداد ۱۳۸ ہو گئی اور ۴۲۔۱۹۳۰ء تک ۲۰۶ کارخانے قائم ہو چکے تھے۔

ہندوستان میں بینکاری کی تاریخ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوتی ہے۔اس سال اودھ کمرشل بینک قائم کیا گیا جس میں ۲۷۳۰ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی جو ۱۸۹۷ء تک تین لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء کو مشہور کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے کی کوششوں سے پنجاب نیشنل بینک کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۱۰ء تک ان بینکوں کی تعداد ۴۷۶ تک جا پہنچی۔اسی کے ساتھ ساتھ لالہ ہر کشن لال نے ''بھرت انشورنس کمپنی'' کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۸۹۷ء میں آر۔ای بھروچا اور ای۔ایف الم نے مشہور و معروف ''دی ایمپائر آف انڈیا لائف انشورنس کمپنی قائم کی۔ مسلمانوں کے زیر اثر ''میوچل لائف انشورنس سوسائٹی'' قائم ہوئی۔

تمام تر ترقی کے جدید ذرائع کی دست یابی کے باوجود پس ماندہ ہی رہے۔ کبھی کبھار حکومت نے ملازمتوں کے عدم توازن کو درست کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو ملازمتیں ملیں اس لیے مسلمان انگریزوں کے دست نگر بن کر رہ گئے۔ انگریزی کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بھی مسلمان ملازمتوں کے حصول میں کافی حد تک ناکام رہے۔ مزید یہ کہ مسلمان نام نہاد شان دار ماضی کی یادوں میں کھو کر رہ گئے۔ انھیں بدلے ہوئے حالات کی حقیقتوں سے صحیح معنوں میں آشنا کرنے کے لیے انقلابی انداز میں جھنجھوڑنے کی ضرورت تھی لیکن ان کی جاگیردارانہ قیادت اس مشکل فرض کی ادائیگی کی اہلیت رکھتی تھی اور نہ خواہش۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان احساسِ محرومی اور شکست خوردگی کے جذبات سے مغلوب ہوتے گئے اور بتدریج ہندوستانی معیشت کی ترقی کے قومی دھارے سے علاحدہ ہوتے گئے۔

نواں باب ''فرقہ وارانہ تنازعات'' کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اس باب میں ہندو مسلم فسادات اور ہندی اردو قضیہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جن میں سے اکثر و بیشتر فسادات اور قضیوں کے آغاز میں ہندوؤں کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔

دسواں باب ''قیادت کی خصوصیات'' پر مشتمل ہے۔اس قیادت میں سب سے اہم

نام سرسید احمد خاں کا ہے۔انھوں نے دوسرے سپاہیوں کی بغاوت کے باوجود برطانوی راج کی وفاداری کا راستہ اختیار کیا۔محسن الملک نے مالی اور ادبی دونوں طرح سے سرسید کی اعانت کی۔مولانا الطاف حسین حالی سرسید کے دوسرے قریبی رفیق کار تھے۔وہ ایک اعلی پائے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نثر نگار بھی تھے۔ان کا دیوان ،مقدمہ شعروشاعری،حیاتِ جاوید اور مسدسِ حالی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مولوی نذیر احمد تعلیم ،ادب،سماجی خدمت اور تجارت میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں ناول نگاری، قانون، منطق اور علم الاساطیر پر قدرت حاصل تھی۔مولوی ذکاءاللہ عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ وہ ایک عظیم مترجم تھے۔ ریاضی، تاریخ ،جغرافیہ ادب واخلاقیات،طبیعات، کیمیا اور سیاسیات کے موضوعات پر ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب کی تعداد ۱۴۳ بتائی جاتی ہے۔شبلی نعمانی نے تاریخی تحقیق اور جدید تنقید آرنلڈ سے سیکھی تھی۔ان کے ادبی کارناموں میں شعرالعجم (پانچ جلدیں) سیرت النبیؐ، سیرت النعمان، الفاروق، حیاتِ سعدی ،الغزالی اور موازنہ انیس و دبیر اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے علاوہ مولوی محمد سمیع اللہ کو سرسید کا دستِ راست قرار دیا گیا ہے۔ دیگر شخصیات میں سید محمود، امیر علی، طیب جی اور سید محمد قابلِ ذکر ہیں۔

گیارہواں باب ''نتائج'' کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔سرسید نے مسلمانوں کی پس ماندگی کی چار وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔ سیاسی روایات

۲۔ سماجی روایات

۳۔ مذہبی معتقدات

۴۔ غربت وافلاس

مؤلف کا خیال ہے کہ انگریزوں کی یہ نیت ہرگز نہ تھی کہ وہ وقت پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیں بل کہ انھوں نے اکثر ان کے ساتھ نہایت ہمدردانہ برتاؤ روا رکھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کے باعث زیادہ تر فائدہ ہندوؤں کو پہنچا۔اس طرح ہندوؤں اور

مسلمانوں میں خلیج بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان دولخت ہوگیا۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے اپنی اس تالیف کے ذریعے سر سید احمد خاں، ان کے رفقائے کار اور انگریز حکومت کو مسلمانوں کا سچا خیر خواہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اس سعی میں کس حد تک کامیاب رہے؟ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس حلقے کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں ضرور کامیاب رہے جو سر سید کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور سر سید کو مسلمان قوم کا سچا ہمدرد گردانتے ہیں۔

سر سید کے سیاسی افکار (۱۹۹۰ء) از ڈاکٹر فوق کریمی

ڈاکٹر فوق کریمی کی تالیف سر سید کے سیاسی افکار ۱۹۹۰ء کو ایشیا بک سنٹر، میاں چیمبرز۔۳۔ٹیمپل روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ تالیف ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تالیف چھے ابواب پر مشتمل ہے لیکن ابواب بندی بے قاعدہ اور بے ترتیبی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ پہلے باب میں انتساب ''الحاج سردار عبدالکریم عاجز'' کے نام ہے۔ AWAHAR LAL NEHRU ON SIR SYED، سر سید۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی نظر میں، پیش لفظ، تعارف (پروفیسر آل احمد سرور)، سخن مختصر (ڈاکٹر تنویر احمد علوی)، سر سید کی معنویت کی تلاش میں (ڈاکٹر قمر رئیس) اور سر سید کا سیاسی نقطۂ نظر (ڈاکٹر نورالحسن نقوی)، سر سید کے سیاسی افکار، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، قدرت کا تازیانہ، نادر شاہ کا حملہ، ہندوستان پر احمد شاہ ابدالی کے حملے جیسے موضوعات پہلے باب کا حصہ ہیں۔

دیباچہ میں مؤلف اس کتاب کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک سر سید کے سیاسی افکار اور ان کی قومی و ملکی خدمات کا تعلق ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلم یونی ورسٹی کی طرف سے ان کے کارناموں کو عوام تک پہنچایا جاتا مگر افسوس کہ آج تک ایسا نہ ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج

غیر تو غیر خود ہماری نئی نسل سرسید کو صرف اتنا جانتی ہے کہ انھوں نے علی گڑھ
میں ایک تعلیمی ادارہ مسلمانوں کے لیے قائم کیا تھا جو آج مسلم یونی ورسٹی
کہلاتا ہے۔"[۶]

دوسرا باب، نادر شاہ کی موت، اٹھارویں صدی کے ہندوستان پر ایک نظر، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک، شاہ صاحب کا فکر کل نظام، شاہ صاحب کے اصلاحی نظریات، اقتصادی اصول، نظامِ حکومت کے بنیادی اصول، بنیادی حقوق، شاہ صاحب کی نظر میں مذہب، شاہ صاحب کی تحریک کا نصب العین، شاہ ولی اللہ کی جماعت کے مراکز، حضرت شاہ صاحب کی وفات، ہجرت شاہ عبدالعزیز، ترتیب کے طریقے، ملک دوست طاقتوں کا حسرت ناک انجام، انیسویں صدی کا ہندوستان، فتویٰ عبدالعزیز، فتویٰ کا اثر، علمائے ہند کی جنگِ آزادی کے لیے قربانیاں، سید احمد شہید، انقلابی پروگرام اور تقسیم کار، ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد، اودھ کا علاقہ، اودھ کی سماجی حالت، حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات، سید صاحب کا جہاد، عارضی حکومت، پنجاب پر سکھوں کا اقتدار، بنگال کے حالات، راجہ رام موہن رائے، ہندوؤں کی اصلاحی وسیاسی تحریکیں اور جماعتیں، انگریزی تعلیم کا ہندوؤں پر اثر، وہابی تحریک، ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔

انگریز کسی نہ کسی بہانے سے ہندوستان کے راجے مہاراجے اور نوابوں کے اختیارات کو رفتہ رفتہ محدود کر کے ان کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ کہیں تو انھوں نے طاقت سے علاقے فتح کیے اور کہیں حکم ناموں کے ذریعے اختیارات اور مراعات حاصل کیں۔ کہیں نوابوں اور مہاراجوں کو اپنے ساتھ فوجی اتحاد میں شامل ہونے پر مجبور کیا اور اپنی فوجوں کو ان علاقوں پر متعین کر کے ان کے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ کہیں تاوانِ جنگ کے طور پر دیسی ریاستوں کے حصے بخرے کیے۔ سندھ کے آزاد اور خود مختار علاقے کو بغیر کسی معقول وجہ کے محض الزام تراشیوں کی بنا پر فتح کر لیا۔ واجد علی شاہ پر نااہلی اور عیاشی کا الزام عائد کر کے اودھ کو ۱۸۵۶ء میں ایسٹ

انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقے میں شامل کریں۔اسی طرح دیگر کئی ایک ریاستیں بھی انگریزوں کی تحویل میں آگئیں۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا احتجاج، نانا صاحب کا انگریزوں کو اپنی قوم کی وفاداریں یاد دلانا اور واجد علی شاہ کا عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی کام نہ آیا۔اس حوالے سے مؤلف تحریر کرتے ہیں۔

''جب عظیم اللہ خاں انگلستان گئے تو وہاں ان کی ملاقات مرہٹہ حکومت کے نمائندہ انگوبا پوجی سے ہوئی اور دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت سے کسی قسم کے انصاف کی توقع نہیں ہے۔ چناں چہ دونوں نے انگلستان ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ حق کا فیصلہ تلوار کرسکتی ہے۔ ایسی متعدد مثالیں جمع ہوگئی تھیں۔

نانا صاحب نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں زندہ رہوں گا تو اپنے خاندان کی شان وشوکت کے ساتھ زندہ رہوں گا یا گم نام ہوجاؤں گا۔

مغلوں سے انگریزوں نے جو معاہدے کیے تھے ان کی روشنی میں شہنشاہِ دہلی کی شہنشاہیت بہر نوع تسلیم کی گئی تھی اور اس کی رسمیں آخر زمانے تک ادا ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریزوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد شہنشاہیت ختم ہو جائے گی اور بادشاہ کے متعلقین اور متوسلین کو قلعہ معلیٰ سے باہر نکل کر شہر میں سکونت اختیار کرنا پڑے گی۔

انگریزوں کی اس طرح بدعہدی اور ہندوستانی رسم ورواج وعقائد میں کھلم کھلا مداخلت سے پورے ملک میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت ہو چلی تھی۔'' [۱۲]

باب سوئم کی ذیل میں، ہندوستانی فوج کا ردِعمل، چربی کے کارتوس، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی یا فوج کی بغاوت، کیا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو جنگِ آزادی کہا جاسکتا ہے؟، ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کا انتقام، سید احمد خاں، ۱۸۵۷ء کا غدر اور سید احمد خاں، نواب محمود علی خاں، محمود خاں کی انگریزوں کے خلاف جنگ، سید

صاحب کو انگریز وفاداری کا صلہ، سید احمد خاں کا ایک دوسرا رخ، اسبابِ بغاوتِ ہند اور سرسید، سرسید کی انگریزوں سے دوستی، سرکشی ہونا پانچ اصولوں پر ہے، اول، غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا، دوم، مداخلت مذہبی سمجھنا، سکندرہ کے یتیموں کا ذکر، حکامِ شہر کا مشنری طریقہ برتنا، مشنری اسکول، دیہاتی مکتب، پادری اے ایڈمنڈ جیسے موضوعات شامل ہیں ہیں۔ ان عنوانات کے تحت مؤلف ایک طرف سرسید کو ہندوستانی عوام کے خیر خواہ کے روپ میں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب انگریزوں کا وفادار۔ مؤلف اس تضاد کو ختم کرنے میں مکمل طور پر ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل میں اس تضاد پر مبنی اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:۔

> ''نواب محمود خاں نہ تو سیاست دان تھے اور نہ مصلحت پسندانہ ان کا مزاج تھا۔ وہ ایک جاگیردارانہ ذہن رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور اس آزادی کی تحریک کے دوسرے رہنماؤں کی طرح نواب محمود خاں اور ان کے ساتھیوں پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور نواب کو حبسِ دوام کی سزا کا حکم سنایا گیا اور قیدِ فرنگ ہی میں وہ قیدِ ہستی سے آزاد ہو گئے۔
>
> سید صاحب نے سرکشی بجنور کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے اور ہم اسے تسلیم بھی کرتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ سچ ہے۔ لیکن اس پوری کتاب میں جہاں جہاں نواب محمود خاں اور ان کے ساتھیوں کا انگریزوں سے مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں انگریزوں کو جو فتح حاصل ہوئی ہے اس کا ظہار سید احمد خاں نے اس طرح کیا ہے کہ یہ فتح انگریزوں کی نہیں بل کہ خود سید احمد خاں کی ہے۔ نواب اور ان کے ساتھیوں کے ہر عمل واقدام کو سید صاحب نے نہایت حقارت سے دیکھتے ہیں اور نواب کی شکست پر خوشی کا ظہار کرتے ہیں اور انگریزوں کے ہر فعل پر خوش ہوتے ہیں۔ انگریز حاکموں کی ہر بات کو دانش مندانہ قرار دیتے ہیں اور بغاوت میں کھل کر

انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم ان کے خیالات کو ان کی تحریروں میں
پڑھتے ہیں تو ہمیں سید صاحب کی انگریز دوستی سے تکلیف ہوتی ہے اور یہ
محسوس ہوتا ہے کہ واقعی سید انگریزوں کا ایسا ہم نوا ہو کہ اس نے مسلم
مجاہدین کی ہرنا کامیابی کا نہ صرف مذاق بنایا بل کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا۔
سید احمد خاں کے احسانات سے متاثر ہو کر مسٹر شیکسپیئر حکومت کو رپورٹ کرنا
چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ چاند پور کے ایک اور معقول جائیداد سید احمد خاں کو
بعوض خدماتِ ایامِ غدر کے ملنی چاہیے مگر جب انھوں نے سید احمد صاحب
سے اس سلسلے میں استعجاب کیا تو انھوں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور
شیکسپیئر سے کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ شیکسپیئر نے کہا
کہ قاعدہ کے موافق کسی کو اس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی اس
لیے پنشن بہت قلیل ہوگی انھوں نے کہا جو سرکار عنایت کرے اس کا احسان
ہے مگر مجھ کو جائیداد لینی ہرگز منظور نہیں۔ اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت
نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ
کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، مجھے اس کی مصیبت میں
شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت
باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نیا ارادۂ ہجرت موقوف کر کے قومی ہمدردی
کو پسند کیا۔" ۱۸

جب کہ محولہ بالا اقتباس سے پہلے صفحہ ۸۸ پر مؤلف نے انگریزوں کی ان
نوازشات کا ذکر کیا ہے جو سرسید پر کی گئیں۔ ان میں عہدۂ صدر الصدور، سرسید اور ان
کے بیٹے کے لیے دو سو روپے ماہوار پنشن، خلعت پانچ پارچہ، تین قسم جواہر، ایک شمشیر
عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدد خرچ شامل تھے۔

باب چہارم کی ذیل میں، محبت اور اتحاد ہندوستانیوں سے نہ کرنا، متی باب ۷ درس
۱۲، پیٹرس خط ۲ باب ادرس ۷، پچھلی عمل داریوں میں جب تک ہندوستانیوں میں محبت

نہ ہوتی آسائش نہ ہوتی، ہندوستانیوں کی بے توقیری، مسلمانوں کو یہ باتیں ناگوار تھیں، بد انتظامی اور بے اہتمامی فوج کی، مسلمانوں اور ہندوؤں کی مخلوط فوج، اگر مسلمانوں کی جدا پلٹن ہوتی تو؟، اسباب بغاوتِ ہند کے نتائج، راجہ رام موہن رائے، تفصیل عہد و پیمان، سرسید کا سیاسی ذہن اور ان کے افکار، تحقیق لفظ نصاریٰ، ہندوستانیوں میں احساسِ کم تری، سرسید کا مراد آباد سے تبادلہ، غازی پور میں پہلا مدرسہ، سرسید علی گڑھ میں، برٹش انڈین ایسوسی ایشن، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سرسید کا علی گڑھ سے بنارس تبادلہ، ورنا کیولر یونی ورسٹی کے لیے تحریک، ہندو مسلم اتحاد پر کاری ضرب، تہذیب الاخلاق کا اجرا، بنارس سے سرسید کا مستقل علی گڑھ آنا، کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان، مدرسۃ العلوم کا قیام، ابتدائی مدرسہ کا قیام، سرسید اور مذہب، پہلا خطرہ، دوسرا خطرہ، تیسرا خطرہ، سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا، محمڈن کالج کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر، محمڈن کالج پہلا قومی کالج، سرکاری ملازمتیں اور مسلمان، ہنٹر کی کتاب پر سرسید کا ریویو، انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں سے ناانصافیاں سرسید کے شرفا اور امرا، دارالعلوم دیوبند کا قیام، انڈین نیشنل کانگریس اور سرسید، مسلمانوں کے مقابلے میں برادرانِ وطن کی حالت، کانگریس کے ابتدائی مقاصد، بنگال میں ہندوؤں کی سیاسی جماعتیں، کانگریس کا قیام اور اس کا بانی، کانگریس کا پہلا اجلاس مسلمانوں کی پستی، مسلمانوں سے متعلق پالیسی میں تبدیلی، ہنٹر کمیشن کی سفارشات، مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہنٹر کی رائے، سرسید کا سیاسی مسلک، طریقۂ انتخاب اور سرسید، سرسید کا قومی نظریہ، سول سروس کے امتحانات، مسٹر تھیوڈر بیک، مسٹر بیک اور کانگریس، انگلو مسلم اتحاد ممکن مگر ہندو مسلم اتحاد ناممکن، ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا اعادہ نہ ہو، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا قیام، لاہور کے اجلاس میں مسٹر بیک کی تقریر، کانگریس کی مخالفت، کانگریس کے بارے میں مسلمانوں کا نظریہ، جلسہ اینٹی کانگریس، راجہ بنارس کی کانگریس کے خلاف تقریر، کانگریس کی مخالفت میں ہندو اور مسلمان، متفقہ تجویز، کانگریس کے خلاف سرسید کی پہلی تقریر، سرسید کی ایک اور کانگریس مخالف

تقریر، اسپیچ بہ نتائج کانگریس کے، سر سید اور جمہوریت، نشاناتِ راہ نما، شامل ہیں۔

چوتھے باب کے بعد باب پنجم اور ششم کا کہیں نام ونشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ حالاں کہ ''سر سید کا ولایت جانا'' سے لے کر ''مسلمانوں کی پستی'' تک کے موضوعات باب پنجم کی ذیل میں آتے ہیں اور ''مسلمانوں سے متعلق پالیسی میں تبدیلی'' سے لے کر ''اختتام تک موضوعات باب ششم کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ تالیف مؤلف کے متضاد بیانات کا مجموعہ ہے اور یہ تالیف نا قابلِ اعتبار اور نا قابلِ سند خیال کی جا سکتی ہے۔ اس تصنیف میں مصنف کا سر سید سے بُغض بھی واضح ہوتا ہے۔ اسلوب اور انداز بیان عمدہ ہے۔

مقالاتِ سر سید، حصہ نہم، (۱۹۹۲ء) مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

مقالاتِ سر سید، حصہ نہم، (۱۹۹۲ء) مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ تالیف ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرس، حصہ نہم: ملکی وسیاسی مضامین کے عنوان کے تحت بارہ مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ ان میں ''نا مہذب ملک اور نا مہذب گورنمنٹ، ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ، امپریس اور وائسرائے، سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ہے؟ خطابِ شاہی، البرٹ بل، کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟، ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمیوں کا ازالہ، انڈین آبزرو اور مسلمان، وہابی۔ اہلِ حدیث یا متبع حدیث، زمانہ کی ترقی کا نشان اور یورپ کی موجودہ حالت'' جیسے موضوعات شامل ہیں۔

ملک کا غیر مہذب ہونا تو اس ملک کے باشندوں کا غیر مہذب ہونا ہوتا ہے کیوں کہ جب یہ کہا جائے کہ انگلینڈ، فرانس اور امریکہ نہایت مہذب ملک ہیں تو اس کے لازمی معنی یہ ہوں گے کہ وہاں کے باسی تہذیب وتربیت یافتہ ہیں۔ ہندوستان کو جو غیر مہذب یا نیم وحشی تصور کیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ یہاں کے رہنے والے غیر مہذب یا نیم وحشی گنے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے تقریر خدیو مصر کی سر سید نے

تعریف کی اور کہا کہ علما کے اس طریقہ سے بلاشبہ یہ فائدہ ہوا کہ مسلمانی فقہ ایسی عمدہ اور موجہ و مدلل ہوگئی کہ کسی قوم میں ویسی عمدہ فقہ نہیں مگر اس کے نقصانات بھی سامنے آئے جیسا کہ:

اول: تمام لوگوں کے خیالوں میں یہ غلط مسئلہ جم گیا کہ مذہبِ اسلام تمام دنیوی امور سے بھی متعلق ہے اور کوئی دنیاوی کام بے سند یا اجازتِ مذہبی کے نہیں کیا جا سکتا۔

دوم: بعض علما نے اپنے اجتہاد و قیاس کے ذریعے، حالاتِ وقت، عادتِ اہلِ زمانہ یا رواجِ ملک قرار دیے، انھیں عین مذہبِ اسلام سمجھ لیا گیا اور بہت سے لوگ مرتبۂ شارع پر فائز ہو گئے۔

سوم: ان مسائل کے برخلاف کرنا، خلافِ اسلام کرنے کے مترادف ہوا جو درحقیقت ایسا تصور کرنا خلافِ مذہبِ اسلام ہے، نہ اس کے برخلاف کرنا۔

چہارم: جب مسائلِ مذکورہ کو عین مذہبِ اسلام سمجھا گیا تو سول کوڈ، سول پروسیجر، کریمنل کوڈ، کریمنل پروسیجر، ریونیو کوڈ، ٹریڈ کوڈ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی، حالاں کہ کتبِ موجودہ فقہیہ ان میں سے ایک کے لیے بھی کافی نہیں۔ اسی لیے سر سید کا خیال ہے:

> ''ان تمام لفظوں نے کل سلطنت ہائے اسلامیہ کو ڈبو دیا اور غارت و برباد کر دیا اور جو رہی سہی ہیں وہ بھی غارت و برباد ہوتی جاتی ہیں۔ قبول کرو کہ علمائے متقدمین بڑے عالم تھے، بڑے ذہین تھے، بڑے فلسفی تھے، منتظم تھے، مگر جو کچھ کہ انھوں نے دنیاوی امور کی نسبت کیا اور لکھا وہ اس زمانہ کی حالت کے مناسب تھا اور یہی سبب تھا کہ اس زمانہ میں سب سے مقدم اور سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑے فتح مند تھے۔ مگر زمانہ روز؟''[19]

سر سید نے مضمون ''ہندوستان اور انگلش گورنمنٹ'' کے زیرِ عنوان ہندوستانی عوام اور خاص طور پر مسلمانوں کو اس بات پر قائل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ

ایجی ٹیشن کی بجائے انگلش گورنمنٹ سے مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی اپنائیں تا کہ انھیں اس کے فوائد و ثمرات حاصل ہو سکیں۔ اس حوالے سے ایک مثال پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''تمام ہندوستان کے باشندوں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی خیر و عافیت اسی میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جن کی ہم رعیت ہو کر رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لاویں نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک ہوں۔ ان کو اپنا دنیوی شہنشاہ ور خداوند تعالیٰ جل شانہ کو شہنشاہوں کا شہنشاہ اور اپنا مالکِ حقیقی سمجھتے رہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے بوستان میں لکھا ہے۔ شعر:

سزد گر بدورش بنامِ چناں

کہ سید بدورانِ نوشیرواں

جس کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ خدا کا شکر فرماتے تھے کہ وہ سلطانِ عادل یعنی نوشیرواں کے عہد میں پیدا ہوئے، نوشیرواں آتش پرست بادشاہ تھا، لیکن عادل تھا۔ اس کے زمانہ میں پیدا ہونے پر اگر رسولِ خدا ﷺ نے خدا کا شکر کیا ہے تو ہم کو ایسے بادشاہ کی رعیت ہونے سے جس نے ہمارے مذہبی امور بجالانے میں ہم کو کمال آزادی دے رکھی ہے کیوں نہ خدا کا شکر بجالاویں اور اس کی درازی عمر و دولت و اقبال کی کیوں نہ خدا سے دعا کریں۔''[۲۰]

سر سید کے مضمون ''امپریس اور وائسرائے'' میں ہندوستانی عوام کو ملکہ عالیہ کی مکمل تابع داری کرنے کا مشورہ دیا ہے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملکہ عالیہ نہ صرف برطانیہ کے عوام کی ملکہ ہیں بل کہ ہندوستان کی بھی ملکہ ہیں، اس لیے ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ نافرمانی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ملکہ کے تمام احکامات کی بجا آوری کو اپنی

سعادت سمجھیں اور خوشی محسوس کریں۔

مضمون ''بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں تنفر ہے؟'' میں حکومت کے چند انتظامی امور سے رعایا کے متنفر ہونے کو بلا وجہ اور نقصان دہ قرار دیا ہے جب کہ حکومت کو ہندوستانی عوام کا سچا خیر خواہ کہا ہے۔اس حوالے سے حکومت کی طرف سے شفاخانوں کے قیام کو عوام پر احسانِ عظیم سے تعبیر کرتے ہوئے سراہا ہے:

''ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ نے صرف بہ نظرِ نفع رسانی مخلوق کے بہت سے ایسے انتظام کر رکھے ہیں کہ اگر ان کے اصل منشا کے موافق رعایا کو فائدہ پہنچایا جاوے تو اس کا فائدہ بے انتہا ہو اور اس کے لحاظ سے رعایا پر بے انتہا شکرگزاری لازم ہو۔مگر افسوس ہے کہ ایسے بے نظیر اور عمدہ انتظاموں کو ہندوستان کی اکثر رعایا نہایت ناپسند کرتی ہے اور بعض اوقات اس کا تنفر اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ اگر اس پر تشدد کیا جاوے تو رعایا اس کو ایسا سلوک سمجھتی ہے جیسا کہ ایک مجرم کے ساتھ بہ نظر اس کی سزا کے کیا جاتا ہے۔ دیکھو مثلاً شفاخانوں کا جاری کرنا ہی ایک ایسا انتظام ہے جو سرا سر رعایا کی بہبودی کا سامان ہے اور اگر رعایا اس سے حسبِ منشاء گورنمنٹ سے فائدہ حاصل کرنے کا قصد کرے تو اس میں بہت ہی کچھ فائدہ رعایا کا متصور ہے۔''[۱۲]

مضمون ''خطابِ شہنشاہی'' میں انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک عظیم الشان مباحثے کی جانب سرسید نے توجہ دلائی ہے جس میں حکومت کے حامی یہ چاہتے تھے کہ ملکہ معظّمہ کو شہنشاہ کا خطاب دیا جانا چاہیے جب کہ مخالفین کا استدلال تھا کہ یہ خطاب نہیں جانا چاہیے کیوں کہ اس خطاب سے فخر و نخوت عیاں ہے۔اس مضمون کے آخر میں دو پارلیمانی شخصیات کی تقاریر کے تقابل سے سرسید ملکہ عالیہ کو شہنشاہی کا خطاب دیے جانے کی پرزور تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

''۔۔۔۔ہاں البتہ اگر شہنشاہ کے معنی ہی جابر کے ہوں تو شاید یہ اعتراض

صحیح ہو اور یہ تو غلط ہے کہ شہنشاہ کے معنی جابر کے ہیں۔ اگر مسٹر لو صاحب
پنی چست تقریر سے یہ بات ثابت کردیں کہ جس استحقاق کے لحاظ سے
شہنشاہی کا خطاب ہونا چاہیے وہ استحقاق ہی ملکہ معظمہ میں نہیں ہے تو البتہ
ہم تسلیم کریں گے کہ ہاں یہ خطاب نامناسب ہے اور جب تک یہ امر ثابت
نہ ہو اس وقت تک ایسے وجوہ سے اس کو نامناسب ثابت کرنا کچھ صحیح نہیں
ہو سکتا۔ ہم نہایت تائید کرتے ہیں ڈسریلی صاحب کے اس خیال کی کہ وہ
ملکہ معظّمہ کے واسطے شہنشاہی کا خطاب صرف اس فخر و عزت کے ہی
ستحقاق کے لحاظ سے جائز بیان کرتے ہیں جو فی الواقع اس کے واسطے
درکار ہے اور جو فرقہ اس کا مخالف ہوا ہے وہ بھی اس استحقاق میں کچھ کلام
نہیں کرسکتا۔ اگر اس کو کلام ہے تو ایسے زائد احتمالات پر جو اس موقع کے
مناسب نہیں ہیں۔ پس ہم ہندوستان کے باشندے نہایت خوش ہیں کہ
ہماری ملکہ معظّمہ شہنشاہ کے خطاب سے مخاطب ہوں۔'' ۲۲

مضمون ''البرٹ بل'' میں سر سید نے آنریبل سی۔ پی۔ البرٹ صاحب لا ممبر کونسل
گورنر جنرل آف انڈیا کی جانب سے مجموعہ ضابطہ فوجداری کی چند دفعات کی ترمیم
میں ایک بل کونسل میں پیش کیا گیا۔ مجموعہ ضابطہ فوجداری کی تین دفعات یعنی دفعہ
۲۲، ۱۲۵ اور ۴۴۴ میں ترمیم مقصود تھی جو پاس ہونے کی صورت میں ہندوستانی حکام کو
یورپین صاحبان رعیت برطانیہ کی نسبت بھی مقدمات فوجداری کی سماعت کا اختیار
حاصل ہو جائے گا۔ البرٹ کی یہ ترمیم فاتح قوم کے ایک مفتوح قوم کے بارے میں
جذبات و احساسات کی آئینہ دار تھی۔

مضمون ''کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟ (منقول از حیاتِ جاوید)'' میں
سر سید نے سرکشی کے معنی اور اس کی مثالیں، سرکشی کا ارادہ دل میں کیوں آتا ہے؟
۱۸۵۷ء کی سرکشی کسی ایک بات سے نہیں ہوئی بل کہ بہت سی باتوں کا مجموعہ تھا، چپاتی
بٹنا کوئی سازش کی بات نہ تھی، روس اور ایران کی سازش کچھ نہ تھی، اشتہار کا ذکر جو

شاہزادہ ایران کے خیمہ میں سے نکلا، دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا عجیب نہیں مگر بنیاد سرکشی نہیں، اودھ کی ضبطی اس عام فساد کا باعث نہیں ہوتی، قوم کی سازش واسطے اٹھ دینے غیر قوم کی حکومت کے نہیں، دلی کے معزول بادشاہ کی وقعت دلی کے لوگوں میں اور اب شہروں میں جو دلی کے قریب تھے کچھ نہ تھی مگر بیرونجات میں لارڈ اسہرست کا کہنا کہ خاندان تیمور دلی کا بادشاہ نہیں، پہلے سے کچھ سازش مسلمانوں میں جہاد کی نہ تھی، مولوی محمد اسماعیل کے وعظ اور جہاد کا ذکر، اس ہنگامہ میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے مطابق نہیں ہوئی، دلی میں جہاد کا فتویٰ جو باغیوں نے چھاپا دراصل وہ جھوٹا ہے، دلی میں مولویوں کا بڑا گروہ جو معزول بادشاہ کو بدعتی سمجھتا تھا اور اس کی مقبوضہ مسجدوں میں نماز نہ پڑھتا تھا، جن کی مہریں فتوے پر چھاپی ہیں ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو جان اور عزت کی پناہ دی تھی، پہلے سے فوج میں بغاوت کی صلاح نہیں تھی، پہلے سے فوجِ باغی کی بادشاہِ دہلی سے سازش نہ تھی، شریک نہ ہونا ہندوستانیوں کا Legislative کونسل میں اصلی سبب فساد کا ہوا، یہ بات بہت ضروری تھی، اس سبب سے رعایا کا منشا گورنمنٹ پر نہ کھلا اور گورنمنٹ کا نیک ارادہ ہندوستانیوں پر ظاہر نہ ہوا بلکہ برعکس سمجھا گیا، سرکشی کا ہونا پانچ اصول پر مبنی ہے، اول۔ غلط فہمی رعایا، مداخلتِ مذہبی سمجھنا، سکندرہ کے یتیموں کا ذکر، مذہبی گفت گو بہت ہوئی، حکام متعہد کا مشنری طریقہ برتنا، پادری صاحبوں کا وعظ، مشنری سکول، دیہاتی مکاتب، لڑکیوں کے اسکول کا اجرا، بڑے کالجوں میں طریقہ تعلیم کا تبدل، گورنمنٹ کا اشتہار درباب استحقاق نوکری، جیل خانوں میں اخلاط اکل و شرب، پادری اے ایڈمنڈ کی چٹھیوں کا اجرا، اصل دوم: دوم اجرائے ضوابط آئین نامناسب، ایکٹ ۲۱، ۱۸۵۰ء، ایکٹ ۱۵، ۱۸۵۶ء، عورتوں کی فعل مختاری، بعض قوانین خلافِ مذہب باوصف متحد المذہب ہونے متخصمین کے، ضبطی اراضی لاخراج، لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب کا قول، نیلام زمینداری، سختیِ بندوبست، تعلق داروں کی شکست علی الخصوص اودھ میں، اسٹامپ، دیوانی عدالت کا انتظام پنجاب سے اچھا ہے مگر اصلاح

طلب ہے، اصل سوم سوم۔ ناواقفیت گورنمنٹ حال رعایا سے، حکام اضلاع حالات رعایا سے مطلق واقف نہ تھے، مفلسیِ ہندوستان علی الخصوص مسلمانوں کی نوکریاں بہت قلیل تھیں۔ روزگار پیشہ جو قاطبۃ مسلمان تھے بہت تنگ نظر تھے، اسی مفلسی کے سبب لوگوں کا ایک آنہ اور ڈیڑھ آنہ یومیہ یا سیر بھر اناج پر باغیوں کی نوکری اختیار کرنا، خیراتی پنشن اور انعام بند ہونے سے ہندوستان کا زیادہ محتاج ہونا، کمپنی نوٹ سے ملک کی زہر باری، صرف مفلسی کے سبب سے رعایا کا تبدل عمل داری چاہنا، اصل چہارم: چہارم، نہ کرنا ان باتوں کا جن کا کرنا گورنمنٹ پر واجب تھا، محبت اور اتحاد ہندوستانیوں سے نہ کرنا، پچھلی عمل داریوں میں جب تک ہندوستانیوں سے محبت نہ ہوئی آسائش نہ ہوئی، ہندوستانیوں کی بے توقیری، حکامِ اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی، مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ ناگوار تھیں اور اس کا سبب، ہندوستانیوں کی ترقی کا نہ ہونا اور لارڈ ہسٹنگ نے جو ترقی کی وہ کافی نہ تھی، بادشاہانہ دربار کا نہ ہونا، الن برا صاحب بہادر نے جو دربار کیے وہ بہت ہی مناسب تھے، جس قدر اصلی سرکشی ہندوستان میں ہوئی اس سے زیادہ دکھائی دی، ملکہ معظمہ کا اشتہار نہایت قابلِ تعریف ہے بل کہ خدا کے الہام سے جاری ہوا ہے، اصل پنجم: بدانتظامی اور بے اہتمامیِ فوج، پنجم۔ بدانتظامی و بے اہتمامیِ فوج، مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر کے پلٹنوں میں نوکر رکھنا، اگر مسلمانوں کی جدا پلٹن ہوتی تو شاید مسلمانوں کو کارتوس کاٹنے میں عذر نہ ہوتا، گوج ہندوستانی کا نہایت مغرور ہو جانا اور اس کے اسباب، جنوری ۱۸۵۷ء کے بعد فوج میں صلاح اور پیغام ہوئے کہ کارتوس نہ کاٹیں گے، ترجمہ چھٹی پادری ای ایڈمنڈ جس کا ذکر سرسید نے اس مضمون میں کیا ہے، نقل اشتہار گورنمنٹ بنگال جس کا ذکر سرسید کے مضمون میں ہوا ہے، جیسے موضوعات کے تحت بغاوت کے اسباب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مضمون ''ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمیوں کا ازالہ'' کے زیرِ عنوان سرسید نے ان مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ وہابیت کی بابت ایک کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا تھا اور

۱۸۵۲ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے کی تیرھویں جلد میں چھپا تھا، چناں چہ اس رسالہ میں عقائدِ وہابیت کی نہایت صحیح تشریح کی گئی تھی مگر ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے ان کا اختصار کر کے سات مسئلے حسبِ ذیل بیان کیے ہیں'

اول: ایک صانع کی ذات ماننا

دوم: انسان اور اس کے پیدا کرنے والے کے درمیان شفاعت کسی ذریعہ کو مطلق تسلیم نہ کرنا اور اولیاؤں سے استعانت اور امداد طلب کرنے کو برا سمجھنا بل کہ خاص ہجرت رسول ﷺ کی شفاعت کا معتقد نہ ہونا۔

سوم: مسلمانوں کی شریعت کے معنی کو خاص اپنی رائے سے تعبیر کرنے کا استحقاق رکھنا اور متقدمین و مجتہدین کے اقوال کو اور قرآن مجید کی اس تفسیر کو صحیح نہ سمجھنا جو متقدمین نے کی ہے،

چہارم: جو زیادتی اس زمانہ کے مسلمانوں یا اوسط زمانہ کے مسلمانوں نے سچی شرع میں اپنی رائے کی کی ہے اس کو ناجائز سمجھنا۔

پنجم: ہمیشہ امام مہدی کے ظہور کا منتظر رہنا جو کافروں پر سچے مسلمانوں کو فتح یاب کریں گے۔

ششم: اعتقاد اور عمل دونوں میں تمام کفار پر جہاد کرنے کے فرض کو تسلیم کرنا۔

ہفتم: مرشد کی کامل اطاعت کرنا۔

مذکورہ بالا مسائل میں چند اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح سرسید نے اس مضمون میں کر دی ہے۔ آخر میں ان کا کہنا ہے:

"۔۔۔ اگر چہ میں اس محبت اور خیر خواہی کے سبب سے ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا نہایت دل سے ممنون ہوں جو انھوں نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر میرے ہم مذہبوں کی نسبت ظاہر فرمائی ہے لیکن میں ان کی طرزِ تحریر پر نہایت افسوس کرتا ہوں۔ میرے دل سے یہ خیال ہرگز دور نہیں ہو سکتا کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی کتاب کا لکھنا شروع کیا ہوگا اس

وقت ان کو مسلمانوں کے مطالب کی ترقی کا زیادہ خیال تھا اور وہ خیال آخر تک باقی نہیں رہا۔ چناں چہ ان کی کتاب کے پچھلے صفحوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ میری دانست میں ڈاکٹر ہنٹر صاحب کو اپنی تحریر کے وقت وہابیوں کی سازش کا خیال ہوگا اور اسی پر انھوں نے عمل کیا ہے۔ صاحب ممدوح کی کتاب بہ اصولِ سیاست کے بالکل غلط ہے اور تواریخ کے لحاظ سے کسی قدر کم غلط ہے اور میں یہ بات پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ جو اثر ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی علمی لیاقت سے ہندوستان کے باشندوں پر ہوا ہے اس کا رفع کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے اور یہ اثر ہندوستانیوں کی نسبت اس سبب سے اور بھی زیادہ قوی ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب کو ہندوستان میں سب سے اعلیٰ حاکم نے منظور کر لیا تھا۔ پس جس صورت میں ایسی غلط باتیں تمام ملک میں مشہور ہوگئیں تو میرا خاموش رہنا مناسب نہ ہوتا۔ چناں چہ میں نے حتی الوسع ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی غلطیوں کی تردید کی ہے اور گو میری کوششیں بے فائدہ ہوں لیکن میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔''۲۳

مضمون ''انڈین آبزرور اور مسلمان'' میں مسلمانانِ ہند کی تعلیم سے متعلق عدم توجہی کو موضوع بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سؤر کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنا دے۔ مسلمانوں کو سؤر سے تعبیر کیا گیا حالاں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مضمون ''وہابی۔ اہلِ حدیث یا متبعِ حدیث'' میں وہابی اور اہلِ حدیث کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولوی محمد حسین کی کوشش سے گورنمنٹ نے منظور کر لیا کہ آئندہ سے گورنمنٹ کی تحریرات میں اس فرقہ کو وہابی کے نام سے تعبیر نہ کیا جائے بل کہ اہلِ حدیث کے نام سے جس کا نام وہ فرقہ اپنے تئیں مستحق سمجھتا ہے، موسوم کیا جائے۔

مضمون ''زمانہ کی ترقی کا نشان'' میں سر سید نے بتایا ہے کہ سب سے بڑا ترقی کا نشان ان کی دانست میں یہ تھا کہ جو تعصبات نا جائز خیالات فاسدہ کے سبب سے دلوں میں جاگزین ہوتے ہیں وہ کم ہو جائیں اور وہ باہمی مخالفت جو دراصل بنائے تنزل ہے رفع ہو جائے اور قومی عزت کی حمایت کا خیال عام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے اصلاحِ احوال اور ان کے دفاع کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کو استعمال کیا اور اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو سراہا گیا کیوں کہ ان کی مساعی بارور ثابت ہوئیں۔

س جلد میں سر سید کے سیاست پر لکھے گئے مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ یہ جلد بھی تدوین کی عمدہ کاوش ہے۔

آثارِ سر سید (۲۰۰۷ء) از ضیاء الدین لاہوری

آثارِ سر سید ضیاء الدین لاہوری کی تالیف ہے جو ۲۰۰۷ء کو جمیعت پبلی کیشنز، متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ تالیف تین سو سات (۳۰۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ ترتیب میں ''عرضِ احوال'' کے بعد ''باب اول: مباحث'' میں کانگرس کے حق میں علمائے کرام کے فتووں کا پس نظر، دفاعِ سر سید میں حقائق سے روگردانی، سنہ ستاون میں سر سید کا کردار، سر سید کے عقیدت مندوں کے عجیب رویے، علمائے دیوبند اور سر سید احمد خاں، سر سید مفتی عتیق الرحمٰن کی نظر میں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں سر سید کا مبینہ حصہ، سر سید غریب کیوں کشتنی و گردن زنی؟، جنگِ آزادی کے پرستاروں پر تنقید کی مہم، سر سید اور علامہ اقبال کے نام پر انگریزوں کی غلامی کا جواز، سر سید کے ذکر میں حدِ ادب کی قیود، سر سید، قائدِ اعظم اور نظریہ قومیت، سر سید کے نظریہ قومیت کے بیان میں حالی کا حوالہ اور سر سید کے بارے میں تاریخی افسانوں کی حقیقت جیسے موضوعات شامل ہیں۔

''باب دوم: تضادات و تحریفات'' کے عنوان کے تحت سرسید کا نظریۂ قومیت اور مولوی عبدالحق، ملا دوست محمد قندھاری کی سرسید سے مبینہ ملاقات کی داستان، صف گو سرسید کی تحریروں میں پرستاروں کی تحریفات، مطالعہ قومیت، پانچواں انٹرویو بر موضوع: تعلیمی کاوشوں کا پس منظر اور چھٹا انٹرویو بر موضوع: مذہبی عقائد پر مشتمل ہے۔

باب چہارم ''عنوان میرے، باقی اُن کا (بلا تبصرہ)'' کے عنوان کے تحت بکھرے موتی (مطالعۂ سرسید میں پیشِ نظر رکھے جانے والے چند رہنما اصول) سرسید کے رفقا کی انگریز پرستی (انگریزی حکومت کی اطاعت کے حق میں جوازات) اگر ''سر'' نہ ہوتے تو کیا نہ ہوتا! (مدح خوانوں کی تصوراتی بلند پروازیاں) تاویل سازی اور خود ساختہ فلسفوں کی تخلیق (عذرِ گناہ بدتر ز گناہ) شخصیت پرستی اور نثری قصیدہ گوئی (لفاظی کے زور پر تاریخ سازی کا عمل) پہلی اینٹ کا قضیہ (جتنے منہ اتنی باتیں) بے مثل۔ لاثانی اور یکتا سرسید (نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد میں) بدحواسیاں لطیفے (...بہت دور کی موجھ...) مداحوں کی اپنی ہی تحریروں میں تضاد (ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ) من گھڑت داستانیں (ان قارئین کے لیے جن کا مطالعۂ سرسید محض نصابی ہے) ہمارا تمھارا کچا چٹھا (سرسید کے نام غالب کا حاجیہ مکتوب) اور دوربین نگاہوں کی صفات کا حامل (دوراندیش اپنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں) شامل ہیں۔

''کتابیات۔ حوالہ جاتی عبارتوں سے چیدہ چیدہ عبارتوں کے عکس'' کی ذیل میں سرکشی ضلع بجنور میں سرسید کا پرچہ نویسی کے الزام کا اعتراف، سرکشی ضلع بجنور میں سرسید کا خود پر ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں کو مروانے کا ذکر، موجِ کوثر کی دو مختلف اشاعتوں میں ایک عبارت کے دو متضاد روپ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر سرسید کے ریویو کی ایک عبارت، ڈاکٹر فوق کریمی کی مرتبہ اسباب بغاوتِ ہند کی دو مختلف اشاعتوں میں ان کے مقدمہ کتاب کے آخری صفحہ کی دو متضاد عبارتیں، کا بیان ہے۔

ضیاء الدین لاہوری نے آثارِ سرسید کی وجہِ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ایک استادِ محترم کے لیکچر کے دوران اس کی بنیاد پڑی..... ہمارے نصابِ تعلیم اور ذرائع نشر و اشاعت نے سرسید کی شخصیت اور ان کی قومی اور ملی خدمات کا کچھ ایسا مسحور کن تاثر قائم کر رکھا ہے کہ ہر شخص ان کا وارفتہ و شیدا دکھائی دیتا ہے اور انھیں ہر لحاظ سے کامل اور انسانی کمزوریوں سے مبرا جانتا ہے۔ یہ کیفیت ان افراد کے لیے مسائل پیدا کرتی ہے جو تحقیق کے شعبہ سے وابستہ ہیں کیوں کہ ان کی رسائی کچھ ایسے دستاویزی حقائق تک ہو جاتی ہے جنھیں عقیدت مند حلقہ تسلیم کرنا تو ایک طرف رہا، سننا تک بھی گوارا نہیں کرتا بل کہ اس کے جذباتی ٹھ باز پوشیدہ حقائق کی نقاب کشائی کرنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف تحقیق کا حقیقی مطلب جانتے ہیں اور حقائق کو سامنے لانے میں ہچکچاتے ہیں اور نہ کسی قسم کا خوف اور ڈر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ان کا مثبت رد یہ ہے۔

''کانگرس کے حق میں علمائے کرام کے فتووں کا پس منظر'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے سرسید کے کردار و عمل کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی شخصیت کا اصل عکس پیش کرنے کی کوشش اور جسارت کی ہے۔ اس حوالے سے روزنامہ جنگ کی ایک اشاعت میں محمد فاروق قریشی کے مضمون ''جوابِ آں غزل'' میں تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے مؤلف نے بعض حقائق سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ صاحبِ مضمون نے ''نصرت الابرار'' میں مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام کے ان فتوؤں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۸ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت میں جاری کیے۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام دستخط کنندگان علما کرام نے مسلمانوں کے مفاد کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے انھیں کسی ہندو کانگرس کا ساتھ دینے کی تلقین کی۔ ان کے حوالے سے مؤلف کا نقطۂ نظر ہمدردانہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ چوں کہ ۱۸۸۵ء میں کانگرس وجود میں آئی

اور مذکورہ فتاویٰ ۱۸۸۸ء میں حاصل کیے گئے۔ اس وقت تک کانگرس کو ہندوؤں کی جماعت تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مؤلف اپنی ذات کو ایک محقق جانتے ہوئے سرسید کے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت برتنے کے خلاف نظر آتے ہیں۔ وہ سرسید کو اسلام اور مسلم دشمن گردانتے ہیں، کیوں کہ وہ حوالے کے ساتھ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سرسید مسلمانوں کو انگریز بنانا چاہتے تھے۔ کالج کے اغراض ومقاصد کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ اس کالج کا نشان چاند میں صیب کا نشان تھا جسے مسلمان طلبہ اپنے سینے پر سجاتے تھے اور اس کا علم اپنے ہاتھوں میں اٹھاتے تھے۔ دوسری طرف سرسید اپنی تحریروں اور تقریروں میں برابر اس نظریہ کا پرچار کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ازروئے مذہب انگریزوں کی اطاعت واجب ہے بل کہ تفسیر القرآن جلد اول کے آخر میں تو انھوں نے یہ فیصلہ بھی صادر فرمادیا تھا کہ مسلمان اپنا ملک چھوڑ کر جاسکتے ہیں مگر اپنے حاکموں کے خلاف بغاوت نہیں کرسکتے۔ یہ ان کی وقتی مصلحت نہ تھی بل کہ اس کے مستقل جواز میں وہ قرآن وحدیث سے حوالے پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سے قبل وہ اپنے ابتدائی دور کی تصنیف سرکشی بجنور میں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں کے لیے چار جگہ "حرام زادہ" کا لفظ استعمال کر چکے تھے۔

سرسید نے "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" کی بنیاد کانگرس مخالف ہندوؤں سے مل کر رکھی۔ سرسید نے بعدازاں بحیثیت سیکرٹری کانگرس مخالف سکھ، ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی تمام قوموں کی شمولیت کے باعث اس کا نام بدل کر "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" رکھ دیا۔ وہ انگریزوں اور مسلمانوں میں حاکم اور محکوم اور اہلِ کتاب ہونے کے ناتے میل جول بڑھانے کی سعی کی۔

"دفاعِ سرسید میں حقائق سے روگردانی" کے زیرِ عنوان ضیاء الدین لاہوری نے نامور اساتذہ، معروف مفکرین اور مشہور دانش وروں کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ وہ سرسید کی اصل کتب کا مطالعہ کیے بغیر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو کر عوام اور قاری

کو گمراہ کرتے ہیں۔ مؤلف نے عشرت رحمانی کو ان کی تالیف سرسید کی کہانی ان کی زبانی اور ان کے مضمون سرسید اور علی گڑھ میں حقائق سے چشم پوشی کرنے کے باعث اسی زمرے میں شمار کیا ہے۔

''سنہ ستاون میں سرسید کا کردار'' کے زیرِ عنوان روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت ۲۳ نومبر ۱۹۹۵ء میں جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال صاحب کے مضمون ''قائدِ تعلیم سرسید احمد خاں'' کو مؤلف واقعاتی طور پر درست تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بجنور کے فسادات میں سرسید کے کردار کو مسلمانوں کی بجائے انگریزوں کا حمایتی سمجھتے ہیں کہ بعد میں بجنور میں بڑی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی۔ ہندو چودھریوں نے حملہ کر کے بجنور پر قبضہ کر لیا۔ ضلع کے مختلف مقامات پر ہندو مسلم فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ بالآخر انگریزوں نے سرسید اور ان کے ساتھیوں کو ضلع ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ ادھر مسلمانوں نے اپنی قوت کو دوبارہ مجتمع کیا۔ ہندو چودھری شہر پر حملے سے قبل ہی بھاگ گئے۔ سرسید کو بھی نواب سے جان بچانے کے لیے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی اور نہایت مصیبتیں جھیل کر بڑی مشکل سے میرٹھ پہنچے اور بیمار پڑ گئے۔ انگریز حاکم ان کی بیمار پرسی کے لیے گیا اور ان کی بڑی تعریف کی۔

''سرسید کے عقیدت مندوں کے عجیب رویئے'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے ان شخصیات کی تعریف و تحسین کی ہے جنھوں نے سرسید کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے صحت مندانہ روش اختیار کی۔ ان میں سرفہرست سرسید احمد خاں کے دستِ راست، عزیز ترین رفیق اور تحریک علی گڑھ کے عظیم ستون محسن الملک کا نام آتا ہے جو سرسید کو نبی یا معصوم اور ان کی رائے کو قرآن یا حدیث کا درجہ دینے کے قائل نہ تھے۔ پروفیسر اصغر عباس سرسید کے ان فرزندانِ معنوی پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ اپنی تقاریر میں سرسید سے غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اور سرسید کے افکار و خیالات کی کتر بیونت کرتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے نامور ترجمان پروفیسر خلیق الزماں پروفیسر موصوف کے موید دکھائی دیتے ہیں۔ محمد اسمٰعیل آزاد بھی سرسید کے

بارے میں صحت مندانہ رائے رکھتے ہوئے سرسید کے عقیدت مندوں کا اعلان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

''علماء دیو بند اور سرسید احمد خاں'' کے زیرِ عنوان جریدہ الشریعہ کے شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء میں مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ایک مضمون ''علماء دیو بند اور سرسید احمد خاں'' کو مؤلف نے موضوع بنایا ہے جو روزنامہ ''جنگ'' لندن میں شائع ہونے والے غلام ربانی کے ایک مضمون کا جواب ہے، جس میں غلام ربانی نے الزام لگایا کہ دیو بند فرقہ والوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے عین مقابل ایک مدرسہ کھول کر سرسید احمد خاں کی مخالفت کرنا شروع کردی اور اس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر کے اس کو نیچری کہنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا ناجائز قرار دے دیا۔ مولانا موصوف نے غلام ربانی کے تینوں دعووں کو بے بنیاد قرار دیا۔

مؤلف ''سرسید مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے نظر میں'' کے عنوان کی ذیل میں دارالعلوم دیو بند کے مجلّہ دارالعلوم کے ایک پرانے شمارے فروری ۱۹۷۹ء کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب سرسیدی حضرات سے کئی قدم آگے دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے حالات کو جواز بناتے ہوئے سرسید کے دینی خیالات کا نہایت دل فریب انداز میں بھرپور دفاع کیا ہے۔ مؤلف کے خیال میں مفتی صاحب کی بیان کردہ باتیں غیر مصدقہ اور دلائل سے غلط ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً سید محمود کی ملازمت کے بعد کالج کے لیے کیے گئے سفر کی رقوم کی واپسی کی نفی خود سرسید نے کر دی تھی۔

''سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں سرسید کا مبینہ حصہ'' کے عنوان کے تحت ماہنامہ الشریعہ کے ایک شمارے میں دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کا آغاز عطاء الحق قاسمی کے ایک کالم میں منقول مولانا زاہد الراشدی کے بیان سے شروع ہوئی۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں پر علما دیو بند کے مظالم کے باعث مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم سے محروم رہے، ورنہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام کب کا حاصل کر چکے ہوتے۔ مؤلف کے خیال میں سرسید

اپنے کالج میں ٹیکنیکل تعلیم کے آخر دم تک مخالف رہے۔ مؤلف نے اپنے اس موقف کی تائید کے لیے بہت سے حوالہ جات درج کیے ہیں۔

''سرسید غریب کیوں کشتنی و گردن زنی؟'' کے عنوان سے مؤلف نے پیام شاہ جہان پوری کے روزنامہ ''دن'' میں شائع ہونے والے کالم ''سرسید احمد خاں کا گناہ'' میں سرسید کی طرف داری اور پھر یہ چیلنج کہ: ''کیا کسی کے پاس ان حقائق کا جواب ہے؟'' کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ انگریز حکومت کے قیام کے بعد اس کا جواز ثابت کرنے کی سرسید کو آخر کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ سرسید کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی ممانعت کے جواز کو قرآن وسنت سے تلاش کرنے کے لیے کس نے اکسایا؟ مؤلف نے اپنے موقف کی تائید کے لیے سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مماثل بیانات قلم بند کیے اور حامیانِ سرسید کو مرزا قادیانی، میر جعفر اور میر صادق کے دفاع کی ترغیب بھی دلادی۔ مؤلف کے بیانات میں طنز کے نشتر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

مؤلف نے ''جنگِ آزادی کے پرستاروں پر تنقید کی مہم'' کے زیرِ عنوان بتایا ہے کہ پیام شاہ جہان پوری نے روزنامہ ''دن'' کی اشاعتوں ۲۴ اور ۲۵ اگست ۲۰۰۲ء میں مطبوعہ اپنے کالموں میں جواب الجواب کے پیشِ نظر جنگِ آزادی کو فتنہ و فساد قرار دیا ہے۔ مولف نے اپنی تحریروں کا دفاع کرتے ہوئے ان کی نامکمل اشاعت کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔

''سرسید اور اقبال کے نام پر انگریزوں کی غلامی کا جواز'' کے عنوان کی ذیل میں پیام شاہ جہان پوری نے روزنامہ ''دن'' کی اشاعتوں میں اپنے مضمون ''سرسید واقبال اور مخالفتِ فرنگ'' میں مؤلف کے خیال میں سرسید واقبال دونوں کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بعد ازاں فتویٰ دہندگان کی گنتی کی اور شہروں کے نام ڈھونڈ ڈھونڈ کر درج کر دیے۔ مؤلف کو گلہ ہے کہ فاضل مصنف نے بعض علماء دیو بند کو انگریز حکومت کا طرف دار بتایا اور انھیں یہ بھی شکایت ہے کہ اسی رسالے کے صفحہ ۴ پر

مرزا غلام احمد قادیانی کے کفر کی بات کی گئی ہے، جس کا ذکر فاضل مصنف نے اشارۃً بھی نہیں کیا۔

''سر سید کے ذکر میں حدِ ادب کی قیود'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے بازیافت کے شمارہ ۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ظفر حسن کے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''سر سید اور حالی کا نظریۂ فطرت پر ایک تبصرہ شامل ہے، جس میں فاضل تبصرہ نگار نے صاحبِ مقالہ کو مغرور اور متکبر ظاہر کیا ہے۔ مؤلف نے فاضل تبصرہ نگار کو سر سید کا بے پناہ عقیدت مند اور مرعوب قرار دیا ہے۔ مؤلف نے سر سید کو ان کے خیالات اور نظریات کے باعث تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہوئے پایا۔ اس حوالے سے مؤلف نے سر سید کے رفقا کے سر سید مخالف نظریات اور مقالہ نگار کے غرور اور تکبّر پر مبنی بیانات کو بھی قلم بند کیا ہے۔

مؤلف ''سر سید، قائدِ اعظم اور نظریۂ قومیت'' کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں کہ تاریخ کے حوالے لوگوں کے اذہان پر پردے ڈال دیے گئے ہیں۔ معلوم تاریخ کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ مؤرخ خواہ کیسا ہی غیر جانب دار کیوں نہ ہو، اسے تاریخ نویسی کے دوران بعض اوقات ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ ان کے خیال میں پروفیسر فتح محمد ملک وسیع مطالعہ رکھنے والے محبِّ وطن لکھاری ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف دو قومی نظریے کے حوالے سے سر سید کے بدر الدین حیب جی کو لکھے گئے ایک خط سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سر سید کا دو قومی نظریہ مغربی نظریۂ قومیت کے مطابق ہے، جب کہ قائدِ اعظم کا نظریۂ قومیت کی بنیاد اسلام ہے۔ مؤلف نے بھی سر سید کے دو قومی نظریے کے بانی ہونے کو دلائل کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کی ہے، لہٰذا ان دلائل کی روشنی میں سر سید کے دو قومی نظریے کا اعلان کیا گیا ہے۔

''سر سید کے نظریۂ قومیت کے بیان میں حالی کا حوالہ'' کے زیرِ عنوان منیر احمد منیر کے ''نوائے وقت'' لاہور کے شمارے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں دو قومی نظریے کا بانی سر سید کو قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اب تک کی

تحقیق کے مطابق ۱۸۶۸ء میں سرسید احمد خاں نے اسے اجاگر کیا تھا۔ اس بیان کو مزید تقویت دینے کے لیے صاحبِ مضمون نے الطاف حسین حالی کی تالیف حیاتِ جاوید کے ایک صفحے کا فرضی حوالہ بھی پیش کیا ہے، جسے مؤلف نے حالی کے بیانات کے ذریعے رد کرنے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

مؤلف نے ''سرسید کے بارے میں تاریخی افسانوں کی حقیقت'' کے عنوان کی ذیل میں اشریعۃ کے تین شماروں میں ''تاریخی افسانے اور ان کی حقیقت'' کے عنوان سے پروفیسر شاہدہ قاضی، جناب شاہ نواز فاروقی اور مسٹر یوسف خاں جذاب کی بحث کا ذکر کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے سرسید کو انگریزوں کا وفادار اور مخبر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جذاب نے اس کوشش کو سرسید کے ساتھ سراسر ظلم اور ناانصافی قرار دیا۔ مؤلف نے سرسید احمد خاں کے ذاتی بیانات حوالہ جات کی روشنی میں سرسید کو انگریزوں کا وفادار ثابت کیا ہے اور اس بات کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے کہ انگریزوں کی وفاداری کے نتیجے میں سرسید کو کون کون سی مراعات حاصل ہوئیں؟

باب دوم ''تضادات و تحریفات'' کے عنوان کے تحت تشکیل دیا گیا ہے۔ مؤلف نے ''سرسید کا نظریۂ قومیت اور مولوی عبدالحق'' کے زیرِ عنوان ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ مولوی عبدالحق سرسید کے طرف دار تھے اور انھوں نے حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا۔ ڈاکٹر منور حسین نے لسانی تنازعے کو بنیاد بنا کر مولوی عبدالحق کے بیان کی تائید کی، لیکن مؤلف نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نظریۂ پاکستان کا بانی سرسید نہیں تھا اور یہ بھی کہا کہ جب سرسید نے خود اپنے بیانات سے دو قومی نظریے کو رد کر دیا تو سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی کہنا بھی غلط ہے۔

''ملا دوست محمد قندھاری کی سرسید سے مبینہ ملاقات کی داستان'' کے عنوان کے تحت ''برہان'' دہلی کے شمارے ستمبر ۱۹۶۶ء میں مولانا حکیم فضل الرحمن صاحب سواتی

کے ایک مضمون ''سر سید احمد خاں اور دیو بند'' کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں صاحب مضمون نے ملّا دوست محمد خاں قندھاری کے سر سید احمد خاں سے ایک مبینہ ملاقات کا واقعہ خود انھی کی زبانی روایت کیا ہے۔ یہ ایک طویل خط ہے۔ مؤلف کا سب سے بڑا اعتراض یہ کہ ملّا صاحب چودہ برس کی عمر میں ہی اس موضوع پر اس قدر وسیع معلومات کیسے رکھتے تھے؟ مؤلف نے قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے بھی فاش غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ سر سید کی تفسیر ملّا صاحب بغل میں دبائے سر سید کا سر پھوڑنے کے لیے علی گڑھ روانہ ہوئے اور یہ کہ روزِ گفتگو شبِ معراج تھی اور یہی موضوع گفتگو کی بنیاد بنا۔ ایسی کہانیوں کو مؤلف نے من گھڑت داستانوں کا نام دیا ہے اور بہت سے دلائل دے کر ان کی نفی کر دی ہے۔

''صاف گو سر سید کی تحریروں میں پرستاروں کی تحریفات'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سر سید کے انتقال کے بعد ان کے پرستاروں نے انھیں تختۂ مشق بنا دیا۔ ان کی تحریروں میں تحریفات کر کے بد دیانتی سے کام لیا۔ مؤلف نے خاص طور پر سیدا نیس فاطمہ بریلوی کی کتاب ۵۷ کے ہیرو میں حضرت محل، جنرل بخت خان اور جنرل محمود خان کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ مصنفہ نے مؤخر الذکر شخصیت کے ذکر میں سرکشی بجنور کو تمام تذکرہ نگاروں کا ماخذ بتایا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس تصنیف کا مقدمہ لکھا، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ حوالہ جات میں اصل متن کے اندراج کی بجائے مصنفہ نے اپنے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور اصل عبارت کے مفہوم کو اختلافی بنا دیا ہے جو ایک محقق کے شایانِ شان نہیں۔

مؤلف نے ''مطالعۂ سر سید۔ تضادات کے چند اہم پہلو'' کے زیرِ عنوان نواب محسن الملک، الطاف حسین حالی، شیخ محمد اکرام، مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد اور ''ایک مبینہ ''رازدار'' کی جعل سازی'' کے حوالے سے حقائق کے برخلاف تحریروں کے حوالے دے کر سر سید کو ہیرو بنانے کی کوششوں کا رد اور توڑ کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مؤلف نے ان شخصیات کی تحریروں کی عکسی نقول بھی شامل کی

ہیں تاکہ اصل حقائق کو سامنے لائے جاسکیں۔

''تذکرہ ہائے سرسید میں تضاد اور غلط بیانی کے چند اور، ہر'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے چند بڑے اہلِ قلم اور محققین کی اغلاط کا احاطہ کیا ہے۔ان اہلِ قلم میں ڈاکٹر فرمان فتح پور، نیاز فتح پوری، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، سلیم منصور خالد، ڈاکٹر فوق کریمی، ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر اے۔ایچ کوثر، رئیس احمد جعفری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق اور ڈاکٹر سید معین الحق شامل ہیں، جنھوں نے سرسید کی شخصیت اوران کے افکار و نظریات کے بارے میں بعض مقامات پر اپنے بیان میں تضاد سے کام لیا ہے اور چند ایک مقامات پر تو صریح غلط بیانی سے بھی کام لیا ہے۔اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے ان میں سے ہر ایک کی تحریروں کی عکسی نقول تک پیش کردی ہیں۔

باب سوم میں ''سرسید کے ساتھ چند انٹرویوز'' کے زیرِ عنوان مؤلف نے سرسید کے افکار و نظریات میں پیدا کردہ ابہام کے پیشِ نظر سوال نامے تیار کیے۔ان میں سے ہر ایک سوال نامے کے لیے ترتیب وار'پہلا انٹرویو، دوسرا انٹرویو، تیسرا انٹرویو، چوتھا انٹرویو، پانچواں انٹرویو اور چھٹا انٹرویو' کے عنوانات دیے۔اگرچہ ہر انٹرویو میں درج سوال نامے کے تمام تر سوالات تصوراتی ہیں، لیکن ان کے جوابات سرسید کی تصنیفات و تالیفات سے اخذ کیے گئے ہیں اوران انٹرویوز کے نتیجے میں سرسید کو انگریزوں کا وفادار اور ملک دشمن کا غدار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم میں ضیاء الدین لاہوری صاحب نے ''عنوان میرے، باقی ان کا۔ بلاتبصرہ'' کے زیرِ عنوان بہت سے عنوانات شامل کیے ہیں اوران عنوانات کے لیے بھی ذیلی عنوانات کا انتخاب کیا۔ ''بکھرے موتی'' کے عنوان کی ذیل میں ''مطالعۂ سرسید میں پیشِ نظر رکھے جانے والے چند رہنما اصول'' کے تحت کئی ایک ذیلی عنوانات دیے گئے ہیں، ان میں 'پروپیگنڈہ کے زور پر بننے والے' 'مصدقہ حوالے' (پروفیسر مرزا محمد

منور)، مبالغہ، اخفا، تحریف اور مفروضہ وتراشیدہ واقعات (محمد امین زبیری)، ایشیائی شخص پرستی اور خیانت وخدائی (شبلی نعمانی)، نیک نیتی اور خلوص کا کاروبار (خورشید الاسلام صدیقی) بڑے آدمیوں کی باتیں (ملک نصراللہ خاں عزیز) تحریکوں کے حالات میں برابر رنگ آمیزی (پروفیسر محمد سرور)، پیشین گوئیوں پر اعتقاد اوران میں مرعوبیت (پروفیسر عبدالحق)، اپنے ''ہیرو'' کی شخصیت نگاری کا مسئلہ (پروفیسر سلیم اختر) اور علی گڑھ والے تعلق بمقابلہ سرسید پر طنز (ڈاکٹر سید عبداللہ) شامل ہیں۔ مؤلف نے اپنے موقف کو تقویت پہنچانے کے لیے مذکورہ بالا ''را'' کا سہارا لیا، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر شخصیت نگار نے پہلے سے ہی دل میں ٹھان لی ہو کہ اس کے ممدوح کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا تو صحیح معنوں میں تحقیق یا تنقید کا کام سرانجام نہیں پا سکتا اور دوسرے یہ کہ کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والا طبقہ جائز تحقیق یا تنقید کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

''سرسید کے رفقا کی انگریز پرستی'' کے ذیلی عنوان ''انگریزی حکومت کی اطاعت کے حق میں جوازات'' کے تحت نواب محسن الملک، نواب وقارالملک، ڈپٹی نذیر احمد اور الطاف حسین حالی کی تحریریں شامل کی گئی ہیں، جن میں سرسید کی سرپرستی میں انگریز حکومت کی اطاعت کا درس دیا گیا ہے اور انگریزوں سے بغاوت کو فساد اور غدر سے تعبیر کیا گیا ہے، لہٰذا جو انگریز کا وفادار، وہی مسلمان، بہ صورتِ دیگر کافر۔

''اگر ''سر'' نہ ہوتے تو کیا کیا نہ ہوتا'' کے ذیلی عنوان ''مدح خوانوں کی تصوراتی بلند پروازیں'' کے زیرِ عنوان سرسید کے مدح خوانوں کی رطب اللسانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ممتاز حسن کا خیال ہے کہ سرسید کے بغیر اقبال اور جناح کا کوئی وجود نہیں۔ محمود علی خاں کا کہنا ہے کہ اقبال، لیاقت علی خاں اور صدر ایوب سرسید کی دین ہیں۔ آل احمد سرور سمجھتے ہیں کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو شبلی، حالی، اقبال، یلدرم، عبدالقادر، ظفر علی خاں، محمد علی، طفیل احمد اپنے موجودہ خاص مقام کی بجائے عوام میں شمار کیے جاتے اوران کا نام لینے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ صفدر سلیمی کے خیال میں محمد علی جوہر، ظفر علی

خاں، اقبال اور قائدِ اعظم جیسی شخصیات سرسید ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ غلام احمد پرویز کہتا ہے کہ اگر سرسید ملّاؤں کے آگے جھک گیا ہوتا تو اقبال اور جناح بے نام مر جاتے۔ غلام احمد پرویز کی ہم نوائی میں ریاض الرحمٰن شروانی کا خیال ہے کہ سرسید کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی کے بغیر برصغیر میں مسلمانوں کی حالت شودروں سے بھی بدتر ہوتی۔ مذکورہ بالا شخصیات کے علاوہ صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید ارشد علی، پروفیسر علی احمد عباسی، بشیر احمد ڈار، رشید احمد صدیقی، عبدالسلام خورشید، محمد امین زبیری، احمد ندیم قاسمی، خلیل الرحمن داؤدی، ڈاکٹر خیال امروہوی، سر آغا خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر حسین فاروقی جیسی شخصیات کی آرا شامل کی گئی ہیں۔ ان آرا کو اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر سرسید احمد خاں نہ ہوتے تو قیامِ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر رہ جاتا۔

''تاویل سازی اور خودساختہ فلسفوں کی تخلیق'' کے ذیلی عنوان ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کی ذیل میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر معین الحق، عبدالسلام خورشید، آل احمد سرور، فوق کریمی، ابوسفیان اصلاحی، الطاف حسین حالی، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، غلام احمد پرویز اور رشید احمد صدیقی کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ مؤلف نے مذکورہ بالا شخصیات کی آرا کو ''تاویل سازی اور خودساختہ فلسفوں کی تخلیق'' قرار دیا ہے، جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔

مؤلف نے ''شخصیت پرستی اور نثری قصیدہ گوئی'' کے ذیلی عنوان کے ماتحت ''لفاظی کے زور پر تاریخ سازی کا عمل'' کی ذیل میں صفدر سلیمی، محمد امام دین گجراتی، ڈاکٹر قدسیہ خاتون، عبدالغفور چوہدری اور صلاح الدین احمد کی آرا درج کر کے انھیں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے لفاظی کے زور پر تاریخ سازی کرنے یا تاریخ کو بدلنے والوں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

مؤلف نے ''پہلی اینٹ کا قضیہ'' کی ذیل میں ''جتنے منہ اتنی باتیں'' کے عنوان کے تحت غلام احمد پرویز، مولوی عبدالحق، رئیس احمد جعفری، شریف الدین پیرزادہ،

ڈاکٹر اے ایچ کوثر اور مشیر مخدومی فیروز پوری کی ان آرا کو شامل تالیف کیا ہے، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ قائم کر کے پاکستان کی پہلی اینٹ ''اردو زبان'' کی ترویج واشاعت کر کے رکھ دی اور یہ کہ سرسید ہی پاکستان کے معمار اوّل ہیں۔

''بے مثل، لاثانی اور یکتا سرسید'' کے ذیلی عنوان ''نہ ان سے پہلے اور نہ کوئی بعد میں'' کی ذیل میں سید طارق حسین زیدی، صفدر سلیمی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شیخ محمد اکرام، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر عبدالقیوم اور عبدالرحمن صدیقی کے بیانات قلم بند کیے گئے ہیں، جن ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید جیسی سحر انگیز اور متاثر کن شخصیت کوئی اور نہیں۔ ان کے جیسی فرشتہ صفت اور گناہوں سے مبرّا ہستی نہ ان کے عہد میں پائی جاتی تھی اور نہ اب ہے۔

''بدحوسیاں لطیفے'' کے عنوان کے تحت '' بہت دُور کی سوجھ ... '' کا عنوان دیا گیا ہے، جس کی ذیل میں ''ڈاکٹر حسن رضوی (بنیاد پہلے، خواب بعد میں) ڈاکٹر سید محبوب شاہ (تلقین بعد میں، مایوسی تیس سال قبل ہی) پروفیسر جعفر رضا (دو متضاد حکمت عملیوں پر یکساں عمل درآمد) چراغ حسن حسرت ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) کے جواب میں اسبابِ بغاوت ہند (مطبوعہ ۱۸۵۹ء) اور یعقوب ہاشمی (پاکستان کے قیام کا ''دھبہ'') کی آرا شامل کی گئی ہیں، جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ وہ اہل قسم ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان خواب تو سرسید احمد خاں نے دیکھا تھا، جب کہ اس کی تعبیر آیندہ نسلوں نے پائی، جو کہ ان کی خام خیالی ہے اور ان کی آرا کو بدحواسیاں یا لطیفے شمار کیا جانا چاہیے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے زعم میں دُور کی کوڑی لانے کی سعی کی ہے۔

''مداحوں کی اپنی تحریروں میں تضاد'' کے عنوان کی ذیل میں ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کے بہ مصداق جمیل یوسف اور الطاف حسین حالی نے اپنی ایک رائے کی دوسری رائے کے ذریعے خود ہی نفی کر دی۔

مؤلف نے ''من گھڑت داستانیں'' کے ذیلی عنوان ''ان قارئین کے لیے، جن کا مطالعۂ سر سید محض نصابی ہے'' کے تحت مؤلف نے نصابی کتب کے حوالے سے کیے جانے والے غلط پروپیگنڈے کا جواب دینے کی سعی کی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سید عابد علی عابد، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عارف الاسلام، مولوی عبدالحق، پروفیسر محمد اسلم، رفیع اللہ شہاب، سعید صدیقی، پروفیسر انوار الحق انصاری، ڈاکٹر رفیق زکریا، سید سبط حسن، قمر الدین خاں، راجہ انور، عشرت رضانی، صفدر سیمی، نسیم احمد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور پروفیسر شان محمد کے بیانات قلم بند کیے ہیں، جن کی آرا من گھڑت قصوں کے علاوہ کچھ معنی نہیں رکھتیں۔

''ہمارا تمھارا کچا چٹھا'' کا ذیلی عنوان ''سر سید کے نام غالب کا حایہ مکتوب'' امجد علی کی ''پیروڈی'' سے ایک انتخاب ہے۔ یہ ایک خط کی صورت میں ضیاء الدین لاہوری کی خودستائشی کہی جا سکتی ہے، کیوں کہ اس خط میں انھوں نے خود کو ایک اعلیٰ پائے کا محقق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف زاویوں سے اپنی تحقیق کو ایک مکمل تحقیق ثابت کیا ہے۔

ضیاء الدین لاہوری کی تالیف آثارِ سر سید کا جائزہ لینے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مؤلف نے بڑی حد تک تحقیق کا حق ادا کیا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر ان کی تحقیق پر سوالیہ نشانات بھی لگتے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی ان کی یہ تالیف سر سید کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کو درست سمت دینے کی ایک حقیر سی کاوش ہے۔

سر سید تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر (۲۰۱۰ء) از پروفیسر افتخار عالم

پروفیسر افتخار عالم کی تالیف سر سید تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر ۲۰۱۰ء کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ تالیف ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست مضامین میں پیش لفظ (پروفیسر ابوالکلام قاسمی)، باب اول میں ''عہدِ وسطیٰ میں مذہبی رواداری کا ارتقائی عمل'' کے ذیلی عنوانات، باب دوم میں برطانوی تسلط کے

ہندوستانی معاشرت پر اثرات، باب سوم میں ''۱۸۵۷ء کا انقلاب، عوام کی پسپائی'' کے ذیلی عنوانات، باب چہارم میں ''سرسید تحریک کے ابتدائی محرکات واثرات'' کے ذیلی عنوانات، باب پنجم میں ''سرسید تحریک کے مرکزی عوامل'' کے ذیلی عنوانات اور باب ششم میں ''سرسید کی لبرل، سیکولر اور سائنسی طرزِ فکر'' کے ذیلی عنوانات شامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے سیاسی وسماجی منظرنامے میں سرسید احمد خاں اور ان کی تعلیمی اور تہذیبی تحریک نے جو مثبت اور دوررس کارنامہ انجام دیا اس کے نتیجے میں ملت اسلامیہ کی صحیح معنوں میں نشاۃِ ثانیہ ہوئی۔ یاس وحرماں کا ازالہ ہوا، جدید تہذیبی اور سائنسی فکر کا فروغ ہوا اور تعلیمی اعتبار سے ایک ایسا انقلاب برپا ہوا کہ برصغیر کی سماجی زندگی میں سرسید کی خدمات اور کارکردگی کو نظرانداز کر کے کوئی صحیح نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ اس تالیف کا سبب مذکورہ مقدمات کی تشریح وتعبیر پر مبنی ہے۔ مؤلف لکھتے ہیں:

> ''زیرِ نظر کتاب دراصل ان ہی محولہ بالا مقدمات کی تشریح وتعبیر پر مبنی ہے۔ یوں تو پہلے بھی مصنف نے سرسید کی داخلی وخارجی زندگی، تعلیمی خدمات اور مدرسۃ العلوم سے لے کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی تک کے ارتقائی سفر پر کچھ اس طرح لکھا تھا کہ دراصل معلوم اور نامعلوم حقائق پر سے نقاب اٹھ گیا تھا۔ تاہم یہ کتاب ان تمام حقائق کے محرکات وعوامل کو قدرے زیادہ بڑے سیاق وسباق میں زیرِ بحث لاتی ہے۔ سرسید تحریک کیا ہے اور کیا نہیں؟ یا سرسید تحریک کے نتائج کن کن صورتوں میں روبہ عمل آئے؟ یا سرسید کی تمام خدمات کو حقیقت پسند نقطۂ نظر سے کیوں کر دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے؟ مصنف کی سابقہ کتابوں میں ان سارے سوالات کے جواب مل جاتے ہیں در سرسید سے متعلق بہت سے غیر واضح حقائق کی گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب سرسید تحریک کا وہ پس منظر سامنے لاتی ہے جن کو بادی النظر میں سیاسی وسماجی کا نام تو دیا جاسکتا ہے مگر یہی پس منظر درحقیقت وہ محرکات ہیں جو سرسید کو فعال بنانے، ان کی تحریک کو روبہ عمل لانے

ور سرسید کو ایک عام جاگیردارانہ ماحول سے نکال کر عملی طور پر خدمت قوم
کے لیے خود کو وقف کر دینے کے عوامل ور اسباب ثابت ہوئے تھے۔''[۲۴]

باب اول: عہدِ وسطیٰ میں مذہبی رواداری کا ارتقائی عمل کے زیرِ عنوان ''ہندوستان میں مذہبی مفاہمت کی ابتدا، تصوف کی تحریک، صوفیہ کرام کی مقبولیت کی وجوہ، دب پر تصوف کے اثرات، صوفیائے کرام اور موسیقی، بھگتی تحریک، مغلیہ دور میں مخلوط کلچر کی ترقی، زبان اور ادب کا ارتقا، ترجمے اور تصانیف، تاریخ نویسی، جہانگیر کے دور میں مذہبی رواداری، صوبوں کی حد بندی لسانی بنیادوں پر، ہندوؤں میں فارسی کا چلن، مقامی بولیوں کی سرپرستی اور حوالہ جات'' کو شامل کیا گیا ہے۔

آخر میں مؤلف نے اس عہد کے رجحانات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''غرض فنِ تعمیر، رقص، موسیقی، مصوری اور شاعری کے علاوہ اٹھارھویں صدی تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہن سہن، بولنے چالنے، کھانے پینے ور روایتی رواجوں میں جو ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی اس کی انگریزوں کے ذریعہ تقریباً دوسو سال تک شعوری بیخ کنی کرنے اور موجودہ دور کے ہندوتوا اور مسلم بنیاد پرستی کے بڑھتے رجحانات کے باوجود ہم اس ہم آہنگی کو آج بھی کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگیوں اور رہن سہن کے طور طریقوں میں بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں۔ بہ شرط یہ کہ نظر پر تعصب کا چشمہ نہ لگا ہو۔''[۲۵]

باب دوم: برطانوی تسلط کے ہندوستانی معاشرت پر اثرات کے عنوان کے تحت ''برطانوی تسلط کے معاشی وسماجی اثرات، ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی پالیسی، اعتقادی نظام پر برطانوی تسلط کے اثرات اور حوالہ جات'' کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں مؤلف نے ان تمام عوامل جائزہ پیش کیا ہے جن کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور مشترکہ طور پر اپنی روایات کو بچانے کے لیے وہ انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے اور جانوں کے نذرانے پیش کرنے کو تیار ہوگئے تھے:

''غرض ہندوستانی عوام اپنی روحانی اساس کے تحفظ کی خاطر برٹش امپیریل ازم سے ٹکرانے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں برٹش امپیریل ازم کے استبداد سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی عوام نے پہلی متحدہ کوشش کی تھی۔ جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مل کر بڑے پیمانے پر اپنی جان و مال کی قربانیاں دی تھیں۔''۲۶

باب سوم: ۱۸۵۷ء کا انقلاب، عوام کی پسپائی: بنگالی آرمی، بڑھتی ہوئی بے چینی کے آثار، کارتوسوں کا تنازعہ، میرٹھ میں بغاوت، دہلی پر قبضہ، ۱۸۵۷ء کے دوران دہلی کے حالات، سر سید دورانِ بغاوت، دہلی پر انگریزوں کا قبضہ، ۱۸۵۷ء کے منفی اثرات، برٹش راج کے چند مثبت اثرات اور حوالہ جات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مؤلف نے ۱۸۵۷ء میں برپا ہونے والی جنگِ آزدی کے اسباب و علل، اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور بربادی، روایات و اقدار کی پامالی اور اس کے دوررس نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ برٹش سامراج نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے ڈاک و تار، سڑکوں، ریل کی پٹڑیوں گیس کے ہنڈے، پانی کے نلکے، ٹیلی فون، بجلی، ریڈیو، موٹر کاریں، سینما، پریس، ٹائپ رائٹر کاربن پیپر جیسی سہولیات ہندوستان میں بہم پہنچائیں۔ ان تمام تر سہولیات کا بنیادی مقصد انگریزوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا تھا اور انھیں براہِ راست فائدہ پہنچا بھی لیکن بالواسطہ طور پر ہندوستانیوں کو بھی ان سہولیات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ س حوالے سے مؤلف کا خیال ہے:

''غرض ہندوستانی وسائل کے مؤثر استحصال کے لیے جس عمدہ انفراسٹرکچر کو منظم کیا گیا تھا اس نے ہندوستان میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما کر دیا تھا اور ہندوستان 'بیل گاڑی' کے دور سے نکل کر سیدھا 'سٹیم انجن' کے دور میں داخل ہو گیا تھ۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاک تار، سڑکیں، ریل، گیس کے ہنڈے، پانی کے نلکے، ٹیلی فون، بجلی، ریڈیو، موٹر کاریں اور سینما ان سب کا ہندوستان میں رواج برٹش راج کے توسل سے ہی ہوا تھا انگریزوں کے

ذریعے رائج کردہ 'ٹیکنالوجیز' میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہندوستانی ذہن کو متاثر کیا وہ پریس تھا۔ پریس، ٹائپ رائٹر، کاربن پیپر، انگریزوں کے توسل سے ہی ہندوستان میں عام ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ انگریزوں کے توسل سے انگریزی اور جدید علوم کی ترویج نے ہندوستانی ذہن کو نئے افکار وخیالات سے منور کیا تھا۔ انھیں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی میں ہندوستانی قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ملک کی آزادی کی تحریک نے منظم طور پر برٹش راج کے خلاف عوامی جدوجہد کی مہم کامیابی کے ساتھ چلائی تھی اور ۱۹۴۷ء میں ملک کو سامراج کے شکنجے سے آزاد کروانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔''[۲۷]

باب چہارم 'سرسید تحریک کے ابتدائی محرکات واثرات' کے عنوان کی ذیل میں ''سرسید کی تحریک کے ابتدائی محرکات، سرسید کا قیام بجنور اور مراد آباد میں، غازی پور کا دور قیام، ۱۸۶۴ء کا سماجی پس منظر، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کا قیام، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ریل کے سبب درختوں کی تباہی، انسٹی ٹیوٹ گارڈن، زرعی ترقی کا منصوبہ، زرعی ترقی کے منصوبے کی اہمیت، علمِ فلاحت پر کتابیں، سرسید کی مخالفت کی جہتیں، برٹش انڈیا ایسوسی ایشن، ورنا کیولر یونی ورسٹی کی تجویز، شعبۂ تعلیم کا لسانی تعصب، اردو مخلوط کلچر کی کمزوریاں، ورنا کیولر یونی ورسٹی کا تنازعہ، لسانی تنازعہ اور فرقہ پرستی، لندن میں ورنیکولر ذریعہ تعلیم کے لیے کوشش اور حوالہ جات'' شامل ہیں۔ مؤلف نے اس باب میں بڑی صراحت سے ان عوامل کو پیش کیا ہے جو ہندوستان میں تعلیمی اداروں کے اجرا کا باعث بنے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کی نیک نیتی کی بجائے بدنیتی کسی بھی شک وشبہ میں ڈالنے کی بجائے روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ کیوں کہ اس طرح انھیں اپنی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کامیاب ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی:

''انگریز افسران نے سرسید کی ''ورنا کیولر یونیورسٹی'' قائم کیے جانے کی غرض

داشت پر منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی مخفی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ریلوے اسٹیشنوں پر موجود ''ہندو پانی'' اور ''مسلم پانی'' کی طرز پر انھیں ''ہندو کالج'' اور ''مسلم کالج'' قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بل کہ ان کے قیام سے انھیں اپنی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا مستقبل مزید روشن ہوتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ اسی لیے اس طرز کو برقرار رکھتے ہوئے بیسویں صدی کے اوائل میں شیعہ کالج، سنی کالج، خالصہ کالج، جین کالج، رستوگی کالج، کرسچین کالج، وغیرہ کی ایک باڑھ سی آگئی تھی۔

بہر حال اس سلسلے میں انگریزوں کی جو بھی نیت اور فکر رہی ہو۔ لیکن سرسید نہایت صدقِ دل اور ایمان داری کے ساتھ ہندوستان کی ترقی کے لیے تمام اہلِ وطن کے ساتھ مسلمانوں کو قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہے تھے جس کے لیے ضروری تھا کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم سے انھیں آراستہ کیا جائے اور اپنے اسی مفروضہ کو بروئے کار لانے کے لیے وہ مدرسۃ العلوم (یعنی مسلم انگلو اورینٹل کالج) قائم کرنے کی دھن میں مصروف ہوگئے تھے۔'' ۲۸؎

باب پنجم۔ سرسید تحریک کے مرکزی عوامل۔ تہذیب الاخلاق، تہذیب الاخلاق کی ادبی خدمات، تہذیب الاخلاق کے تیسرے دور کی اشاعت، کمیٹی خواست گارترقی مسلمانانِ ہندوستان، کالج فنڈ کمیٹی کا قیام، مدرسۃ العلوم کہاں قائم ہو، مدرسۃ العلوم مسلمانان کیسا ہوگا، متعصب انگریزوں کا مخالفانہ رویہ، انگلش میڈیم اسکول، اردو میڈیم اسکول، کالج کی عمارت کے نقشے، اردو میڈیم اور انگریزی میڈیم اسکولوں کی عمارتیں، کالج کی اردو میڈیم کلاسوں کا بند ہونا، سرسید اور اعلیٰ انگریز افسران، سرسید کا ایک اور غلط قیاس، ۱۸۸۵ء میں کالج کا ماحول، سرسید اور نیشنل کانگریس، بانی کانگریس مسٹر۔ ایس۔ ایکٹوین ہیوم، کانگریس کی ابتدا، احیا مذہب کی تحریکیں اور ذات کا مسئلہ، ہندو شناخت کی بازیافت، بنگلیوں کی بالادستی کا احساس، کانگریس کا دوسرا اجلاس،

کانگریس کا تیسرا اجلاس، سرسید، مسٹر ہیوم اور کانگریس، مسٹر ہیوم اور کانگریس، کانگریس میں ذات کی شناخت، سرسید کی ہم عصر کانگریس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے مقاصد، ایجوکیشنل کانگریس کی کارروائیوں سے متعلق ہدایات، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا دوسرا اجلاس، سرسید کو کے سی ایس آئی کا خطاب، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس، قانون ٹرسٹیان اور سرسید کی مخالفت، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا چوتھا اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا پانچواں اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام کی تبدیلی، کانفرنس کے نام میں مزید تبدیلیاں، ایک اہم ریزولوشن، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا چھٹا اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا ساتواں اجلاس، کانفرنس کے آٹھویں اجلاس کا پس منظر، محسن الملک و وقار الملک کا حیدرآباد سے اخراج، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا آٹھواں اجلاس، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا نواں اجلاس، نویں اجلاس کے بعد کے حالات، محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا دسواں اجلاس، سید محمود کو اختیارات کی تبدیلیسر سید کی صحت، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا گیارھواں اجلاس، سرسید اور مولوی مشتاق، سید محمود کی لکھنؤ سے واپسی، سیکرٹری کے آفس کی منتقلی، سید محمود کی طرز زندگی، سرسید کا نئے گھر میں منتقل ہونا، سرسید کا انتقال، سرسید اور چندے کا کفن اور حوالہ جات شامل ہیں۔

۱۹۱۹ء تک کانفرنس کے ریزولیوشنوں میں ''محمڈن'' کا لفظ موجود تھا۔ ۱۹۲۱ء میں ناسازگار حالات کی وجہ سے کانفرنس کا اجلاس منعقد نہ کیا جا سکا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے اجلاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کانفرنس ''محمڈن'' کے بجائے ''مسلم'' ہو چکی تھی۔ یعنی اس کا نام ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کے بجائے ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' جاری ہو گیا تھا۔ اس اجلاس میں ایک اہم ریزولیشن پاس ہوئی جس کے مفصلہ امور کا جائزہ پیش کرنے کے بعد مؤلف لکھتا ہے:

> ''اس ریزولیشن کو پڑھنے کے بعد جہاں سرسید کے دانش ورانہ ذہن اور فکر کا قائل ہونا پڑتا ہے وہیں ان کی عمدہ محققانہ اور تنظیمی صلاحیتوں کی

سند بھی فراہم ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں آج بھی اس کی ضرورت موجود ہے کہ یونی ورسٹی کے اندر متعلقہ شعبہ جات ہندوستان کی مقامی زبانوں کے، و نیز ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں مسلمانوں کی خدمات اور ان کے ''یوگ دان'' پر تحقیق کا سلسلہ جاری رکھیں (خاص طور پر ہندوستانی کلاسیکل موسیقی میں مسلمانوں کی حصہ داری ہنوز تحقیق کی متقاضی ہے) سر سید یہی ضروری تحقیق کا کام آج سے ۱۵۰ سال پہلے انجام دینا چاہتے تھے۔ ان کی اس فکر کے در پردہ جو محرکات کار فرما تھے وہ سر سید کی ''ہندوستانی مخلوط کلچر'' کو استوار کرنے کی نیک نیتی کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتے تھے۔''۲۹

باب ششم: سر سید کی جدید لبرل، سیکولر اور سائنسی طرزِ فکر: سر سید ایک محبِ وطن، سر سید اور قومیت کا تصور، سر سید اور ہندوستان کا تصور، سر سید اور قدیم ہندوستانی تہذیب، سر سید اور قومی یک جہتی، سر سید اور سیکولرازم، سر سید اور تعصب، سر سید کی جدید ور لبرل طرزِ فکر، ریل کے سبب درختوں کی تباہی، سر سید اور عصری سائنسی نظریات اور حوالہ جات پر مشتمل ہے۔

مؤلف کہتے ہیں کہ سر سید کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں ان لوگوں کی صف اول میں دکھائی دیتے ہیں جو اپنے زمانے کے سماج اور معاشرت کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے کوشاں تھے۔ انھیں گلہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ سر سید کے پرستاروں اور دشنام طرازوں نے ان پر بے جا عقیدت اور بے دلیل دشناموں کا ایسا ملمع چڑھا دیا ہے صرف سوا سو سال کے قلیل عرصے ہی میں سر سید کے قول و فکر اور ان کی اصلیت کو پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ عام ہندوستانی انھیں انگریزوں کا پٹھو یا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ متعصب انگریزوں نے انھیں ایک چال باز یعنی (Intriger) اور بنیاد پرست وہابی قرار دیا تھا۔ اکثر مسلمانوں نے انھیں مرتد، ملحد اور کافر قرار دیتے ہوئے قابلِ گردن

زنی ٹھہرایا تھا۔ غیر مسلموں کی اکثریت انھیں ایک فرقہ پرست مسلمان سمجھتی تھی، پاکستان میں انھیں آج بھی دوقومی نظریے کا بانی ٹھہرایا جاتا ہے۔ سرسید خود لکھتے ہیں کہ جب وہ وہابیوں کی وکالت کررہے تھے اس وقت انگریز، ان کو چال باز سمجھتے تھے وہیں دوسری طرف ان کے ہم وطن اور ہم مذہب ان کو گورنمنٹ کا ایجنٹ قرار دے رہے تھے۔ لیکن سرسید کا کہنا تھا کہ مجھے دونوں کے ذریعے غلط سمجھے جانے کی عادت ہوگئی تھی اور میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا کیوں کہ ایسا میرے ساتھ عرصہ سے ہوتا چلا آرہا تھا۔

سرسید سماج میں موجود منفی رجحانات کی بیخ کنی کرنے اور سماج کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا واحد ذریعہ جدید علوم وفنون کی تدریس اور تشہیر کو قرار دیتے تھے اسی لیے تمام عمر اس مقصد کے حصول کے لیے کاوشات جاری رکھیں۔ جدید علوم وفنون کی تدریس اور تشہیر کی راہ میں حائل رویوں اور رجحانات کے خالف نبرد آزما رہے خواہ وہ رجحان مذہبی ہو یا سماجی، ثقافتی ہو یا معاشرتی اور معاشی ہو یا سیاسی۔ مذہبی شدت پسندی، قدامت پسندی، روایت پرستی فرقہ پرستی اور توہم پرستی جیسے منفی رجحانات یہاں کرفرما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤلف اپنی خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''آج ہمارے ملک میں ذات پات کے بھید بھاؤ، مذہبی، علاقائی اور لسانی تعصبات اور شدت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی موجودگی میں ہمیں سرسید جیسے مذہبی رواداری کے حامل، لبرل، وسیع القلب اور کشادہ ذہن قائد کی ضرورت بدرجہ اتم محسوس ہورہی ہے۔ ان کی طرزِ اور ان کی تحریں آج بھی ہماری رہبری کرسکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم خود رواداری، کشادہ دلی اور وسیع القلبی کے ساتھ ان کو سمجھیں اور صدقِ دل سے ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔''[۳۰]

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ مؤلف نے سرسید کو قوم کا مسیحا تصور کیا ہے ور وہ خیال کرتا ہے کہ سرسید احمد خاں جیسے مصلح ہر عہد میں ہونے چاہیے، اس لیے ہمارا عہد کو ایسے

مصلحِ قوم کی اشد ضرورت ہے۔

سر سید احمد خاں، ایک مطالعہ (۲۰۱۴ء) عتیق صدیقی

عتیق صدیقی کی تالیف "سر سید احمد خاں (ایک مطالعہ)" جولائی ۲۰۱۴ء کو سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ ۴۰۔ اردو بازار لاہور سے شائع ہوئی۔ حرفِ آغاز اور انتساب کے بعد فہرست میں ابواب بندی کی بجائے انیس مختلف عنوانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان عنوانات میں "پس منظر۔ دو سید احمد"، "سید احمد خاں۔ قدامت پرستی کا دور"، "بغاوت اور سر سید"، "سر سید تحریک کا آغاز"، "قوم پرستی کا دور"، "سفرِ انگلستان"، "ایک مصلح، ایک مجدد"، "تعلیمی تحریک اور اس کی مخالفت"، "سرکاری پالیسی میں تبدیلی"، "مدرسۃ العلوم۔ یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج"، "ہندو علاحدہ مسلمان علاحدہ ہو جائیں گے"، "سر سید امپیریل Legislative کونسل میں"، "سر سید، سریندر ناتھ بینرجی اور بیک"، "سر سید اور کانگریس"، "انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن"، "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن"، سر سید اور قوم کا تصور"، "آں قدح بشکست واں ساقی نماند"، "حرفِ آخر" اور "مختصر کتابیات" شامل ہیں۔

مؤلف نے اس کتاب کی وجہِ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> "بیسویں صدی کے نصف اول کی مسلم سیاست، جو تقسیم بنگال سے شروع ہو کر تقسیم ہند پر ختم ہوئی، اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے سر سید کے سیاسی تصورات کا اور ان کی تحریک کے سیاسی کردار کا جائزہ لینا ضروری ہے جس میں بقول سید احتشام حسین مرحوم "فتح مندی کے سنگِ میل بھی ہیں، اور پس پائی کے نشانات بھی، مصالحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں ورنا روا سمجھوتے بھی۔ اور سر سید کی ہمہ گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ ان کی تحریک کے سارے نشیب و فراز ان کے افکار و اعمال

میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس لیے سرسید ہی کے آئینے میں ان کے خدوخال دیکھنا مفید ہوگا۔'' پیشِ نظر کتاب میں بھی یہی کوشش کی گئی ہے۔چناں چہ اس کی تیاری میں عام مآخذ سے زیادہ سے زیادہ خود سرسید کی تصانیف، ان کے اخبارات ورسائل اوران کے قائم کردہ اداروں کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کارروائیوں اور متعلقہ دستاویزوں سے مدد لی گئی ہے۔اس کے علاوہ سرسید کے معاصر اردو اور انگریزی اخباروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔''[۳۱]

''پس منظر۔دوسید احمد'' کے زیرِ عنوان سید احمد شہید اور سید احمد خاں کی کی شخصیت کے اختلافی نوعیت کے پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔سید احمد شہید میدانِ جہاد کے شہ سوار تھے جب کہ سرسید احمد خاں تعلیمی میدان کے مردِ میدان۔یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک کے سیاسی کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے کی پہلی کوشش بھی سرسید ہی نے کی۔ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید نے سید احمد شہید کی تحریک کا دائرہ مذہبی، اصلاحی اور سکھ دشمنی تک محدود کر دیا۔

''سید احمد خاں۔قدامت پرستی کا دور'' کے زیرِ عنوان سرسید کی بعض تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے جن میں، جامِ جم، جلاء القلوب بذکرالمحبوب، تحفۂ حسن، تسہیل فی جرِ ثقیل، ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار، آثار الصنادید، قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین، رسالہ راہِ سنت در ردِ بدعت، سلسلۃ الملوک، نمیقہ در بیانِ تصورِ شیخ، تصحیح آئینِ اکبری شامل ہیں۔تصحیح آئینِ اکبری پر تین تقریظیں لکھی گئی تھیں جن میں سے ایک تقریظ مرزا غالب نے لکھی تھی جسے سرسید نے اپنی قدامت پرستی کے سبب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا حالاں کہ غالب ان کے بڑے بھائی سید محمد کے دوست تھے۔

''بغاوت اور سرسید'' کے عنوان کی ذیل میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سرسید نے قولی اور عملی طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ان کا یہ اقدام انعام واکرام کی غرض سے نہیں تھا بل کہ اس کے کئی ایک محرکات تھے۔ان میں ایک محرک تو یہ تھا کہ جو مصیبت

انگریز حکام اوران کے مردوزن پر پڑی، اسے وہ انسانیت سے بعید سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ انھوں نے انگریزوں کا ساتھ اس لیے دیا تھا کہ وہ یقین رکھتے تھے کہ انگریز فاتح رہیں گے۔

''سرسید تحریک کا آغاز'' کے عنوان کے تحت سرسید کی تخلیقات، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، لائل محمڈنز آف انڈیا اور تبیین الکلام کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تبیین الکلام کی اشاعت پر سرسید کے دوست سید مہدی علی (محسن الملک) جیسے رفیق نے سرسید کو ''چھپا پادری'' کہا اور ساتھ ہی سرسید پر کفر کا فتویٰ بھی دے دیا۔

''مسلمانوں کے باب میں حکومت کی پالیسی میں تبدیلی اور اس کے اسباب'' زیرِ عنوان مؤلف نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں کی پس ماندگی کو دیکھتے ہوئے جو مراعات مسلمانوں کو دی تھیں وہ ایک خوش آئند بات تھی۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی کا جو نظریہ ہنٹر نے پیش کیا تھا اس کو اپنا کر سرسید کے ساتھ ساتھ ان کے جانشینوں نے بھی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے دھاروں کے رخ موڑنے کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا اور پاکستان کا مطالبہ اور اس کے قیام کے پیچھے بھی ہنٹر کا یہی نظریہ کارفرما تھا۔

''اُن قدح بشکست وآں ساقی نماند'' کے عنوان کی ذیل میں سرسید کی تجہیز وتکفین کی عبرت ناک داستان کے حوالے سے بعض نمونے تحریر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ سرسید نے ساری زندگی اپنے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دی۔

> ''سرسید کی تجہیز وتکفین کی عبرت ناک داستان کے یہ اجزا اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ اس سے ان کی سیرت کے ایک اہم اور روشن پہلو کی نشان دہی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ سرسید نے زندگی میں اپنے لیے کچھ نہیں کیا۔ ان کے ہر اقدام میں خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ رہا ہو، ذاتی مفاد کا پہلو مضمر نہ

ہوتا تھا۔انھوں نے لاکھوں روپے خود پیدا کیے اور اس سے کہیں زیادہ کالج کے بیے اور دوسرے قومی کاموں کے لیے چندے کی صورت میں جمع کیے لیکن جب اس دنیا کو خیر باد کہا تو ان کا کیسہ خالی تھا۔ تجہیز و تکفین بھی ''آخری چندے'' سے ہوئی۔''۳۲

مصنف نے سر سید کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات پر بھی بحث کی ہے لیکن زیادہ تر سر سید کے سیاسی افکار اور کاوشوں کو سراہا ہے۔ کتاب کا اسلوب نہایت عمدہ ہے۔ زبان و بیان سلیس، سادہ اور رواں ہے۔

سر سید احمد خاں اور فکرِ نو (۲۰۱۷ء) از ڈاکٹر سعادت سعید

سر سید حمد خان اور فکرِ نو کے مؤلف ڈاکٹر سعادت سعید ہیں جسے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۔کلب روڈ، لاہور نے ۲۰۱۷ء کو شائع کیا۔ یہ تالیف ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تالیف سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے اس کا انتساب، آخری مغل تاجدار، شاعرِ بے بدل، مظلوم بہادر شاہ ظفر کے نام کیا ہے۔ فہرست میں، باب اول: نقطہ نظر، باب دوم: فکرِ نو کے قافلہ سالار، باب سوم: سنگین صورت حال اور ہمارے ادیب، باب چہارم: علمی اجتہاد، باب پنجم: روشن خیالی کی جانب سفر، باب ششم: فکرِ نو سے موانست اور باب ہفتم: ماحصل، شامل ہیں۔

مؤلف نے ''باب اول: نقطہ نظر'' میں علم و عمل، موت اور فنا، تاریخی مادیت اور مادی تاریخیت کے حوالے سے بحث سمیٹتے ہوئے بیان کیا ہے:

''ان خیالات کی روشنی میں نہ سہی لیکن تاریخی حوالوں کو درست رکھنے کے لیے علم، مذہب اور تہذیب و تمدن کو تمام معلوم انسانی دور سے متعلق جاننے ہی میں عافیت ہے کہ تجرباتی علوم کے اس کے دور کے سائنس دان کائناتی قوت کے منکر نظر نہیں آتے تو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت میں

آتا ہے کہ انسانی فکر کے معلوم ادوار میں مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی فکر، راسخ فکر کی بنیاد پر انسانی سماجیات اور اخلاقیات کے سلسلہ در سلسلہ معاملات وجود میں آئے۔ یوں انسان استقرائیت سے استخراجیت اور استخراجیت سے استقرائیت کی انتہاؤں کے درمیان ایک پنڈولم کی طرح گردش کرتا ہے۔ اسی پس منظر میں انسان کے علمی تضادات، مذہبی نزعات اور تمدنی جدلیات کو دیکھنا چاہیے۔۳۴

مؤلف نے ''باب دوم: فکرِ نو کے قافلے کا سالار'' کے عنوان کے تحت سر سید احمد خاں کی تین حیثیتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سر سید (۱) بطور مسلم مفکر (مذہب)، (۲) بطور علمی و سائنسی سکالر (سائنس) اور (۳) بطور قومی و ملی رہنما (سوشیالوجی) شامل ہیں۔ اگر ہم سر سید کے ان نظریات کی طرف رجوع کریں جن کا مقصد اپنے اردگرد کے انسانوں کی درست سمت رہنمائی کرنا تھا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سر سید نے لارڈ میکالے کی دی ہوئی تعلیمی پالیسی کی نزاکتوں کو سمجھ کر اپنا لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ میکالے کی پالیسی کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستانی ذہنوں کو ایسی تشکیک کا نشانہ بنایا جائے جس کے نتیجے میں وہ اپنے اپنے مسالک و مذاہب پر حرف زنی کریں اور یوں اس عمل میں پیدا ہونے والے اس نئے فکری خلا کو فاتحین کے مذہب و مسالک سے پُر کرنے کی کوششیں کی جائیں۔ سر سید احمد خاں نے اپنی دانش وری کے مختلف سلاسل کو اپنے عقلی تصورات کی مدد سے فروغ بخشا اور تین محاذوں یعنی (۱) برطانوی سیاسی یلغار کا محاذ (۲) سائنس اور مذہب کا محاذ اور (۳) مسلمانوں کی عزتِ نفس کی بحالی کا محاذ، پر مسلمانانِ ہند کا دفاع کیا۔

مؤلف نے ''باب سوم: سنگین صورت حال اور ہمارے ادیب'' کے عنوان کی ذیل میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اہلِ ہند خصوصاً مسلمانانِ ہند مظالم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دہلی سے امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی نہ رہا۔ اس شہر پر پانچ لشکر پے در پے حملہ

آور ہوئے جن میں پہلا باغیوں لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس، مکان دمکین د آسمان زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے اور پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب وطاقت نہ پائی۔ جنگِ آزادی میں شکست کے بعد قوم کا انا اور وقار کا ڈھنڈورا پیٹنا بے وقت کی راگنی تھی۔ ایسے میں دو ادیب اور شاعر روزی روٹی کے لیے پاپڑ بیلتے رہے اگر سکہ کہنے کا الزام ثابت ہو جاتا تو غالب دلی کے کسی مقتل میں سولی پر لٹکا دیے جاتے اور اگر محمد حسین آزاد انگریزوں کی اطاعت نہ کرتے تو ''دہلی اردو اخبار'' میں اپنے والد کی اعانت اور بہادر شاہ ظفر کے دربار سے تعلق کی بنا پر موت کے منہ میں چلے جاتے۔

''باب چہارم: علمی اجتہاد'' کے زیرِ عنوان مؤلف نے سرسید کے علمی اجتہاد کی بنیاد اور پھر اس علمی اجتہاد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کی مسلسل مساعی قابلِ تعریف ہیں۔ جب سرسید ''آئین اکبری کی تصحیح'' کا کام کر چکے تو غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی۔ تقریظ میں غالب نے سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ کہنگی کے خریدار بننے کی بجائے انگلستان جا کر انگریزوں کے علمی اور سائنسی کارناموں اور ان کی جدید مادی ترقیوں کا جائزہ لیں۔ غالب کا یہ مشورہ سرسید کو پسند نہ آیا اور تقریظ بھی اچھی نہ لگی، اس لیے اسے شاملِ کتاب نہ کیا۔ لیکن بعد میں انھوں نے قوم کے لیے انگریزی آئین اور طور طریقوں کو مفید پایا اور جدید سائنسی علوم کے حصول پر زور دیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے وسیلے سے سرسید اپنی قوم کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ انگریزی تعلیم و تربیت مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے نہیں بل کہ اس کا حصول جدید تعلیم کے دروازے کھولنے کا موجب ہے۔

س ضمن میں مؤلف سرسید کے ایک مضمون کا حوالہ دینے کے بعد رقم طراز ہیں:

''اس مضمون میں سرسید احمد خاں نے انگلستان کے حالات قلم بند کرتے

ہوئے وہاں کی جدید ترقیوں کو موضوع بنایا ہے اور اسے دنیا کا امیر ترین ملک قرار دیا ہے۔ اس میں انگلستان کی رعیہ کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے منفی حالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس مضمون کی اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اس امر کا برملا اظہار کیا ہے کہ آج جو انگریز اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں وہ اپنے آپ اس مقام تک نہیں آئے ان کے آباؤ اجداد نے قرطبہ اور بغداد یونیورسٹیوں سے علوم وفنون کی تربیت پا کر اپنے آپ کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ دنیا پر حکمرانی کر سکیں۔"[۳۴]

"باب پنجم: روشن خیالی کی جانب سفر" کے عنوان کے تحت مؤلف نے سقوطِ دہلی کا پس منظر بیان کرنے کے بعد سر سید کی ان کاوشات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت کے اندھیروں اور تعصب کی تاریکیوں سے نکال کر کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنے اور اپنی آنکھوں پر بندھی تعصب کی پٹیاں اتار کر علم و عمل کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے کیں۔

سر سید کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کی مختلف جہات کے حوالے سے کام ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں تین رویے سامنے آتے ہیں:

۱۔ سر سید انگریز دوست تھے اور انھوں نے ان کی پالیسیوں کے فروغ کے لیے کام کیا۔

۲۔ انھوں نے شکست خوردہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑا کیا۔

۳۔ وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین پل کا کام کرتے رہے ہیں۔

یہ تینوں حوالے درست تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ "اسباب بغاوت ہند" اور "تاریخ سرکشی بجنور" جیسی تحریریں ان کے انگریز دوست ہونے کا ثبوت ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی دانش کو ان کے سامنے نئے علمی زاویوں سے پیش کر کے انھوں نے ان کی فکری کم مائیگی کو دور کرنے کی کوششیں کیں۔ مسلمانوں کو ہندوستان کی

سرکاری مین سٹریم میں دوبارہ لانے کے لیے انھوں نے انگریز حکمرانوں کے سامنے ان کا مقدمہ انتہائی خوش اسلوبی سے یوں لڑا کہ مسلمانوں پر ان کا اعتبار قائم ہوا۔ جب سر سید کو یقین ہو گیا کہ انگریز اور ہندو مل کر مسلمانوں کو ایک طرف اور نظر انداز کرنا چاہ رہے ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کے لیے آواز بلند کی۔ اگر اس وقت سر سید مسلمانوں کو انگریز اور ہندو اتحاد کی صورت حال سے باخبر نہ کرتے تو تو شاید مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔

مؤلف نے سر سید کے ضمن میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''سر سید احمد خان برصغیر پاک وہند میں روشن خیالی کے کارواں کے میر و سالار ہیں۔ انھوں نے مسلم تاریخ میں موجود فکر و عمل کی قوتوں کا جائزہ لے کر جس نظریہ سازی کو بنیادی اہمیت دی اس کی بدولت صدیوں سے موجود توہمات اور غیر سائنسی تصورات کی جھیلوں میں نئے دائرے اور نقوش بننے شروع ہوئے۔ ان کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی نے مسلمانان پاک و ہند کے روایتی تصورات کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ کہنے کو تو سو فسطائیوں سے لے کر معتزلائیوں تک روشن خیالی کے کئی سلسلے موجود تھے۔ بعد ازاں عہد جدید میں یورپی نشاۃ الثانیہ نے انسانی فکر و خیال کے زاویوں میں تبدیلی کے لیے معرکتہ الآرا کارنامے سرانجام دیے۔''[۲۵]

مؤلف نے ''باب ششم: فکرِ نو سے موانست'' کے عنوان کی ذیل میں بیان کیا ہے کہ سر سید نے انیسویں صدی کے آخر میں اپنی دینی، سماجی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی، علمی اور ادبی کتب کے وسیلے سے برصغیر پاک وہند میں موجود انجمادی فکر کو نیا ویژن دیا اور نت نئی جہات دکھانے کے لیے اپنی تمام تر فکری و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ وہ مارکسی تحریک سے وابستہ یا متاثر نہ ہونے کے باوجود انھوں نے جس روشن خیالی کو متعارف کرایا اس سے بعد میں سائنسی فکر نے نیا انداز اختیار کر لیا۔ سر سید کی حیات کو ''حیتِ جاوید'' کا نام دینے کا سبب بھی یہی تھا۔ ان کی حیات جاودانی

عظمت کی علامت رہے گی۔ سرسید نے اپنی تقاریر، مقالات، مضامین اور متنوع موضوعات پر لکھی گئی کتب اس امر کی عملی تعبیر پیش کرتی ہیں۔

اس ضمن میں مؤلف تحریر کرتے ہیں:

''سرسید احمد خان کی قومی خدمات کو جوہر یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں اور عملی کاموں کی مدد سے کمال خوش اسلوبی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے دور ادبار سے نکالنے کی مساعی کیں۔ ان کا رسالہ ''درابطال غلامی'' اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حق آزادی اور حق رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر آنے والے مشکل حالات کے تناظر میں لائحہ عمل تجویز کرنے کے حق میں تھے۔ ان کی انگریز دوستی کا تقیہ کہہ لیں یا دروغ مصلحت آمیز ایک پہلو کہ انھوں نے بہ ہر رنگ قومی خدمت کے شعار کا علم بلند رکھا۔ اگر انھوں نے انگریزی نظام حکومت کو قبول کیا تو یہ ان کی دانش مندی تھی کہ اس رہ سے ہو کر مسلمانوں کے لیے سماجی حقوق، تعلیمی مراعات اور ملازمتوں کی تحصیل کے مواقع پیدا کروا سکے۔ مزید برآں ان کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کے عظیم رفقا نے اپنی علمی کاوشوں کے وسیلے سے مسلمانانِ ہند کے لیے ایسے ماحول کی بنیادیں استوار کیں جس میں ان کے لیے انگریزوں کے سنگی ساتھی مقامی برہمنوں سے ہر میدان میں مقابلہ کرنا آسان ہو گیا۔ اگر سرسید اور ان کے رفقائے کار کی یہ مساعی نہ ہوتیں تو علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کو بھی وہ ماحول میسر نہ آتا کہ جس کے دائرہ کار میں رہ کر مسلمانانِ ہند کی آزادی کے خواب دیکھ پائے۔''[۳۶]

باب ہفتم اس تالیف کے ''حصل'' پر مشتمل ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیفات و تالیفات شاملِ کتاب کی ہیں۔ اس کتاب میں مصنف کا اسلوب بہت عمدہ ہے۔ ان کا معروضی انداز میں حقائق کو من و عن

بیان کرنا اور اپنی رائے بھی پیش کرنا معاصر سرسید شناسوں میں بڑا انفرادیت رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب مدلل انداز میں لکھی گئی ہے۔

افکار سیاسی کی تشکیل جدید، سید احمد خاں اور اقبال (۲۰۱۷ء) از ڈاکٹر معین الدین عقیل

سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ تقریبات کی مناسبت سے افکار سیاسی کی تشکیل جدید، سید احمد خان اور اقبال ڈاکٹر معین لدین عقیل کی تایف ہے جسے مکتبہ تعمیر انسانیت، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے ۲۰۱۷ء کو شائع کیا۔ یہ تالیف ترانوے (۹۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے سویامانے سے منسوب کیا گیا ہے۔

یہ تالیف بارہ حصوں پر مشتمل ہے۔ فہرست موضوعات میں، معروضہ، سید احمد خاں اور اقبال: نوآبادیاتی عہد کے نمائندہ مسلمان مفکرین، جنوبی ایشیا کی نوآبادیاتی سیاست میں سید احمد خان کا زاویہ نظر، ہندوستانی مسلمان اور سیاست، جنوبی ایشیا کی نوآبادیاتی سیاست میں اقبال کا زاویہ نظر، ہندوستان میں آزاد اسلامی مملکت کا قیام، اسلام اور قومیت، ہندوستانی قوموں کا اتحاد، ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان، مسلمانوں کا مطالبہ، خاتمہ سخن، ماحصل، حواشی وتعلیقات، فہرستِ اسنادِ محولہ، اشاریہ، شامل ہیں۔

پہلے حصے ''سید احمد خاں اور اقبال: نوآبادیاتی عہد کے نمائندہ مسلمان مفکرین'' کے عنوان کی ذیل میں مؤلف نے مغلیہ عہد سلطنت میں بھگتی تحریک کے زیر اثر مسلمان اور ہندو دو قوموں کے تہذیبی اور ثقافتی اختلاط اور میل ملاپ کی کیفیات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ کس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہوار منانے لگے۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر جسے مغلِ اعظم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کہ دینِ الٰہی نے اس تہذیبی اختلاط کی راہیں مزید ہموار کر دیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس عہد کے صوفیا نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو مافوق الفطرت خیال کرنا شروع

کردیا۔ اکبر کے اس خام خیال دینِ الٰہی نے جب مسلمانوں کے بنیادی عقائد تک کو مجروح کرنا اور نقصان پہنچانا شروع کیا تو ان مایوس کن حالات میں کچھ راسخ العقیدہ علما نے اکبر کی مخالفت کی لیکن وہ اس مخالفت کو دبانے میں کامیاب ہوگیا۔ اکبر کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی نے ''تحریک احیے دین'' شروع کی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل سے روکنا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے داراشکوہ کے برعکس مجدد الف ثانی کی روش اختیار کی اور مسلمانوں کو ان کا تشخص بحال کرنے اور واپس دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کا سانحہ نمودار ہو گیا۔ ایسے میں شاہ ولی اللہ نے قوم کی ڈوبتی نیا کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ان کی تحرک کو ان کے بعد شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل اور سید احمد بریلوی نے جاری رکھا۔ نوآبادیاتی دور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا کا دور تھا۔ ایسے میں سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کا بیڑہ اٹھایا۔ مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے حقیقی مقاصد کو سمجھا اور مسلمانوں کو ایک واضح نصب العین دینے کے لیے مساعی کیں۔ ان کے ان تصورات نے ہندوستان میں مسلم سیاست کے ارتقائی دور میں اپنے وقت پر مطالبہ پاکستان کی بنیادیں استوار کیں:

۱۔ ہندوستان ایک ملک نہیں بر اعظم ہے۔

۲۔ ہندو اور مسلمان ایک نہیں، دو علاحدہ علاحدہ قومیں ہیں۔

۳۔ ان دونوں قوموں میں علیحدگی بہر حال لازمی ہے۔[۳۲]

قبال نے سرسید احمد خاں کی تحریک اور جدوجہد کے دور میں آنکھ کھولی۔ اقبال نے شاعری اس وقت شروع کی جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان اب کبھی بھی عروج حاصل نہیں کر سکیں گے لیکن اقبال کی صورت میں انھیں ایک مسیحا مل گیا جس کے تصورات سرسید احمد خاں کے تصورات سے تال میل رکھتے تھے۔

اس ضمن میں مؤلف تحریر کرتے ہیں:

''سر سید احمد خان کے بعد مقاصد اور فکر و عمل کے تعلق سے اقبال میں سید احمد خان سے بڑی حد تک مشابہت تھی۔ اقبال سید احمد خان کے بعد پہلے مفکر ہیں جنھوں نے ہندوستانی مسمانوں کے صدیوں سے تقلید اور جمود ورفر سودات میں جکڑے ہوئے اذہان کو آزاد کرنے اور ان میں حرکت و عمل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز میں مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اسلام عقیدہ و عمل کے ایسے اصولوں پر مشتمل ہے جو ہر عہد کے مسائل میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں، بہ شرط یہ کہ ان کی حقیقت اور ماہیت کو اچھی طرح سمجھ کر اور زمانے کے حالات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر نھیں زندگی پر منطبق کیا جائے۔ یہی عمل اسلامی شریعت کی اصطلاح میں جتہاد ہے، جس کی ضرورت پر سید احمد خان اور اقبال دونوں نے زرو دیا۔''[۳۷]

دو قومی نظریہ کے حوالے سے مؤلف نے ایک اقتباس کا حوالہ دیا ہے جس میں اقبال نے سر سید احمد خاں کی توصیف کی ہے اور بعد ازاں مؤلف نے اقبال کے دو قومی نظریے کر بھی سراہا ہے:

''ایک اور جگہ انھوں نے تقریباً اسی بات کو دہرایا ہے کہ ''...میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔'' چناں چہ یہی حساس تھا جس نے اقبال کو ایک تو وطنی قومیت کے نظریے کی تردید پر مجبور کیا، انھیں دنیائے اسلام کے ناقابل تقسیم ہونے کے خیال سے سرشار کیا اور دوسرے انھیں کم از کم برعظیم کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل یک آزاد اسلامی مملکت کے ایک واضح تصور کی تشکیل کا حصہ دار بنایا۔ اس

ضمن میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء
میں ان کا پیش کردہ خطبہ صدارت، آل انڈیا نیشنل کانگریس' کے قیام کے
جواب میں سید احمد خاں کے مذکورہ بیانات (ایک ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء
کو لکھنؤ میں، اور دوسرا ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء میرٹھ میں) کا فی الحقیقت تکملہ ہے
دراصل اقبال کے تصور میں اپنی تمام فلسفیانہ گہرائیوں کے ساتھ
دیکھا جا سکتا ہے۔''۳۸

س حصے ''جنوبی ایشیا کی نوآبادیاتی سیاست میں سید احمد خان کا زاویہ نظر'' کے
عنوان کی ذیل میں مؤلف نے سرسید احمد خاں کی قومی خدمات کی تین جہات متعین کی
ہیں۔ انھیں دو قومی نظریے کا بانی کہا ہے۔ اس غرض سے مؤلف نے ان کے ایک جملے
کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''ہندوستان ایسی حور شمائل دلھن کی صورت
ہے جس کی ہندو اور مسلمان دو آنکھیں ہیں۔''

ذیل کے ایک اقتباس میں مؤلف نے سرسید کے زاویہ نظر کی وضاحت کر دی ہے:

''سرسید احمد خاں کے کاموں کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا
ہے۔ ایک وہ کام جو بہ حیثیت مصنف انھوں نے تاریخ، مذہب، معاشرت
ور ادب کے موضوعات پر تصنیف و تالیف کے ذریعے انجام دیے۔
دوسرے وہ کام جو بہ حیثیت مصلح انھوں نے مذہبی اور معاشرتی اصلاح اور
تعلیمی ترقی کے لیے کیے، اور تیسرے وہ کام جو انھوں نے سیاسی اور قومی سطح
پر مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے انجام دیے۔''۳۹

س حصے ''ہندوستانی مسلمان اور سیاست'' میں مؤلف نے ہندوستان کے
مسلمانوں کو مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ہر معاملے میں آزادانہ اور خود مختارانہ فیصلوں
کے قابل بننے کی تلقین کی ہے اور راہیں بھی سجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ
ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں دونوں قوموں کا ایک ہی گدی پر بیٹھنا ناممکن خیال
کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ قومی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دکھائی دیتے

ہیں۔خاص طور پر بنگال کے حوالے سے انھوں نے کانگریس کی پالیسیوں کی مخالفت کی ہے اور کانگریسی تجاویز کو بداندیشی پر محمول کیا ہے:

''بنگال کی نسبت جہاں تک کہ مجھ کو معلوم ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ لوور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کا حصہ بہ نسبت بنگالیوں کے بہت زیادہ ہے۔اگر کل بنگال کو ملالو تو قریباً نصف مسلمانوں اور نصف سے زائد کچھ بنگالی ہوں گے۔وہاں کے مسلمانوں کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ 'نیشنل کانگریس' کیا چیز ہے اور اس میں کیا ہوتا ہے۔بنگالی جو مفصل میں رہتے ہیں، وہ ابھی ایسے ہی ناواقف ہیں جیسے عموماً مسلمان بنگالے کے رہنے والے۔بنگالے میں مسلمانوں کی آبادی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان بنگالیوں کی، کانگریس کا غل غپاڑہ مچا رہے ہیں، خواہشیں پوری ہو جاویں تو نہایت مشکل ہے کہ بنگالے ہی میں بنگالی امن سے رہ سکیں۔یہ تجویزیں کانگریس کی ایسے ملک کے لیے، جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں، ایک کنویں سے پانی پیتی ہیں، ایک شہر کی ہوا کھاتی ہیں، ایک کی زندگی دوسری پر منحصر ہے، نہایت بداندیشی کی تجویزیں ہیں۔ایک دوسرے میں عداوت پیدا کر دینا، نہ امن کے لیے مفید ہے۔نہ ملک کے لیے، نہ شہر کے لیے۔''[۱۴]

اس حصے ''جنوبی ایشیا کی نوآبادیاتی سیاست میں اقبال کا زاویہ نظر'' کے عنوان کے تحت مؤلف بیان کرتا ہے کہ اصناف ادب میں شاعری کی صنف ایسی ہے جو اپنی تاثیر کے باعث اپنا ثانی نہیں رکھتی۔یہ اپنے اندر قوموں کو بدلنے کی خاصیت رکھتی ہے۔اس ضمن میں اقبالؒ کی مثال دی جا سکتی ہے۔انھوں نے اس عہد میں جنم لیا جو مسلمانوں کے سخت آزمائش کا تھا۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال شاعری ترک کرنے لگے تھے لیکن ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ نے انھیں شاعری ترک کرنے کی بجائے شاعری میں راستہ بدلنے کا مشورہ دیا۔اس کے بعد جو اقبال سامنے آیا اس نے ایشیا کے مسلمانوں کو ایسا متاثر کیا کہ ''شاعرِ مشرق'' کہلائے جانے لگے۔انھوں نے

شاعری اور نثر دونوں میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے پیغام دیا جسے غور سے سنا گیا۔

اس ضمن میں مؤلف کا خیال ہے:

> ''تاریخ میں بہت کمال کے شاعر گزرے ہیں، جنھوں نے اپنی قوم پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو جتنا اقبال نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں پر ڈالا۔ وہ بیسویں صدی میں ملت اسلامیہ کے ذہن کی تعمیر کرنے والوں میں اولیت رکھتے ہیں اور انھوں نے اس کی بیداری میں سب سے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اسلامی فکر کو جدید تقاضوں کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھالنے اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحانات کو تبدیل کرنے میں بھی ان کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ نھوں نے مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیا تھا اور ان سباب کے مطابق انھوں نے اسلام کے حرکی اور انقلابی پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا۔ اپنے مقصد کے تحت انھوں نے ایک تو اسلامی فکر کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور اسلامی قومیت کے حقیقی تصور کو نمایاں کیا او ردوسرے مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے زیر اثر رونما ہونے والی مختلف تحریکوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور قوم کو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات کو اختیار کرنے کی تلقین کی اور اس کے جذبہ عمل کو بیدار کیا۔''[۱۲]

قبال نے عالم اسلام کے ابتلا ورانتشار کے عہد میں مسلمانوں میں بے بسی اور بے چارگی کے عنصر کو غالب جانتے تھے۔ اس کے پس منظر میں مسلمانوں کے خلاف مغربی طاقتوں کی جارحیت اور اسلام دشمنی کارفرما دکھائی دی۔ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپی معاشرے میں تعلیمی غرض سے قیام کیا جہاں ان کے مشاہدات نے ان کی فکر ونظر میں وسعت پیدا کی۔ ان کے خیال میں اہل مغرب مسلمانوں میں انتشار کا باعث تھے اور وہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کو متحد نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے خیال میں دنیا میں صرف دو قومیں آباد ہیں۔ ایک مسلمان اور دوسری غیر مسلم۔ ملت

اسلامیہ زبان اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔ دنیائے اسلام ناقابلِ تقسیم ہے اور اسے ترکوں، عربوں، ایرانیوں اور افغانیوں میں تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان قوم زوال پذیر، مایوس اور محکوم قوم بن چکی تھی۔ اس میں تحریک پیدا کرنے اور جدوجہد پر ابھارنے کے لیے فکری غذا کے ساتھ ساتھ جذباتی توانائی کی ضرورت تھی کیوں کہ جذبات میں ہیجان پیدا کر کے اس جمود کو توڑا جا سکتا تھا جو ملت پر طاری تھا۔ اقبال نے اس مقصد کے حصول کے لیے نظم ونثر دونوں ذرائع کو استعمال کیا۔

سیاسی سطح پر مسلمانانِ ہند کے لیے جداگانہ انتخاب کے طریق کار کو ضروری سمجھتے تھے اور ہمیشہ اس کے حامی رہے کیوں کہ اس طرح وہ اپنے سیاسی اور قومی حقوق کے تحفظ اور ترقی کے لیے اپنے نمائندے منتخب کر سکتے تھے اور یہ سب مسلمانوں کی قومی حیت اور ترقی کے لیے ضروری تھا۔ اقبال نے ''نہرو رپورٹ'' کی سخت مخالفت کی کیوں کہ اس میں مسلمانوں کے حقوق کے دیرینہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ''کل جماعتی مسلم کانفرنس'' میں شرکت اور مسمانوں کے مطالبات کی ترتیب فکرِ اقبال کے ایک نئے دور کا آغاز تھا جو بعد میں دو قومی نظریے کی اساس بنا اور ۱۹۳۰ء کی خطبہ الہ آباد میں اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ، آزاد اور خود مختار مملکت کا مطالبہ کر دیا۔ کانگریس کی جانب سے سائمن کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم نہ کرکے اور پھر گول میز کانفرنس میں شرکت نہ کر کے اپنی ہٹ دھرمی کا جو ثبوت پیش کیا اس نے انگریز حکومت کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور اقبال کا ایک علاحدہ مملکت کا ایک جامع تصور مقبولیت اور اہمیت اختیار کر گیا۔ اس ضمن میں اقبال کا یہ خطبہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

س حصے ''ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام'' کے زیرِ عنوان، اسلام اور قومیت، ہندوستانی قوموں کا اتحاد، مسمانوں کا مطالبہ، خاتمہ سخن جسے ذیلی موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ''اسلام اور قومیت'' کے عنوان کے تحت اسلامی نظریہ قومیت کو دیگر قومی نظریات پر ترجیح دی گئی ہے کیوں کہ قومیت کے حوالے سے اسلام کسی جغرافیائی حد بندی کا قائل نہیں کیوں کہ اس کے مطابق دنیا کے کسی بھی کونے

میں بسنے والا مسلمان ملت اسلامیہ کا فرد ہے، جب کہ دیگر نظریات کے تحت رنگ، نسل اور جغرافیائی تقسیم کسی ملک کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔

"ماحصل" کے زیرِ عنوان مؤلف نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے جتنے بھی تصورات تھے ان میں سے زیادہ تر اور خاص طور پر اقبال کا دوقومی نظریہ، سید جمال الدین افغانی اور سر سید احمد خاں کا مرہونِ منت ہے:

> "خطبہ الہ آباد میں موجزن احساسات ہی تھے جنھوں نے اقبال کو ایک تو وطنی قومیت کی تردید پر مجبور کیا تھا، ان میں دنیاے اسلام کے ناقابلِ تقسیم ہونے کا خیال پیدا کیا تھا، اور انھیں کم از کم برعظیم کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اسلامی مملکت کے ایک واضح تصور کی تشکیل کا حصہ دار بنایا۔ اس ضمن میں ان کا یہ خطبہ، اگر ایک وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو ۔۔۔۔۔کانگرس کے قیام کے جواب میں سید احمد خاں کے مذکورہ بیانات اور مشمولہ خطبے کا فی الحقیقت تکملہ ہے جسے اقبال کے فکری زاویے سے ایک منطقی استدلال کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ دنیائے اسلام میں سید احمد خاں اور ایک حد تک سید جمال الدین افغانی کے بعد اقبال ہی کی شخصیت ہے، جس نے احیاے اسلام کے لیے نہ صرف ایک مربوط اور ٹھوس فکر کی تشکیل میں حصہ لیا، بل کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے تناظر میں، دراصل عالم اسلام کی آزادی، خودمختاری اور بہتر مستقبل کی تعمیر کا واضح اور مؤثر پیغام بھی دیا جو ان کی شاعری میں زیادہ پُر کیف و پُر کشش پیرائے میں عوام کے دلوں میں گھر کرنے کا سبب بنا۔" ۴۲

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف کی تالیف کے مندرجات بعض موضوعات کی تکرار کے باوجود بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں انھوں نے اپنے بیانات کو استدلال کی مدد سے پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا اسلوب بھی پُر تاثیر ہے۔

تحریکِ آزادی کے روحِ رواں: سر سید احمد خاں (۲۰۱۷ء)

از ڈاکٹر محمد افضل حمید

ڈاکٹر محمد افضل حمید کی تالیف تحریکِ آزادی کے روحِ رواں: سر سید احمد خاں، سر سید احمد خاں کی دو صد سالہ یومِ ولادت کی تقریبات کے سلسلے میں ۲۰۱۷ء کو شمع بکس ریگل روڈ، فیصل آباد سے شائع ہوئی۔ یہ تالیف ۱۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب کے بعد فہرست میں حرفِ آغاز (ڈاکٹر محمد افضل حمید)، ڈاکٹر محمد افضل حمید کا تصنیفی شعور (ابوسفیان اصلاحی)، علمی دستاویز (شائستہ مشتاق)، حقیقت کشا تاریخی دستاویز (نسیم خان سیما، جنگِ آزادی کا سیاسی پس منظر، علی گڑھ تحریک، علی گڑھ تحریک اور سیاسیاتِ برصغیر اور مآخذ کے عنوانات شامل ہیں۔

مؤلف ''حرفِ آغاز'' میں اس کتاب کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے پاکستانیوں کی کم نظری پر افسوس کیا کہ انھوں نے سر سید کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے وژن سے مدد لینے کی بجائے فروعی معاملات میں الجھ کر ان کی شخصیت کو متنازعہ بنا ڈالا ہے۔ راقم کو ذاتی طور پر اندازہ ہے ہماری قوم کے محسن کش طبقے جنھوں نے حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ، علامہ محمد اقبالؒ سے لے کر ڈاکٹر عبدالقدیر اور ڈاکٹر عبدالسلام جیسے محسنین کو بھلا ڈالا، بھلا سر سید احمد خاں کو کیوں کہ ہادی ماننے لگے۔''[۳۴۳]

مؤلف نے ''جنگِ آزادی کا سیاسی پس منظر کے عنوان کے تحت ''مغلیہ سلطنت کا زوال، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، بساطِ ہند پر انگریزوں کی چالیں، نوابِ اودھ کے لیے شاہ کا خطاب اور سید احمد رائے بریلی اور تحریکِ جہاد'' کے ذیلی عنوانات شامل کیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے درس و تدریس کو چھوڑ کر جن موضوعات پر کتب تحریر کیں ان

میں تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ، کلام اور منطق وغیرہ شامل ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے بعض ہندوانہ رسوم کو قبیح سمجھ کر رد کرنے کی تلقین کی:

''اصلاحِ معاشرت کے لیے انھوں نے ہندوؤں کی وہ قبیح رسوم جنھیں مسلمانوں نے قبول کرنا شروع کیا تھا، کے ردّ کرنے کی تلقین کی مثلاً بیوگان کا نکاح نہ کرنا، بڑے بڑے مہر باندھنا، خوشی غمی کے مواقع پر اسراف کرنا اور عجمی عیش وعشرت کی طرف مائل ہونا وغیرہ۔''[۴۴]

مؤلف نے ''علی گڑھ تحریک'' کے عنوان کی ذیل میں ''حیاتِ سرسید احمد خاں، ابتدائی تعلیم، ملازمت، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، قومی ہمدردی اور اصلاحِ قوم کا آغاز، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، اردو ہندی تنازع، سرسید کا سفرِ انگلستان، ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا، ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کا قیام اور علی گڑھ کالج کے مسائل'' جیسے عنوانات شامل کیے ہیں۔

۱۸۶۶ء میں بنارس کے بعض سرکردہ ہندو اس کوشش میں لگ گئے کہ تمام عدالتوں اور سرکاری دفتر میں اردو اور فارسی زبانوں کی بجائے بھاشا کو جاری کروایا جائے۔اس حوالے سے سردار پرشاد سندل اور سرسید کے درمیان خط کتابت ہوئی۔سرسید کے لیے ہندوؤں کا یہ رویہ ایک اچنبھے کی بات تھی اور ان کے دل کو ٹھیس پہنچی مگر اس وقت انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے ساتھ ساتھ چلنا محال ہے۔اپنے اس خیال کا سرسید نے برملا اظہار کیا اور مؤلف کا خیال ہے کہ سرسید کے دل میں دو قومی نظریہ کا عکس اس وقت ابھرنے لگا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نظریے نے تقویت اختیار کر لی:

''تاریخ سے ثابت ہے کہ سید احمد خاں کی پیشین گوئی غلط ثابت نہ ہوئی۔بہ ظاہر اردو ہندی قضیہ معمولی نوعیت کا واقعہ نظر آتا ہے لیکن بہ باطن سرسید کے دل میں دو قومی نظریہ کا تصور اس وقت ابھرا اور آنے والے دنوں میں

تقویت اختیار کرتا گیا۔"۳۴۵

مؤلف نے "علی گڑھ تحریک اور سیاسیاتِ برصغیر" کے عنوان کے تحت "اقوامِ مغرب کی ہندوستان میں دلچسپی، ایسٹ انڈیا کمپنی، ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی، حیدر علی اور ٹیپو سلطان"، مسلمانانِ ہند کے زوال کی وجوہات، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، جنگِ آزادی کی ناکامی کی وجوہات، ہندوستان میں مسمانوں کی ناگفتہ بہ حالت، سر سید کی دردمندی اور قومی خدمات، کانگریس اور سر سید، سر سید حمد خاں کا دوقومی نظریہ، سید جمال الدین افغانی کا تصور پان اسلام ازم، سید جمال الدین افغانی اور سر سید، عہد سر سید کی بعض دیگر تحریکیں اور ادارے اور مآخذ" جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

مؤلف کا خیال ہے کہ سر سید احمد خاں اور سید جمال ادین افغانی میں ایک قدرِ مشترک تھی اور وہ یہ کہ دونوں مسلمانوں کے خیر خواہ تھے اور ان کی نشاۃِ ثانیہ کے متمنی تھے لیکن دونوں کا نقطۂ نظر اور طریقِ کار جدا جدا تھا۔ سر سید نے انگریزی تہذیب و تمدن کے اتباع کی تحریک شروع کی جب کہ سید جمال الدین افغانی شریعتِ محمدی کو اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کرنا چاہتے تھے۔ مؤلف کے خیال میں مذکورہ دونوں شخصیات کے اختلافات کی کئی ،یک وجوہات تھیں:

> "جمال الدین افغانی، سر سید کے علم الکلام ،وران کی توجیہات و تاویلات کو غلط مانتے تھے۔ نیز افغانی، سر سید کے مذہبی خیالات و اعتقادات اور ان کی تعلیمی پالیسی کو مسلمانوں کے مستقبل کے لیے سیاسی غلامی میں اضافے کا باعث خیال کرتے تھے اور افغانی برطانیہ کے بھی سخت مخالف تھے۔ جب کہ سر سید عالمِ اسدم کے تصورِ خلافت کے خلاف تھے اور انھوں نے مسلمانانِ ہند کو پان اسلام ازم کی تحریک میں شرکت سے بھی منع کیا تھ۔ اس مخالفت کا ایک بین ثبوت یہ تھا کہ ۱۸۸۲ء میں سر سید نے مصر اور برطانیہ کی کے دوران میں برطانیہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مولوی سمیع اللہ خاں کو مصر روانہ کیا تھا، تا کہ وہ مصری جوانوں کو برطانیہ کی مخالفت کرنے سے

روک سکیں۔

۱۸۹۷ء میں یونان اور ترکی کی جنگ میں برطانیہ نے یونان کی حمایت کی تھی جس کی وجہ سے دیگر عالمِ اسلام کی طرح ہند کے مسلمان بھی برطانیہ سے ناخوش تھے لیکن سرسید اور حاجی محمد اسماعیل نے اس موقع پر بھی انگریزوں کی حمایت کی۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز، مسلمانوں کی طرف سے بدگمان ہوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے لگیں۔"۴۶؎

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مؤلف نے اپنی محبوب شخصیت سرسید احمد خاں کا کامیاب دفاع کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور اسلام میں قدامت پسندی اور رجعت پسندی کے رجحانات کو مسترد کرتے ہوئے سرسید کی انگریزوں کے ساتھ مصالحانہ مفاہمت کی تحریک کی پُرزور حمایت کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صفدر سلیمی، (س۔ن)، پاکستان کا معمارِ اول، لاہور، اشرف پریس، ص: ۱۔۲

۲۔ ایضاً ص:۴۔۶

۳۔ ایضاً ص: ۱۳۵۔۱۳۷

۴۔ ایضاً ص:۱۷۳۔۱۷۴

۵۔ ڈاکٹر قدسیہ خاتون، سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ، الہ آباد: کتابستان، ۱۹۸۱ء، ص ۸

۶۔ ایضاً ص ۱۷

۷۔ ایضاً ص ۱۳۴

۸۔ ایضاً ص ۱۶۳

۹۔ ایضاً ص ۱۶۴

۱۰۔ ڈاکٹر رفیق زکریا، (اپریل تا جون ۱۹۸۵ء)، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج: ۱۸۸۵ تا ۱۹۰۶ کے سیاسی حالات کا تجزیہ، مترجمہ: ڈاکٹر ثاقب انور، نئی دہلی، ترقیِ اردو بیورو، ص: ۱۲

۱۱۔ ایضاً ص: ۱۹۔۲۰

۱۲۔ ایضاً ص: ۵۸۔۵۹

۱۳۔ ایضاً ص: ۷۹

۱۴۔ ایضاً ص: ۸۷۔۸۸

۱۵۔ ایضاً ص: ۱۱۳۔۱۱۴

۱۶۔ ڈاکٹر نوق کریمی، (۱۹۹۰ء)، سرسید کے سیاسی افکار، لاہور، ایشیا بک سنٹر، ص: ۱۰

۱۷۔ ایضاً ص:۶۹
۱۸۔ ایضاً ص:۸۴
۱۹۔ سرسید احمد خاں، (جون ۱۹۹۴ء)، طبع دوم، مقالاتِ سرسید، مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ص:۱۲۔۱۳
۲۰۔ ایضاً ص:۱۳
۲۱۔ ایضاً ص:۲۰
۲۲۔ ایضاً ص:۲۸
۲۳۔ ایضاً ص:۲۰۷۔۲۰۶
۲۴۔ پروفیسر افتخار عالم خاں، (۲۰۱۰)، سرسید تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص:۱۔۲
۲۵۔ ایضاً ص:۲۳
۲۶۔ ایضاً ص:۴۲
۲۷۔ ایضاً ص:۷۶۔۷۷
۲۸۔ ایضاً ص:۱۴۵
۲۹۔ ایضاً ص:۲۳۶
۳۰۔ ایضاً ص:۳۰۴۔۳۰۵
۳۱۔ عتیق صدیقی، (جولائی ۲۰۱۴ء)، سرسید احمد خاں ایک مطالعہ، لاہور، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ص:۱۰
۳۲۔ ایضاً ص:۳۰۸
۳۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید، سرسید احمد خاں اور فکرِ نو، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۷ء، ص۱۶۔۱۷
۳۴۔ ایضاً، ص۶۹
۳۵۔ ایضاً، ص۸۹

۳۶۔ ایضاً، ص۱۰۹۔۱۱۰
۳۷۔ ڈاکٹر عقیل معین الدین، افکار سیاسی کی تشکیل جدید۔ سید احمد خان اور اقبالؒ، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۰۱۷ء، ص ۲۳
۳۸۔ ایضاً، ص۲۴
۳۹۔ ایضاً، ص۳۵
۴۰۔ ایضاً، ص۳۶
۴۱۔ ایضاً، ص۴۶
۴۲۔ ایضاً، ص۵۰

۴۳۔ ڈاکٹر، محمد افضل حمید، (۲۰۱۷ء) تحریکِ آزادی کے روحِ رواں: سر سیّد احمد خاں، فیصل آباد، شمع بکس، ص:۹
۴۴۔ ایضاً ص. ۲۳
۴۵۔ ایضاً ص: ۵۷
۴۶۔ ایضاً ص: ۱۲۷۔۱۲۸

متفرق موضوعات کی
حامل کتب کا تنقیدی جائزہ

کوئی شخص جو انیسویں صدی میں اسلام کی قرونِ وسطیٰ سے جدید عہد میں نام نہاد نظریاتی تبدیلی کے واقعہ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، سرسید احمد خاں کے مذہبی، سیاسی اور تعلیمی افکار کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ سرسید احمد خاں کے زمانے ہی میں بہت سے لوگ انھیں ایسے میسر آئے جو ان کے ممد و معاون بنے اور ان کے نظریات کے فروغ میں ان لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا۔ بہت سے صاحبان ایسے بھی تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں کا اس لیے ساتھ دیا کہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور دنیاوی ترقی کی بات کرتے تھے لیکن جب انھوں نے سرسید کے خیالات و نظریات کو پوری طرح سمجھا اور خصوصاً ان کے مذہب سے متعلق نظریات کو جانا تو ان سے گریز پا ہو گئے۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ابتدا ہی سے سرسید احمد خاں کے کام، ان کے طریقہ کار اور ان کے نظریات سے اختلاف کیا اور سختی سے اپنے موقف پر آخر تک قائم رہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کو تینوں طبقوں کا سامنا رہا۔ وہ بھی جنھوں نے عزت و توقیر کے اونچے با نس پر بٹھایا۔ ایک وہ ہے جنھوں نے بعض اقدامات کی تائید و حمایت کی اور بعض اقدامات کی مخالفت کی اور ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے اول تا آخر سرسید احمد کے اقدامات کی مخالفت کی اور ان کے مشن اور ان کے نظریات کو نہ صرف تسلیم نہ کیا بل کہ کھلے لفظوں میں ان کے نظریات کی مذمت بھی کی۔ یہ تینوں طبقے آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔

سرسید کے حوالے سے اظہارِ خیال کا سلسلہ ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جہاں ان کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا وہاں انھیں ان کے نظریات کی وجہ سے ہدفِ تنقید بھی بنایا گیا۔ ایک طرف حالی تھے تو دوسری طرف ''اودھ پنچ'' سے وابستہ لکھنے والے تھے۔ ایک اور رخ علامہ شبلی نعمانی بھی تھے جنھوں نے غلط مذہبی نظریات پر سر سید کی گرفت بھی کی مگر دلائل کے ساتھ سرسید کی ذات، ان کے مقاصد اور ان کے نظریات کے حوالے سے اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

انھوں نے سرسید کی شخصیت اوران کے کارناموں پرایک مفصل کتاب بھی حیاتِ جاوید کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک طرف تو سرسید احمد خاں کی شخصیت کے متعلق لکھا اور دوسری طرف ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ ناقدین نے اسی کتاب کو سرسید کی مدلل مداحی بھی قرار دیا۔ یہ وہ ناقدین تھے جو سید صاحب کے مذہبی افکار سے مخالفت رکھتے تھے۔

سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات میں انقلاب نظر آتا ہے جس کا ذکر تمام سرسید شناسوں نے اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ جہاں تک انقلاب کی بات ہے، وہ چاہے مذہبی ہو، تعلیمی یا سیاسی ہو، بہت لوگ ہیں جو دنیا کے انقلابوں کو دیکھتے ہیں اور کم ہیں جو اس پر غور کرتے ہیں، مگر بہت کم ہیں جو خود اپنے خیالات کے انقلابوں کو دیکھیں اور ان کے اسباب کو سمجھیں، سوچیں۔ اگر کوئی شخص اپنی تمام زندگی کی باتوں کو یاد کرے اور سمجھے تو جانے گا کہ ان خیلات میں ایسے عجیب عجیب انقلابات ہوئے ہیں کہ ویسے دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں ہوئے۔ اگر پہلا خیال بغیر سوچے سمجھے تقلید و اعتقاد و تمدن و معاشرت کی وجہ سے قائم ہوا تھا پھر اس طرح اور انھیں اسباب سے اس میں انقلاب ہوا ہے تو خیال ہوسکتا ہے کہ دونوں بے ہودہ اور بے بنیاد تھے اور اگر دونوں کے لیے یا دونوں میں سے کسی ایک کے لیے کوئی معقول بنا تھی تو اس کے اسباب پر غور کرنا اور اس بات کو سمجھنا کہ پہلے خیالات کس بات پر مبنی تھے۔ ور حال کے خیالات کس بات پر مبنی ہیں اور ان دونوں میں کون سی بنا زیدہ ترجیح اور زیادہ تر مستحکم ہے، انسان کے لیے نہایت مفید ہے۔ دنیا کے تمام خیالوں میں مذہبی خیال ایسا ہے جو انسان کے دل پر سب سے زیادہ اثر کرتا ہے۔ بہت کم برائیاں ایسی ہوں گی جن کا کرنے والا کبھی نہ کبھی ان کی برائی کا خیال نہ کرے۔ مگر یہ مذہبی خیال ایسا ہے کہ اس کے سبب سے انسان ہزاروں برائیاں کرتا ہے اور پھر کبھی اس کو برا نہیں سمجھتا۔ ایسے خیال میں کسی قسم کا انقلاب پیدا ہونا سب سے زیادہ توجہ کے قابل ہے۔ سرسید احمد خاں اپنے فکری اکتسابات میں مذہبی تصورات کو سب سے اہم سمجھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ اپنی مذہبی تحریروں میں بیان شدہ افکار کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اگر انھوں نے اپنے فکری ارتقا کی تفہیم کے لیے اسے اہم نہ سمجھا ہوتا تو وہ اپنی تمام مذہبی تحریروں کی تاریخ وار ترتیب کے ساتھ ایک کل کی حیثیت سے اشاعت کا خیال نہ کرتے۔ سرسید کے ناقدین نے ان کے مذہبی خیالات سے اکتفا نہیں کیا عین ممکن ہے وہ سید صاحب کی اس انقلابی سوچ کے مخالف ہوں جو سرسید کے باقی افکار کی طرح مذہبی افکار میں بھی در آئی تھی۔

سرسید احمد خاں کا اپنا دعویٰ تو یہ ہے کہ ان کے مذہبی افکار کے ارتقا کے اسباب داخلی ہیں، نیز اس ارتقا کی نہج، روایت اور اندھی تقلید کے علی الرغم، تعقلی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا فکری ارتقا محض سماجی اور تہذیبی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بجائے ان کے نزدیک اس جدوجہد کا مقصود اس ''حقیقی اسلام'' کی تنظیم نو میں حصہ لینا ہے جو مابعد کے اضافوں سے پاک، خالص اور بنیادی دین ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا فکری ارتقا محض سماجی اور تہذیبی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بجائے ان کے نزدیک اس جدوجہد کا مقصود اس 'حقیقی اسلام' کی تنظیم نو میں حصہ لینا ہے جو مابعد کے اضافوں سے پاک، خالص اور بنیادی دین ہے۔

سرسید احمد خاں ۱۸۵۰ء کے بعد ۱۸۵۷ء میں بغاوت ہند اور اس کے اندوہ ناک واقعات کے بعد ہی خاص دینیات کے میدان میں آئے، یعنی انھوں نے دینی عقائد، تجربے اور عمل کی خاص تعقلی تعبیر کا کام شروع کیا اور اس وقت انھوں نے اپنے لیے یہ مقصد مقرر کیا کہ وہ نئے علم کلام یا دوسرے الفاظ میں نئی مسلم تشریحی دینیات کی تشکیل میں حصہ لیں۔ سرسید کے علم الکلام کے حوالے سے بھی مذکورہ بالا تین طبقات نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی سوچ کے مطابق سرسید کے علم وکلام کو تنقید کے ترازو میں تولتے ہیں۔

حالاں کہ ہندوستان میں مسلم مذہبی اعمال کی تطہیر کے متعلق ان کا اضطراب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ان کی جوانی میں ہی نمایاں ہونے لگا تھا۔ انیسویں صدی کی چوتھی یا غالباً تیسری دہائی کے اختتام سے ہی انھوں نے اپنے بھائی کے جاری کردہ سید

الاخبار میں ایسے مضامین لکھنا شروع کیے جن کا مقصد مذہبی اصلاح تھا۔ اس وقت تک 'یورپ میں انیسویں صدی کا تعقلی نقطۂ نظر' عام ہوا تھا اور نہ ہی مسلمانوں میں مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مذہب سے بیزاری عام ہوئی تھی۔ جب کہ یہی دونوں امور میرے خیال میں سید احمد خاں کی دینیات کی طرف توجہ کے محرک تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ اس وقت بھی سر سید اپنے ملک کی معاصر صورت حال میں اسلامی مسائل کی جہات سے باخبر تھے اور انھوں نے خاص مذہبی اصطلاحات میں ان پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

موجودہ مطالعہ کو شعوری طور پر سر سید احمد خاں کی ان کوششوں تک محدود رکھا گیا ہے جو انھوں نے اپنے عہد کے مطابق مسلم دینیات کی تعبیر نو کے لیے کی، موزوں ثانوی مذہبی ادب کے جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید کی سوانح مرتب کرنے میں اس وسیع ذخیرہ کے پس منظر اور دیگر تمام معلوم مواد کو بیشتر نظر انداز کر دیا گیا۔ سر سید کے سوانح حالات سب ناقدین نے قریب قریب ایک سے لکھے ہیں مگر ان کے مذہبی افکار کے پیش نظر ان کے سوانحی حالات اور دیگر نظریات کو بھی تعصب کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس مقالے میں ان تمام اعتراضات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس لیے راقم کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان زمانوں اور شکلوں کی نشان دہی کی جائے جن میں سر سید کو غیروں کے اعتراضات اور خود اپنوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ مقالے میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سر سید نے ان آزمائشوں کو کس طرح دیکھا اور کیسے ان کی تردید کی یا ان میں ترمیم و اضافہ کے ذریعے اپنے نظام و افکار سے انھیں ہم آہنگ کیا۔ واقعات غدر کے سر سید کی بصیرت پر گہرے اثر سے انکار نہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی دینی فکر کا آغاز اس واقعے سے قبل ہو چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کی زندگی کی ابتدائی چار دہائیاں اس سے زیادہ توجہ کا تقاضہ کرتی ہیں، جتنی اب تک ان پر کی گئی ہے۔ یہی چار دہائیاں ان کے سوانح لکھنے کے لیے ناقدین سر سید کے پیش نظر رہی ہیں۔ سر سید کے مذہبی ناقدین کو دینی فکر و عمل کی ایک وسیع مسلم

روایت میں سرسید کی نشوونما اور روایتی مذہبی علوم کے مطالعہ کے ذریعہ اپنی معلومات میں اضافے کی خود ان کی کوششوں پر مزید غور و خوض کرنا چاہئے۔

پہلے باب میں سوانحی کتب کا جائزہ لینے کے بعد سرسید احمد خاں کے متعلق مختلف ناقدین کی آرا پیش کی گئی ہیں اس کے بعد سرسید کی اپنی تحریروں سے بھی افکار کا موازنہ کیا گیا ہے اور راقم نے خود اپنی رائے بھی پیش کر دی گئی ہے۔

اس مقالے کا دوسرا باب سرسید کے دینی افکار کا حامل ہے۔ میرے خیال میں سرسید کی دینی تصنیفات کے بنیادی محرک کی جستجو غیر ضروری ہے کیوں کہ سرسید احمد خاں اپنے مذہبی کام کو اپنی تمام اصلاحی کوششوں کا ایک ناگزیر جز تصور کرتے تھے۔ ان کی زندگی معاشی، سیاسی یا سماجی تبدیلیوں کی طرف خبری یا ضمنی علامت نہیں بل کہ ان کی پوری حیات فکر کی سطح پر بنیادی تبدیلیوں کی تجسیم ہے، جو تبدیلی کی مذکورہ تمام انواع سے مربوط ہے۔

سرسید کے سیاسی افکار و خدمات کے حوالے سے لوگوں کی آرا و تنقید کا آغاز بھی ان کی زندگی میں ہو چکا تھا، اس کے پس منظر کو دیکھا جائے تو وہ ایک وسیع المشرب اور مملکت انگلشیہ کے اہم وفادار کی حیثیت سے ان کا ذکر اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ ابھی اہمیت حاصل کر رہے تھے۔ اخبار The Pioneer کے مدیر John Macdonald نے مختصر سوانحات کے ایک مجموعہ میں سرسید کو ''وسیع المشرب مسلمانوں کا رہنما'' کہا تھا جو بعض بنیادی مذہبی عقائد کے علاوہ ہر چیز میں انگریز تھے۔ سرسید احمد خان کی پہلی مکمل سوانح میں G.F.I. Graham کا نقطہ نظر بھی بنیادی طور پر اس سے مختلف نہیں۔ اس سوانح کا مقصد سرسید کی مثال کے ذریعہ ہندوستانی اشرافیہ کی بیدار ہوتی ہوئی نسل کو تحریک دینا ہے کہ ایک ممتاز اور اعلیٰ مگر غریب خاندان کے ہندوستانی شریف آدمی جس نے صرف انیس سال کی عمر تک تعلیم پائی تھی، انگریزی جاننے کی اہم سہولت کے بغیر، خود کو اتنا بلند کر لیا کہ اب وہ ہندوستان میں اپنے زمانے کا سب سے نمایاں مسلمان ہو گیا ہے۔ گراہم علی گڑھ کالج کے قیام کو سید احمد خاں کے

کاموں کا سرتاج تصور کرتا تھا۔ اس نے اس خیال پر زور دیا کہ سرسید اپنے مقدور بھر حاکم ومحکوم کے درمیان خوش گوار تعلقات کے قیام اور بھائی چارے کی بنیاد پر ہماری عظیم سلطنت کی ترقی اور خیر خواہی کے لیے کوشاں ہیں۔

جی ایف آئی گراہم کی طرح سرسید کے انگریز دوست جان سٹریچی (John Strachey) (۱۸۲۳۔۱۹۰۷ء) نے بھی ان صفات کو بیان کرتے ہوئے ان کے اکتسابات کے ٹھیک اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ تھیوڈور بیک (Theodore Beck) (۱۸۵۹۔۱۸۹۹ء) اور تھیوڈور موریسن (Theodore Morison) (۱۸۶۳۔۱۹۳۶ء) جو بالترتیب ۱۸۸۴۔۱۸۹۹ء اور ۱۸۹۹۔۱۹۰۵ء میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل رہے اور ہندوستان کی مردم شماری سے متعلق لوگوں نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے۔ اس کے علاوہ جیمز کینڈی (James Kennedy) نے بھی، جو ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان علی گڑھ میں منصف اور کلکٹر رہے، مغربی تہذیب اور تعلیم کے لیے سرسید کے کھلے ذہن کو سیاست میں ان کی نئی بصیرت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ہیوگ جارج رالنسن (Hugh George Rawlinson) نے سرسید کو برطانوی ہندوستان کی تاریخ میں ''نہایت عمدہ اور نمائندہ مسلمان'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

مشہور کانگریسی راہ نما D.N Bannerji اور ان کے ہم مسلک لوگوں نے سر سید احمد خاں کا ذکر ایسے مسلمان رہنما کی حیثیت سے کیا ہے جس نے ہندو مسلم اتفاق کے لیے کام کر کے ملک کے سماجی وتہذیبی اتحاد میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ وہ سرسید احمد خاں کو منضبط سیاسی مفہوم میں قوم پرور نہیں سمجھتے، یعنی ایسا شخص جو آزاد قومی حکومت کی وکالت کرتا ہو لیکن بیشتر جی انھیں ایک اہم معمارِ ملک تسلیم کرتے ہیں۔ چند دہائیوں کے بعد وضح طور پر بدلے ہوئے سیاسی حالات میں اشوکت مہتا، اچیوتا، پٹ وردھن اور راجندر پرساد نے بھی سرسید احمد خاں کا ان کے ابتدائی زمانے میں، یعنی اوائل ۱۸۸۰ء تک قوم پرست ہونا تسلیم کیا ہے۔ لفظ 'قوم پرست' اب یقیناً ایک

مخصوص زیریں آب ورنگ رکھتا ہے۔ راجندر پرساد نے لکھا کہ سر سید "ایک قوم پرست تھے اور ہندو اور مسلمانوں پر مشتمل ایک قوم میں یقین رکھتے تھے، جسے وہ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ہندو قوم کہتے اس لیے اپنے ابتدائی زمانے میں وہ تحریر و تقریر میں قوم پرست نقطۂ نظر اختیار کرتے اور ہندو اور مسلمان دونوں انھیں قومی رہنما تسلیم کرتے تھے۔" اپنے زمانے کے دوسرے لوگوں کی طرح سر سید ہندوستانی عوام کے لیے انگریزی حکومت کے بہتر ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ اس خیال میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی اور جن کے سیاسی حوصلوں سے سر سید اتفاق کرتے تھے۔ سر سید کے نقطۂ نظر میں تبدیلی اور انڈین نیشنل کانگریس سے احتراز، جس میں قومی تحریک نے اپنا اظہار پایا تھا وک ان مصنفین اور مولانا طفیل احمد منگلوری نے علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل اور بطور خاص Theodore Beck کا اثر بتایا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں شائع متعدد کتابوں میں سر سید کو ہندو مسلم اتحاد کی روشنی میں دیکھا گیا ہے چناں چہ کانگریس پارٹی سے ان کے اختلاف کو "سیاسی مصلحت" کی بنیاد پر دیکھا گیا ہے۔ شان محمد لکھتے ہیں کہ ان کا ذہن فرقہ وارانہ خیالات سے کبھی آلودہ نہیں اور مشیر الحق نے سر سید احمد خاں کے ہندوستانی قوم پرست ہونے کی پرزور تائید کی۔ مشیر الحق کے خیال میں وہ اتنے ہی قوم پرست تھے، جتنی کہ کانگریس۔

س سے بالکل متضاد سر سید احمد خاں کی ایک ایسے سیاسی رہنما کی تصویر ہے جو ہندوؤں سے الگ مسلمانوں کے ایک سیاسی وجود کی تعمیر میں کوشاں ہے۔ علاحدگی کی یہ پالیسی ہندوستان میں برطانوی مملکت کی حدود کے ندر ہی کارفرما دیکھی گئی۔ اس نظریہ کے مطابق جب سر سید لفظ 'قوم' کا استعمال 'مسلمانوں' یا اس کے مقابل کسی اور حلقہ کے لیے کرتے ہیں تو وہ ایک علاحدہ مسلم وجود پر زور دیتے ہیں، جس کی ایک سیاسی وآرزو ہے، البتہ یہ سیاسی وجود مملکت کی حدود کے اندر ہوگا۔

تھیوڈور بیک نے، جنھیں سرسید کے کانگریس مخالف خیالات بل کہ ہندو مخالف فرقہ پرستی کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، سرسید سے یہ خیال منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان مختلف اقوام سے مل کر بنا ہے۔ Theodore Beck نے زور دیا کہ ان کے اور سرسید کے ذہن میں ایک ایسے ملک کے لیے پارلیمانی حکومت ناموزوں ہے، جس میں دو یا دو سے زیادہ اقوام رہتی ہیں کہ یہ طرز حکومت عددی اعتبار سے کمزور طبقہ کی حق تلفی اور ظلم کے سبب ان کو بغاوت پر ابھارتی ہے۔

Theodore Beck کی تحریروں میں اصلاح ''قوم'' سیاسی اعتبار سے یقیناً علاحدگی پسند تعبیرات رکھتی ہے لیکن دوسرے مصنفین کے ساتھ ایسا نہیں ہے یا کم از کم اس لفظ کے سیاسی مضمرات کے استعمال کا تعین بہت مشکل ہے۔ جہاں ویلنٹائن چرول (Valentine Chirol) اور سر ریجنلڈ کوپ لینڈ (Sir Reginald Copuland) سرسید کے سیاسی رویے کو ''فرقہ وارانہ'' کہتے ہیں، وہیں آئی ایچ قریشی اور عبدالحامد نے بھی ان کی پالیسی کی علاحدگی پسندی پر بہت زور دیا ہے۔

یم ایس جین (M S Jain) اس وقت ایک دوسری تصویر پیش کرتے ہیں۔ جب وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور مستقبل کے نظام ملک میں ان کے کردار کے متعلق سر سید احمد خاں کے تصور کی تکمیل قوم پرست رویہ اختیار کرنے سے بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ پہلے اور سب سے زیادہ ایک مسلمان تھے اور ایک مسلمان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ پاکستانی اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ان کے ملک کے بانیوں میں سے ایک تھے۔

۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانہ سے شائع ہونے والی متعدد کتابوں میں سرسید کی جو تصویر سب سے زیادہ اُبھر کر سامنے آئی ہے وہ ایک ایسے پیش رو کی ہے جس نے برصغیر میں مسلم ملک کے قیام کا تصور دیا ہے۔ ایک مکمل خودمختار قوم، جو بالآخر ''آزاد جمہوریہ پاکستان'' کی شکل میں مجسم ہوئی۔ اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے عبداللطیف، سچن سین اور عبدالرفیع خاں کے ذہن میں سرسید احمد خاں کی تعلیمی اور سیاسی سرگرمیاں

ہیں۔ مزید یہ کہ ۱۹۵۰ء کے قریب بی۔اے ڈار نے پاکستان کی نظریاتی اساس کی ضرورتوں کے پیش نظر سرسید کے تصور اسلام کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مسلم قومیت کی تعمیر میں سرسید کی غیر معمولی عطا کا یہ تکرار ذکر کیا ہے۔

لیکن سرسید کے سیاسی افکار کے حوالے سے ''مسلم قومیت'' کے نقطۂ نظر کے غالباً سب سے منضبط شارح حفیظ ملک ہیں۔ جو اگرچہ انگریزوں سے معاونت کو سرسید کی تمام سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ تعلق ایک سیاسی حکمت عملی سے زیادہ نہیں تھا۔ سرسید کے ذہن میں مسلم ''نیشن'' کے متعلق غور وخوض سب سے اہم مسئلہ تھا۔ نیشن کی اصطلاح کا مفہوم سرسید کی تحریروں اور تقریروں میں خاصا مبہم ہے۔ حفیظ ملک نے اس کا ترجمہ قوم کیا ہے جب کہ کچھ ناقدینِ سرسید کے بقول قوم سے مراد ہندستانی عوام ہیں۔

۱۹۶۸ء کے اپنے یک مضمون میں حفیظ ملک نے سرسید کی ''علاحدگی پسند مسلم قومیت'' تک کا ذکر کیا ہے جو تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء) سے ظاہر ہوتا ہے اور ۱۹۷۰ء میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ وہ پہلے مسلم قوم پرست ہیں اور اس کے بعد ہندوستانی۔ ملک نے موجودہ پاکستان کا نقطۂ آغاز سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک میں تلاش کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کی روحانی وارث کل ہند مسلم لیگ تھی جس نے لاہور میں تقسیم ہند کا مطالبہ کرتے ہوئے پاکستان کی قرارداد منظور کی۔

۱۹۳۰ء کے آس پاس اور اس کے بعد مبصروں اور مورخوں نے سرسید کی روش اور اکتسابات کا مطالعہ طبقاتی مفاد اور طبقاتی کشمکش کے حوالے سے بھی کیا اور ان کے نظریات اور حکمت عملی کے مزاج اور ارتقا کو ان کے عہد میں، ہندوستانی معاشرے پر اثر انداز ہونے والی معاشی اور سماجی تبدیلیوں کے سیاق وسباق میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے سرسید احمد خاں کو اونچے اور متوسط طبقے کے مفادات کے محافظ کی حیثیت

سے پیش کیا۔ مثلاً جواہر لال نہرو نے سرسید کو مسلم جاگیردار طبقے کے مفاد کے لیے کوشاں دیکھا۔ دوسری طرف W.C. Smith کے خیال میں سرسید اور ان کے رفقا نے اس نئے متوسط طبقے کی نگہداشت کی، جو برطانوی شہنشاہیت کے دوسرے مرحلے پر وجود میں آیا جب برطانوی روشن خیال تہذیب کا ملک میں چرچا شروع ہوا۔ نتیجتاً Smith لکھتا ہے کہ سرسید کا اسلامی تجدد، ایک وسیع المشرب اسلام کے علاوہ کچھ نہیں، جو اپنے ظاہر میں انیسویں صدی کے یوروپ سے مشابہ ہو اور بطور خاص سائنس، طریقۂ تجارت اور انسان دوستی میں اس سے ہم آہنگ ہو نہرو کے اتباع میں کئی مؤرخوں نے مثلاً ک۔ م۔ پانیکر (۱۸۹۵۔۱۹۶۳ء) اور رام گوپال اپنی کانگریسی دوستی کے سبب سرسید کی ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے دوران کانگریس مخالفت کو ان کے بالائی متوسط طبقہ سے تعلق کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

بیگم رکن الدین حسان، سرسید کی تعلیم کوششوں کو ان کے مسلم طبقۂ اعلیٰ کی طرف داری سے منسوب کرتی ہیں اور سید عابد حسین نے سرسید کی فکر و عمل کے تمام پہلوآن کی تعین میں ان کے اپنے طبقہ یعنی شمالی ہند کے اشرافیہ اور خواص کے مفادات کو غالب اور فیصلہ کن بتایا ہے۔

فرانس روبنسن کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے افکار میں ارتقا کے بغور مطالعہ کے بعد ان کے سیاسی افکار و اعمال کا دوسروں سے مختلف خاکہ پیش کیا ہے۔ روبنسن کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ مابعد ۱۸۵۷ء کے سالوں میں سرسید ''حکومت اور مسلمانوں کے درمیان تعلق'' سے زیادہ ان اردو داں اشرافیہ کے مفادات کے لیے متفکر تھے جو حکومت کی پالیسیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ مسلمان اس اردو بولنے والے طبقہ کا محض ایک حصہ تھے۔ روبنسن کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر میں سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو ایک سیاسی و تہذیبی وحدت سمجھنا اور ان کو اس طور پر برتنا شروع کیا۔ اس زمانے کے بعد ہی انھوں نے اپنی جدو جہد کا یہ مقصد مقرر کیا کہ ہندوستان کے معاملات میں ان کو وہی اقتدار و اختیار حاصل ہو جو ماضی میں ان

کے پاس تھے۔ چھٹی دہائی تک ان کا یہ مقصد تمام اردو دان اشرافیہ کے لیے تھا اور اب یہ مقصد اس اشرافیہ کے صرف مسلمان ممبروں تک رہ گیا۔

اس کے علاوہ ان لوگوں میں جو سرسید کو دنیاوی طور پر مسلمانوں کا رہنما تصور کرتے ہیں، متعدد مصنفین ان کو ایسا ممتاز فرد سمجھتے ہیں جس نے آخری مغلیہ عہد، بغاوت اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے عام زوال کے بعد، مسلمانوں کو دوبارہ نئے جوش اور توقیر کے ساتھ نمایاں کیا۔ سرسید احمد خاں کے عمل اور فکر کی مختلف جہات، سماجی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی کے متعلق مختلف تحریروں میں احیا پر زور دیا گیا ہے لیکن یہ تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ ان کا سب سے اہم کارنامہ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی توقیر اور اعتماد کی دوبارہ بحالی ہے۔ پاکستانی مورخ شیخ اکرام نے جو ۱۹۵۰ء میں A. H. Albiruni کے قلمی نام سے لکھتے تھے، اسی نہج پر سرسید کے کاموں کی تشریح کی، یہ اتفاق ہے کہ نہرو اور پانیکر جیسے ہندو بھی اس سے متفق ہیں جو غالباً سب سے جامع بیان ہے جس سے اس میں اہم ملک گیر جہت کا اضافہ ہوا۔

بعض اور لوگ بھی سرسید کے متعلق اس خیال سے متفق ہیں لیکن وہ تہذیبی و تعلیمی عناصر کو بطور خاص اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا سمجھنے والوں کے ہراول دستہ میں لبنانی، عیسائی مصنف جرجی زیدان ہے جو سرسید کا اصل کارنامہ یہ سمجھتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو مغرب کی مخالفت سے باز رکھا اور انھیں بتایا کہ جدید مغربی علوم ان کے مذہب کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ اس طرح ایک گم نام مسلمان نے انڈین ریویو (مدراس) میں لکھتے ہیں کہ سرسید کی تعلیمی سرگرمیوں کو ان کی سب سے اہم عطا قرار دیا ہے۔ اس کے ذریعہ سرسید اپنے ہم وطنوں کو سماجی اثر آفرینی، اخلاقی قوت، روحانی ارتقا اور سیاسی طاقت واقتدار کے مرتبہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔

بیگم رکن الدین حسان کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی سرسید احمد خاں کے تعلیمی کام اور ان کی شروع کی ہوئی تعلیمی تحریک پر پہلی مبسوط کتاب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر الطاف حسین حالی کی طرح کوئی سرسید احمد خاں کو 'عظیم ماہر تعلیم' کہے تو اسے لفظ "ماہر

تعلیم'' کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کرنا ہوگا۔ کیوں کہ انھوں نے تعلیم کو اصلاح کا ذریعہ سمجھا۔ انھوں نے مسلمانوں میں عزت نفس بحال کی اور اس کے ساتھ ہی انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کرانے میں کامیاب رہے۔''

یہاں سرسید کی اردو نثر کے مصلح اور اردو ادب میں عہد جدید کے بانی کی حیثیت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ممتاز مورخ اور عالم مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۸ء ہی میں کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں اردو لٹریچر خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گیا۔ شبلی، غالب کو جدید اردو نثر کا بانی اور سرسید احمد خاں کو امام اور مجدد کہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ اول عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت، جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے۔ خود انھوں نے اپنے مضامین میں اسلوب کی سادگی، وضاحت اور اثر کے بہترین نمونے پیش کیے، جو ایک اچھی نثر کی خصوصیات ہیں اور آخری بات یہ کہ انھوں نے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا، لیکن ترجمہ کے ذریعہ نہیں، بل کہ اس طرح کہ انگریزی خیالات اردو میں اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیے۔

دوسروں کے علاوہ حالی، رام بابو سکسینہ اور حامد حسن قادری نے شبلی کے اس خیال کی تصدیق کی ہے۔ موخر الذکر نے اردو نثر کی تاریخ پر اپنی پہلی کتاب میں، تہذیب الاخلاق کے مضامین کی مثال دے کر ادبی اسالیب پر ان کی قدرت کی نشان دہی کی ہے۔ سید محمد عبداللہ نے اردو ادب میں سید احمد خاں کے اکتسابات کا یوں احاطہ کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کی ہی تحریک پر سنجیدگی کا عنصر اردو ادب میں داخل کیا گیا اور روایت پرستی روکی گئی۔ ان کی تحریروں نے احساس آزادی بیدار کی، ذوق تحقیق اور حق کی جستجو پیدا کیا اور ترقی کی خواہش کو تحریک دی۔ اس تحریک کے زیر اثر صرف اردو کا مواد ہی نہیں بدلا بل کہ اس کی ہیئت اور اسلوب میں بھی بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔

سرسید کی سوانح حیات جاوید میں خواجہ الطاف حسین حالی کا محاکمہ زیادہ جامع ہے۔ حالی سرسید کو بنیادی طور پر مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے والا سمجھتے تھے لیکن ان کے نظریہ میں اتنی وسعت ہے کہ اس کی تعبیرات تمہیدی بیان کے دوسرے جز پر بھی صادق آتی ہیں، جہاں سرسید کو ایک نئے تجدید شدہ اسلام کا افتتاح کرنے والا کہا گیا ہے۔

حالی، ہندوستان میں فروغ پا رہے، مغربی تعلیم یافتہ مسلم متوسط طبقہ کے ذہن سے لکھتے ہیں۔ وہ سرسید احمد کو انیسویں صدی میں، ہندوستانی مسلمانوں کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ایک ایسا آدمی، جو ۱۸۵۷ء کی جراحت وانتشار کے بعد برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی خودداری اور توقیر بحال کرنے کا اہل تھا۔ سرسید ہندوستانی مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی نسل کے مثالی آدمی تھے۔ ان کا طرز حیات اور عمل کسی دوسرے شخص سے زیادہ، بیرونی غیر مسلم حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے لیے موزوں ہے۔ چوں کہ مسلمان اب اس ملک پر اپنی، دی قوتوں سے حکوست نہیں کر رہے تھے، اس لیے انھیں اب اپنے حاکموں اور ہم وطنوں کے دل جیتنے تھے تاکہ وہ عزت اور توقیر حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انھیں ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے حل کی ضرورت تھی۔ اس مقام پر حالی کے خیال میں سرسید راہ نمائی کر سکتے تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ایک قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جاننا، سرسید کی تعلیم اور زندگی کا بنیادی اصول نہیں تھا۔

سی سبب سے سرسید نے مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی بنیاد استوار کرنے پر توجہ مرکوز رکھی۔ انھوں نے تعلیم کو ترقی کا بنیادی ذریعہ قرار دیا۔ ان کے تمام دوسرے اعمال اس بنیادی خواہش میں پیوست تھے کہ ہندوستان میں اسلام کی عظمت دیرینہ اور توقیر بحال کی جائے۔ سرسید کے اس عمومی جائزہ کے بعد حالی ان کی ملکی، قومی اور مذہبی خدمات کا بیان کرتے ہیں۔ وہ سرسید کے کام کو مغربی اصطلاح ''اصلاح'' (Reformation) کا نام دیتے ہیں اور ان کو مصلح کہتے ہیں۔

حالی جانتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں بہت مصلح ہوئے ہیں لیکن ان کے نزدیک ان مصلحین اور سر سید احمد کے درمیان اہم فرق یہ تھا کہ ان تمام مصلحین نے اسلام کی کسی ایک تعلیم یا شعبہ میں اصلاح پر زور دیا ہے جب کہ سر سید احمد نے اسلامی تعلیمات کی جامع اور وسیع ،صلاح کی کوشش کی۔اس کے یہ معنی نہیں کہ سر سید کی تعلیمات یکسرنئی تھیں۔حالی کہتے ہیں کہ واقعتاً سر سید کی بہت کم نئی اصلاحیں ایسی ہیں جن کی سند محققین اہل اسلام کی تحریروں میں نہ ملتی ہوں۔

حالی کہتے ہیں کہ سر سید نے اسلام کے ایک نئے فرقے کے رہنما ہونے سے ہمیشہ انکار کیا۔ ان کی اصلاح کا کل مقصد مسلمانوں کی دنیاوی ترقی میں رکاوٹوں کو دور کرنا اور عیسائی اقوام کی اس تنقید کی تردید کرنا تھا کہ اسلام اخلاقی بلندی اور ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

روایتی معلمین اسلام سے سر سید کے انحراف کے متعلق ایک مخصوص باب میں حالی نے سر سید کے ایسے اکتالیس نکات کا ذکر کیا ہے جن کی تائید میں وہ کم از کم ایک روایتی عالم کو پیش کر سکتے ہیں اور دس نکات ایسے ہیں جن کی قدیم اسلامی روایت میں غالباً کوئی مثال نہیں ملتی۔

سر سید کی یہی تصویر ان کی تحریروں سے ابھرتی ہے۔یعنی ایک ایسا شخص جو اپنے زمانے کی آزمائشوں کے درمیان نظام اوامر و نواہی کی علمی وراثت کی حیثیت سے اسلام کے مستقبل کے متعلق فکر مند ہے،اس موضوع پر متعدد آرا دو زمروں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ایک حلقہ اسلامی نظریات میں ان کے افکار کو بنیادی طور پر ایک مدافعانہ اور تحفظانہ کوشش سمجھتا ہے جس میں یا تو عیسائیت کے مقابلے میں دینی عذر خواہوں کے طرز پر نظریات مرتب کیے گئے ہیں کہ اس نے مشنری تحریک کی شکل میں اسلام کو دعوت مقابلہ دی تھی یا اسلام کو وسیع المشرب عقلیت پسند اور ترقی پسند مذہب ثابت کر کے اس کا دفاع کیا۔دوسرا حلقہ سر سید کے افکار کو کوئی دینیاتی تشکیل یا تخریب کی ایک جرأت مندانہ کوشش یہاں تک کہ نئی دینی تصریف کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد کی ناقدینِ سرسید میں ایک غیر معمولی مذہبی مفکر اور عالم دین کی حیثیت سے سرسید کی تحسین یا تنقید کی گئی، جس میں انھوں نے اسلامی نظریات کو مد مقابل غیر اسلامی تہذیب کی طرز پر اور اس کے ساتھ آمیز کر کے مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ یہ توضیحات ان لوگوں کے نظریات سے متاثر ہیں جنھوں نے اسلام اور اس کی فکری وراثت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس سبب وہ اس کے اہل ہیں کہ سرسید کی فکری ارتقا کا بیان، اسلام سے متغائر اصلاحات کے غیر ضروری استعمال کے بجائے اسلامی روایت کی فراہم کردہ اصلاحات و لفاظ میں کر سکتے ہیں۔

سرسید اور اصلاحِ معاشرہ، شاہد حسین رزاقی، (۲۰۱۴ء)

دارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہوئی اس کتاب میں مصنف نے بیان کیا کہ سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت کیا تھی اور انھوں نے معاشرے کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کے لیے کیا تدبیریں اختیار کیں۔ ان کی اصلاحی تحریک کس حد تک کامیاب ہوئی، تعلیم کی اصلاح و ترقی، دینی عقائد کی درستی، اخلاق و عادات کی اصلاح، رسوم و رواج میں مفید ترمیم، طرزِ معاشرت میں تبدیلی، ملی اتحاد و مذہبی رواداری کے فروغ اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت جیسے اہم مقاصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے کس قدر وسیع، منظم اور مؤثر جدوجہد کی۔ معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لیے سرسید کا منصوبہ کہاں تک کامیاب ہوا، ان کی اصلاحی کوششیں کس طرح ایک ملک گیر تحریک بن گئیں اور استقبال کی تحریکوں پر اس کا کیا اثر پڑا۔ حسین رزاقی نے تحسینی انداز اپنایا ہے۔ انھوں نے نو ابواب میں اس کتاب کو منقسم کیا ہے جن کی ترتیب کچھ یوں ہے:

پہلا باب: سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی حالت

دوسرا باب: معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ

تیسرا باب: تعلیم کی اصلاح اور ترقی

چوتھا باب: دینی عقائد کی درستی

پانچواں باب: اخلاق و عادات کی اصلاح

چھٹا باب: رسوم و رواج میں مفید ترمیم

ساتواں باب: تمدن اور طرزِ معاشرت میں تبدیلی

آٹھواں باب: ملی اتحاد اور مذہبی رواداری

نواں باب: عورتوں کے حقوق کا تحفظ کے نام قائم کیا گیا ہے

ہر باب میں ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں اور موضوع کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً پہلے باب میں سرسید کے زمانے مسلمانوں کی حالت میں سب سے پہلے مسلمانوں کا زوال، اس کی وجوہات، اس کے بعد معاشرتی برائیاں بیان کی ہیں۔ اس کے بعد سرسید کے اس بارے میں تاثرات کے عنوان سے معاشرے کی عام کیفیت، معزز خاندانوں کا حال زار اور اس کے بعد سرسید کا انتباہ تحریر کیا گیا ہے۔ ان سب کو ایک موضوع دیا ہے جو شہ سرخی سے تحریر کیا ہے۔ ہر باب میں مصنف کا یہی اسلوب نظر آتا ہے۔ باب کا عنوان، ذیلی عنوان جو موضوع در موضوع ہے۔ اس سے قاری کو بات سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور عام آدمی بھی بات سمجھ جاتا ہے۔ مصنف نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کی نہ ہی سرسید کی تفسیر یا اسلامی افکار کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا مقصد محض سرسید کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لیے سرسید کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ حسین رزاقی نے اخلاق و عادات کی اصلاح کے نام سے قائم کردہ باب میں نقصان رساں عادتیں اور ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی کے نام سے ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔ سرسید کے اقوال و افکار بیان کرنے سے پہلے وہ لکھتے ہیں۔

> ''مسلمانوں کی ماضی پرستی نے ان کو حال اور مستقبل سے غافل بنا دیا تھا اور وہ اصلاح و ترقی کے لیے کوشش کرنے کی بجائے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ

وہ ترقی کی تمام منزلیں طے کر کے درجۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اور اب ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ تمام علوم و فنون اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ان کے آباؤ اجداد نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب ترقی کے لیے کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہی اس لیے وہ ہر نئی چیز سے گریز کرنے لگے اور ترقی پذیر زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے لکیر کے فقیر بنے رہنے کو سب سے بڑی ترقی سمجھنے لگے۔سرسید نے ان کو س تباہ کن رجحان کے خطرات سے آگاہ کر کے اس حقیقت کو واضح کیا کہ پنے تئیں درجۂ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی دراصل زوال کی نشانی ہے۔''[1]

سرسید قدامت پرستی کے خلاف تھے۔وہ نئی باتیں اور علوم وفنون کو فروغ دینا چاہتے تھے۔اس حوالے سے حسین رزاقی کا کہنا ہے:

''قدامت پرستی اور نئی باتوں اور علوم وفنون سے گریز کے نقصانات بیان کرتے ہوئے سرسید نے یہ وضاحت کی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچا ہوا اور نا قابل سہو وخطا سمجھ کر ان کے علوم وفنون اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور س کی پیروی پر جمے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ وایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم وفنون وطریقۂ معاشرت کی ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔''[2]

تعصب کے عنوان سے سرسید کا ایک مشہور مضمون بھی ہے۔وہ تعصب سے گریز کرنے کی فکر کو ترویج دیتے رہے۔حسین رزاقی سرسید کے افکار کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا خلاق میں اور کیا علم وہنر میں اور کیا فضل ودانش میں اور کیا تہذیب وشائستگی

میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں، اعلیٰ درجہ سے نہایت پست
درجۂ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی
بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجہ
سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔''[۳]

سرسید کی اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں تہذیب الاخلاق کے مرہونِ منت پروان چڑھی ہیں۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق میں اخلاقی و معاشرتی تعلیم کے حامل مضمون میں لکھیں۔ اپنی مدد آپ ان کا مشہور مضمون ہے جس میں انھوں نے قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تعلیم دی ہے کہ اس کے لیے آپ کو خود سے محنت کرنی ہوگی۔ یہ مت سوچیں کہ کوئی خضرِ راہ ملے گا یا گورنمنٹ فیض ہوگی اور آپ کے سارے کام کر دے گی۔ حسین رزاقی نے اس حوالے سے لکھا ہے:

''گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو
رنگ ان کا ہوتا ہے وہی گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ کسی ملک کی خوبی و عمدگی
و رقد رو منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عہدہ ہونے کے زیادہ تر اس
ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے
کیوں کہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان
مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔ قومی ترقی مجموعہ
ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمان داری اور شخصی ہمدردی کا۔''[۴]

نھوں نے سرسید کی سیاسی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''سیاسی اعتبار سے سرسید کی تحریک کے نتائج نہایت اہم اور دور رس ثابت
ہوئے۔ اس کی بدولت مسلمانوں میں ملی و سیاسی شعور بیدار ہو گیا اور انھوں
نے اپنے مستقبل کی تعمیر ور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے سیاسی میدان
میں بہت اہم اور فیصلہ کن قدم اٹھائے۔''[۵]

مسلمانوں کے لیے سرسید کی اصلاحی تحریک کس قدر ضروری اور مفید تھی اور انھوں

نے ایک زوال پذیر معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح وترقی کا مشکل کام کس خوبی سے انجام دیا اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ ایک ایسی قوم جو معاشری، سیاسی، اقتصادی ہر اعتبار سے تباہ ہو گئی تھی جو ایک بہت بڑے ملک پر صدیوں حکومت کرنے کے بعد غلام بنالی گئی تھی اور حکمرانوں کے بغض وعناد کا شکار تھی۔ جس کی اقتصادی زبوں حالی اور افلاس میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں نہایت پست حالت میں تھی۔ جس کے رسوم و رواج، اخلاق و کردار اور عادات واطوار بگڑ چکے تھے اور جس کی دینی زندگی میں بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جو نیک وبد میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو کر جہالت کی تاریکی اور گمراہ کن تعلیم کی بھول بھیوں میں بھٹک رہی تھی، اس کی حالت کو درست کرنا کس قدر مشکل تھا لیکن سرسید نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور جس ایمان وایقان، خلوص و صداقت، عزم وہمت، فہم وفراست، مستقل مزاجی اور کامیابی کے ساتھ انھوں نے یہ زبردست کام انجام دیا وہ ان کے افکار ونظریات میں چند نقائص کے باوجود ان کی عظمت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔

یہ کتاب سرسید شناسی کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور جان فشانی سے سرسید کی اصلاح معاشرہ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مصنف کی یہ کاوش بھی قابل تعریف ہے۔

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین (۱۹۹۳ء)

پروفیسر ثریا حسین نے یہ کتاب سرسید پروجیکٹ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے تحت لکھی۔ اس کتاب میں انھوں نے سرسید احمد خاں کو ان کے صحیح علمی ور سماجی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں سرسید احمد خاں کی شخصیت، ان کے کارناموں اور ان کی معاصر صورت حال کا جائزہ غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے سرسید کی مذہبی، تاریخی، لسانی، ادبی، سیاسی اور تعلیمی خدمات کا بھی

جائزہ لیا ہے۔ سرسید ہمارے یہاں جدیدیت کے پیش رو اور ایک ذہنی انقلاب کے نقیب ہیں۔ سرسید کی تفسیر کے حوالے سے پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں:

''یوں تو سرسید اپنی متعدد تصانیف میں اسلام کے بیشتر مسائل سے متعلق نئی آرا کا اظہار کر چکے تھے۔ مثلاً غلامی، تعدد ازدواج، وحی کی ماہیت، فرشتہ، شیطان اور معجزہ۔ جو لوگ ان کے خیالات پر اعتراض کرتے تھے وہ سب دلیل کے طور پر قرآن کی آیتوں کو نقل کر کے ان کو اپنے نظریہ کے مطابق معنی دیتے تھے چوں کہ وہ ہر معترض کا جواب فرداً فرداً نہیں دے سکتے تھے اس لیے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ خود قرآن پاک کی ایک ایسی تفسیر لکھ دیں جس میں وہ اپنے نظریات کی بہ خوبی وضاحت کر سکیں۔''[۲]

ولیم میور کی کتاب کے جواب میں سرسید احمد خاں نے 'الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ' تحریر کی تھی، اس کی تفصیل میں پروفیسر ثریا حسین نے لکھا ہے:

''ولیم میور کی کتاب انگریزی میں تھی جو قدیم اسلامی (عربی) ماخذوں پر مبنی تھی۔ ان میں سے متعدد اس وقت چھپے بھی نہ تھے اور ان کے مخطوطے ہندوستان میں دستیاب نہ تھے۔ سید احمد خاں کے انگریزی داں دوستوں نے جب اس کے مندرجات سے آگاہ کیا تو انھیں شدت سے احساس ہوا کہ اس کا جواب دیا جائے اور شاید وہ اس کام کے لیے مناسب شخص ہوں۔ پہلے انھوں نے اس کا ترجمہ فارسی میں کروایا۔ مطلوبہ تردید کے لیے ضرورت تھی کہ قرآن اور بائبل کے مماثل بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ قرآن کی فضیلت ثابت ہو سکے۔ وہ 'تبیین الکلام' لکھ چکے تھے انھیں اندازہ تھا کہ متعلقہ تفسیری کتب ہندوستان میں کم ہیں اس لیے سید احمد خاں نے یکم اپریل ۱۹۲۹ء کو انگلستان کا سفر کیا اور وہاں تقریباً سوا سال تک اہم کتب خانوں، کتب فروشوں کی دکانوں اور مستشرقین سے استفادہ کرتے رہے۔''[۳]

س کتاب میں مصنفہ نے کل چھ باب تشکیل دیے ہیں۔ پہلے باب میں مذہب اور مذہبی کتب کو موضوع بنایا ہے جن میں تبین الکلام، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور دیگر مذہبی رسائل شامل ہیں۔ دوسرے باب میں تاریخ اور ان کی تاریخی کتب کو موضوع بحث بنایا ہے جن میں جام جم، آثار الصنادید، سسلتہ الملوک، تصحیح آئین اکبری، تصحیح تاریخ فیروز شاہی، تصحیح تزک بابری شامل ہیں۔ تیسرے باب میں زبان و ادب کے حوالے سے سرسید احمد خاں کی خدمات پر بحث کی ہے۔ اس باب میں اردو صحافت، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، خطوط، تقاریر ان کے موضوعات رہے ہیں۔ چوتھا باب سیاست کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس باب کے موضوعات میں سرکشی ضلع بجنور، رسالہ اسباب بغاوت ہند، لائل محمڈنز آف انڈیا اور سیاسی روّیہ ہیں۔ تعلیم کے نام سے قائم کردہ پانچویں باب میں مصنفہ کے تعلیمی نظریات، مدرسۃ العلوم، سائنٹیفک سوسائٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، تعلیم نسواں اور مستشرقین جیسے موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں حاصل کلام پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ سرسید احمد خاں، ان کے گھر کی تصاویر، ان کے استعمال کی چیزیں، کالج کا مونوگرام اور سرسید کا مقبرہ کی تصاویر شامل ہیں۔ آخر میں کتابیات کا حوالہ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید کی وجہ سے ہی ہماری نثر جو متمدن انسان کا اظہار بنتی جاتی ہے طفولیت کے دور سے نکلی۔ انھوں نے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بنایا جس کی وجہ سے دب ہماری رندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے لگا۔ انھوں نے جذبے کی آنچ کے بجائے عقلیت کی روشنی عام کی اور اس طرح اپنے حلقے کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے فکر کی نئی راہیں نکالیں اور ان راہوں سے بہت سے اُفق روشن کیے۔

پروفیسر ثریا حسین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ”اوائل انیسویں صدی کے ہندستان میں جو تاریخ ساز ہستیاں پیدا ہوئیں
> ن میں سرسید احمد خان کی شخصیت کئی اعتبار سے منفرد اور ان کے مشاغل کی

ہمہ جہت اور تنوع حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا
اور اپنے عہد کے دگرگوں سیاسی حالات اور تہذیبی انحطاط، بالخصوص
مسلمانوں کی ناگفتہ بہ صورت حال کا معروضی انداز میں مطالعہ کرنے کے
بعد ماضی کی تحقیق و تفتیش کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔ اس
پرآشوب دور میں ایک فردِ واحد کا اتنا بڑا کارنامہ ہماری ذہنی اور تہذیبی تاریخ
کا ایک مہتم بالشان اور عجیب و غریب واقعہ ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر
اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔"[۸]

سرسید کی نظر مغربی تعلیم اور افکار کی طرف تھی۔ وہ اپنی قوم کو مغربی تعلیم دلانا چاہتے تھے انھیں ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔

"سید احمد خاں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاسی ابتری، معاشی بحران،
تعلیمی بے مائیگی اور تہذیبی شکست و ریخت کا علاج مغربی تعلیم کے حصول
میں دیکھا اور فکر و نظر کے پیمانوں کو جدید حالات اور عصری تقاضوں کے
مطابق ڈھال دینے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ وہ راجہ رام موہن رائے
اور انیسویں صدی کے دیگر مصلحین کی اس روایت سے تعلق رکھتے تھے
جنھوں نے عملی جد و جہد اور اپنے قلم کے ذریعے ملک و قوم کے سدھار کی مہم
کو سر کیا۔ فرق یہ تھا کہ ان کی تعداد کم نہ تھی اور سید احمد خان تن تنہا تھے۔"[۹]

الغرض پروفیسر ثریا حسین نے سرسید کے افکار کا نہایت دور بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی معروضات اس کتاب میں پیش کی ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر ناقدانہ ہے۔ وہ غیر جانب دار ہیں۔ سرسید کے افکار کو متعدلانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب سرسید احمد خان کے متعلق سوانحی ادب میں تحقیق نما تخلیق نظر آتی ہے اور سرسید شناسی میں بہتر اضافہ ہے۔

سرسید احمد خاں: فکر اسلامی کی تعمیر نو، ڈاکٹر سی ڈبلیو ٹرال (۱۹۹۸ء)

اس کے مصنف ڈاکٹر سی ڈبلیو ٹرال، مترجمین ڈاکٹر قاضی فضال حسین اور محمد اکرم چغتائی ہیں۔ القمر انٹر پرائزرز نے ۱۹۹۸ء میں اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ سر سید کے سو سالہ یوم پیدائش پر شائع ہونے والی یہ کتاب کرسٹیان وِہلم ٹرول کی کاوش ہے۔ سر سید کے مذہبی افکار سے ٹرول کو خاص لگاؤ تھا۔ دراصل یہ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ خصوصی ہے جو انھوں نے لندن یونی ورسٹی میں حصول ڈگری کے لیے پیش کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر قاضی افضال حسین اور محمد اکرام نے کیا ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اس انگریزی کتب کا اردو ترجمہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ڈاکٹر قاضی فضل حسین (شعبہ اُردو) نے کیا تھا اور اس کا ابتدائی مسودہ ڈاکٹر ٹرول کے قیام ہندوستان کے دوران میں تیار ہو گیا تھا۔ ہندوستان چھوڑنے سے قبل س مسودے کی ایک عکسی نقل راقم الحروف کو بھجوائی گئی، لیکن یہ خاصی ناقص تھی۔ مترجم کا اندازِ تحریر بھی پریشان کن تھا اور کئی جگہوں سے اس کے پڑھنے میں دشواری پیش آئی۔ علاوہ ازیں اس نقل کے تمام حواشی حذف ہو گئے تھے، چناں چہ ان سب کو ازسرِ نو لکھنا پڑا۔ مسودے کو اوّل تا آخر بہ غور پڑھا گیا اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں تصحیح کر دی گئی۔ اس اعتبار سے ترجمہ شدہ متن میں بہت سے قطع و برید کرنا پڑی اور اس کا ایک نظر ثانی شدہ مسودہ تیار کیا گیا جو اردو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ سر سید کا سال وفات ۱۸۹۸ء ہے اور اب ان کی رحلت کو پورے سو سال گزر گئے ہیں۔ یہ کتاب سر سید کی اسی صد سالہ برسی کی مناسبت سے علم و ادب کے شائقین کی نذر کی جا رہی ہے۔''[۱]

ٹرول صاحب ۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء کو برلن میں پیدا ہوئے۔ ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۸ء میں ان کے والد کارل ٹرول بون یونی ورسٹی چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کارل (۱۸۹۹ء۔۱۹۷۵ء) اس یونی ورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ میں پڑھاتے

تھے۔ بعد میں وہ اسی یونی ورسٹی کے ریکٹر بھی مقرر ہوئے۔ وہ جغرافیہ پر بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور اس موضوع پر ان کا جاری کردہ جرمن رسالہ "Erdkunde" (سن اجرا ۱۹۴۷ء) آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں جرمن کوہ پیماؤں کی ایک ٹیم نانگا پربت کے لیے بھیجی گئی جس کے سربراہ کارل ٹروں تھے۔ وہ بون یونی ورسٹی کے ریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور آج بھی اس شہر کی ایک سڑک ان کے نام سے موسوم ہے۔

ٹرول نے اپنی ابتدائی تعلیم بون ہی میں مکمل کی ۱۸۵۷ء بعد میں دیگر مضامین کے ساتھ اس نے لاطینی اور یونانی زبانیں بھی سیکھیں۔ بون اور ٹیوبنگن کی یونی ورسٹیوں سے فلسفہ اور علوم دینی میں سند حاصل کی (۱۹۵۷ء۔ ۱۹۶۱ء)، بیروت کی سینٹ جوزف یونی ورسٹی میں چار سال تک اسلامیات اور عربی کے طالب علم رہے اور ڈپلومہ حاصل کیا۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں ٹرول صاحب نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اسلام سے ان کا اوّلین تعارف ۱۹۵۹ء میں ہوا، جب بون کے ایک کتاب خانے میں یسوعی پروفیسر ہوبن (P. I. Houben) کا وہ مقالہ نظر سے گزرا جس میں دورِ حاضر کے اہم اسلامی مطالعات کا ذکر کیا گیا تھا۔ بیروت سے فارغ التحصیل ہوتے ہی انھوں نے جرمنی کے عیسائیوں کی سوسائٹی میں شمولیت اختیار کر لی (۱۹۶۳ء) دو سال تک میونخ کے قریب پلاخ (Pullach) میں فلسفہ پڑھتے رہے اور اس میں اعلیٰ سند حاصل کی۔ ان علوم کی تحصیل کے بعد ٹرول تقریباً دس سال تک لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے منسلک رہے۔ اردو زبان و ادب میں بی۔ اے (آنرز) کیا اور اس کے ساتھ ہی فارسی اور جنوبی ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ ایک سال کے لیے ایران، پاکستان اور بھارت کے مختلف شہروں میں مقیم رہے اور یہاں کے اہل علم و دانش سے استفادہ کیا۔ لندن میں ہی انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے سرسید احمد خاں کے مذہبی افکار کی تعبیر نو کا موضوع منتخب کیا اور مشہور تاریخ دان پیٹر ہرڈی کی زیر نگرانی اپنا مقالہ خصوصی مکمل کر کے

۱۹۷۶ء کے آغاز میں ڈگری حاصل کر لی۔ اس علمی اعزاز کے حصول کے ساتھ ہی ٹرول کو دہلی کے ایک ادارہ برائے مذہبی علوم الموسوم بہ 'وڈیا جیوتی' میں پروفیسر اسلامیات مقرر کر دیا گیا۔ وہ یہاں بارہ سال (۱۹۷۶ء۔۱۹۸۸ء) کام کرتے رہے۔ شخصی اور علمی اعتبار سے یہ دوران اُن کی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جدید دینی تحریکوں پر متعدد مقالات سپردِ قلم کیے اور 'اسلام ان انڈیا' کے عنوان کے تحت چار جلدیں شائع کیں (۱۹۸۲ء۔۱۹۸۹ء) جن میں مغربی اور برصغیر کی معروف علمی شخصیات کی نگارشات شامل ہیں۔ اس عرصے میں ٹرول نے بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور امریکہ، یورپ اور جاپان کی بڑی بڑی دانش گاہوں میں لیکچر دیے۔ بھارت میں اس طویل قیام کے بعد وہ برمنگھم چلے گئے اور وہاں کے ایک سنٹر میں ان کا تقرر بطور سینئر لیکچرار ہو گیا۔ یہ ادارہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے تعلقات کے مطالعہ کے لیے مخصوص ہے۔ یہیں سے انھوں نے ایک شش ماہی رسالے کا اجرا بھی کیا جو اسلام اور مسیحیت کے پیروکاروں کو قریب تر لانے کی ایک کوشش تھی۔ اس عرصے میں وہ کچھ مدت کے لیے پیرس کے مرکز برائے مطالعہ جنوبی ایشیا میں مہمان لیکچرر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ برمنگھم سے فارغ ہو کر روم کے ایک ادارے Pontificio Instituto Orientate میں علوم اسلامیہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے ور اب تک وہ اسی عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ انقرہ یونی ورسٹی کے شعبہ الٰہیات میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مسلمان طلبہ کو مسیحیت پر لیکچر دیتے ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو جیسی بڑی اسلامی زبانوں کے علاوہ اب انھوں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی ہے اور ان کی بیشتر تحریریں اسی زبان میں ترکی کے علمی جرائد میں طبع ہو رہی ہیں۔

ٹرول کی مادری زبان جرمن ہے اور ان کی اکثر تحریریں اسی زبان میں ہیں۔ ان کا بنیادی موضوع اسلامی مسیحی تعلقات ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اب تک برصغیر پاک و ہند کے جدید مذہبی میلانات، معروف شخصیات مثلاً سر سید احمد خاں، شبلی نعمانی

اور مولانا ابوالکلام آزاد یا مذہبی جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر جو مقالات قلم بند کیے ہیں وہ زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ یورپ اور برصغیر کے مختلف علمی رسائل میں ان کے تحریر کردہ مضامین کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں ان کی اہم ترین کتاب سرسید کے مذہبی افکار سے متعلق ہے جو دراصل ان کی ڈ.کٹریٹ کا مقالہ خصوصی ہے اور اب اسی کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک اور کتاب ہنڈرسن ڈگلس کی تحریر کردہ ہے اور اس کا موجوع مولانا ابوالکلام آزاد ہے۔ ٹرول نے اس غیر مطبوعہ مقالہ خصوصی کو گیل مینو (Gail Minault) کے تعاون سے شائع کرایا (۱۹۸۸ء)۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'اسلام ان انڈیا' کے زیر عنوان ایک انتہائی مفید کتابی سلسلہ شروع کیا، جس کے تحت چار جلدیں اشاعت پذیر ہوئیں۔

ڈاکٹر ٹرول نے اپنی اس کتاب میں سرسید کے دینی تصورات ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور استخراج نتائج کے لیے انھوں نے سرسید کی متعلقہ کتب، متفرق تحریریں اور دیگر ہم عصر قابل استناد مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر موصوف مسیحیت اور اسلام خاص طور پر برصغیر میں اسلامی تحریکوں اور نامور علماے دین کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں، اس لیے وہ ان دونوں ادیان کا عالمانہ سطح پر تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ تعارف کتاب میں مؤلف نے یہ وضاحت کی ہے کہ سرسید بچپن ہی سے تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کا میلان طبع عقلیت کی جانب تھا۔ وہ 'حقیقی اسلام' کی دریافت نو کے خواہش مند تھے، جس پر صدیوں سے مختلف رسوم اور تہذیبی مظاہر نے دبیز تہیں چڑھا رکھی تھیں۔ باب اول میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سرسید شروع میں ایک ہندوستانی قوم پرست تھے۔ سرسید کے اسلام کے بارے میں لبرل اور جدید نظریات کے متعلق دور حاضر کے مختلف عالموں کے خیالات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے اگلے باب میں سرسید کی مذہبی فکر پر صوفیانہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ شاہ ولی

اللہ اوران کے دبستان سے متعلق علما اور تحریک مجاہدین کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم میں اس پس منظر کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کے زیر اثر سرسید نے تبیین الکلام قلم بند کی اوراس کے ذریعے انھوں نے انجیل کے بارے میں مسلمانوں کے معروف شکوک وشبہات اور اعتراضات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ مؤلف نے خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن کا محاکمہ بھی کیا ہے اور سرسید کے اصول تفسیر پر بحث کی ہے۔ ان تمام ابواب کے سرسری مطالعے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے سرسید کی مذہبی فکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اوران کا معروضی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ مزید برآں کتاب کے حصہ دوم میں سرسید کی اہم مذہبی تحریروں کے انگریزی تراجم کو سنہ وار ترتیب دیا گیا ہے تا کہ سرسید کی مذہبی فکر کے تمام ارتقائی مراحل کو سمجھا جا سکے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرسید کے مذہبی افکار پر ایک عالمانہ جامع کتاب ہے اوراس کے مطالعہ سے سرسید جیسی متنوع شخصیت کے مختلف تصورات اور معتقدات کو سمجھنے میں مدد ملے گی، جس کے اثرات اب بھی بعض دینی اور فکری دبستانوں پر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ٹرول کی یہ انگریزی کتاب پہلے وکاس (دہلی ۱۹۷۸ء) اور پھر آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس سے کراچی ۱۹۷۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کی اشاعت کو بیس برس سے زیادہ گزر گئے ہیں۔ اس دوران میں سرسید کے حالات زندگی اوران کی سیاسی، ادبی اور مذہبی خدمات پر بہت سی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں۔ زیر نظر اردو ترجمہ میں یہ نیا مواد بھی شامل کر دیا گیا ہے اور یوں اس کی افادیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نگریزی کتاب کے حصہ دوم میں سرسید کی انتخاب کردہ اردو تحریروں کا انگریزی ترجمہ دیا گیا تھا لیکن اردو ترجمہ میں اصل تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین ثانوی مآخذ سے نہیں لیے گیے بل کہ تہذیب الاخلاق کے مختلف شماروں سے انھیں جمع کیا گیا ہے۔ سرسید کا جاری کردہ یہ مجلہ ہمارے ہاں کے کسی کتاب خانے میں مکمل طور

پر محفوظ نہیں، اس لیے مختلف جگہوں سے انھیں تلاش کیا گیا۔ اس عمل میں بہت سا وقت صَرف ہوگیا۔ اس تلاش میں ڈاکٹر موصوف بھی قدم قدم پر تعاون کرتے رہے۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۳ء اپنے مجموعۂ تالیفات بہ عنوان تصانیف احمدیہ کا دیباچہ اس زمانے میں لکھا، جب ان کے مذہبی نظریات سخت اعتراضات کی زد پر تھے۔ اس دیباچہ میں اپنے مذہبی نظریات کے متعلق خود سرسید کی رائے کا اشارہ موجود ہے۔ بہت لوگ ہیں جو دنیا کے انقلابوں کو دیکھتے ہیں اور کم ہیں جو اس پر غور کرتے ہیں۔ مگر بہت کم ہیں جو خود اپنے خیالات کے انقلابوں کو دیکھیں اور ان کے سبب کو سمجھیں سوچیں۔ ۔ ۔ اگر کوئی شخص اپنی تمام زندگی کی باتوں کو یاد کرے اور سمجھے تو جانے گا کہ اس کے خیالات میں ایسے عجیب عجیب انقلاب ہوئے ہیں کہ ویسے دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں ہوئے۔ اگر پہلا خیال بغیر سوچے سمجھے تقلید و اعتقاد و تمدن و معاشرت کی وجہ سے قائم ہوا تھا، پھر اسی طرح اور انھی اسباب سے اس میں تقلاب ہوا ہے، تو خیال ہوسکتا ہے کہ دونوں بے ہودہ اور بے بنیاد تھے اور اگر ان دونوں کے لیے یا دونوں میں سے کسی ایک کے لیے معقول بنا تھی، تو اس کے سبب پر غور کرنا اور اس بات کو سمجھنا کہ پہلے خیالات کس بات پر مبنی تھے ور حال کے خیالات کس بات پر مبنی ہیں اور ان دونوں بناؤں میں سے کون سی بنا زیادہ ترجیح اور زیادہ تر مستحکم ہے، انسان کے لیے بہت مفید ہے۔

دنیا کے تمام خیالوں میں مذہبی خیال ایسا ہے جو انسان کے دل پر سب سے زیادہ اثر کرتا ہے۔ بہت کم برائیاں جو دنیا میں عموماً برائیاں مان لی گئی ہیں ایسی ہوں گی جن کا کرنے والا کبھی نہ کبھی ان کی برائی کو خیال نہ کرے۔ مگر یہ مذہبی خیال ایسا ہے کہ اس کے سبب سے انسان ہزاروں برائیاں کرتا ہے اور پھر کبھی اس کو برا نہیں سمجھتا۔ ایسے خیال میں کسی قسم کا انقلاب پیدا ہونا سب سے زیادہ توجہ کے قابل ہے۔

گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں ہے اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو، لیکن الّلے پن ہی سے سوچنے والی طبیعت تھی۔ جب حیوانی زندگی سے طبیعت

نے دوسری طرف پلٹا کھایا، تو اس کی کروٹ بہ جز مذہبی کروٹ کے اور کیا ہو سکتی تھی اور وہ پہلو بہ جز اس پہلو کے جو عام تھا اور جس پر سب کا یقین تھا، اور کیا ہو سکتا تھا، مگر سوچنے والی طبیعت ہر دم ساتھ تھی اور وہی تمام انقلابوں کا باعث ہوئی اور اسی نے اس سچائی تک پہنچایا جس کو میں ٹھیٹ اسلام یقین کرتا ہوں، گو کہ رسمی مسلمان اس کو ٹھیٹ کفر سمجھتے ہیں۔ اس عرصہ میں متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں، ان سب کا بہ ترتیب جمع کرنا گویا ان تمام زمانوں کے خیالات کو بہ ترتیب سامنے رکھنا ہے، جس سے شاید خود مجھ کو اور آئندہ آنے والی نسلوں کو فائدہ ہو۔ پس میں اپنی تصنیفات کے اس حصہ میں مذہبی کتابوں اور رسالوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہوں۔

اس مختصر اقتباس میں 'خوش گوار یادِ ماضی' کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنی تمام تصنیفات کی ایک ہی جلد میں اشاعت ثانی اور تصانیف احمدیہ کی تاریخ وار ترتیب کی خواہش سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں اپنے فکری اکتسابات میں مذہبی تصورات کو سب سے اہم سمجھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی مذہبی تحریروں میں بیان شدہ افکار کو ایک کُل کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اگر انھوں نے اپنے فکری ارتقا کی تفہیم کے لیے اسے اہم نہ سمجھا ہوتا تو وہ اپنی تمام مذہبی تحریروں کی تاریخ وار ترتیب کے ساتھ ایک کُل حیثیت سے اشاعت کا خیال نہ کرتے۔

سرسید احمد خاں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہبی افکار کے ارتقا کے اسباب داخلی ہیں۔ نیز اس ارتقا کی نہج، روایت اور اندھی تقلید کے علی الرغم تعقلی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا فکری ارتقا محض سماجی اور تہذیبی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اس کے بجائے، ان کے نزدیک اس جدوجہد کا مقصود اس حقیقی اسلام کی تنظیم نو میں حصہ لینا ہے، جو مابعد کے اضافوں سے پاک، خالص اور بنیادی دین ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۰ء کے بعد ۱۸۵۷ء میں بغاوتِ ہند اور اس کے اندوہ ناک واقعات کے بعد سرسید احمد خاں خاص دینیات کے میدان میں آئے، یعنی انھوں نے

دینی عقائد، تجربے اور عمل کی خالص تعقلی تعبیر کا کام شروع کیا اور اس کے تحت انھوں نے اپنے لیے یہ مقصد مقرر کیا کہ وہ نئے علم کلام یا دوسرے الفاظ میں نئی مسلم تشریحی دینیات کی تشکیل میں حصہ لیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی اعمال کی تطہیر کے متعلق سرسید احمد خاں کا اضطراب، ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ان کی جوانی ہی میں نمایاں ہونے لگا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کی چوتھی یا غالباً تیسری دہائی کے اختتام سے ہی انھوں نے اپنے بھائی کے جاری کردہ سید الاخبار میں ایسے مضامین لکھنا شروع کیے جن کا مقصد مذہبی اصطلاح تھا۔ اس وقت تک نہ تو وہ یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کا تعقلی نقطۂ نظر ہی عام ہوا تھا اور نہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مذہب سے بےزاری ہی عام ہوئی تھی۔ جب کہ یہی دونوں امور سید احمد خاں کی دینیات کی طرف توجہ کے محرک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ اس وقت بھی سرسید اپنے ملک کی معاصر صورت حال میں اسلامی مسائل کی جہات سے باخبر تھے اور انھوں نے خاص مذہبی اصطلاحات میں ان پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

موجودہ مطالعہ کو شعوری طور پر سید احمد خاں کی ان کوششوں تک محدود رکھا گیا ہے، جو انھوں نے اپنے عہد کے مطابق اسلامی دینیات کی تعبیر نو کے لیے کیں۔ پہلے باب میں پیش کردہ موزوں ثانوی مذہبی ادب (جو خاصا وسیع اور جامع ہے) کے جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کی سوانح مرتب کرنے میں اس وسیع ذخیرہ، پس منظر اور دیگر تمام معلوم مواد کو بیشتر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

س لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان زمانوں اور دشواریوں کی نشان دہی کی جائے جن میں سرسید کو غیروں کے اعتراضات اور خود اپنوں کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھوں نے ان آزمائشوں کو کس طرح دیکھا اور کیسے ان کا مقابلہ کیا یا ان میں ترمیم و اضافہ کے ذریعے اپنے نظام افکار سے انھیں ہم آہنگ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے سرسید کی بصیرت پر جو گہرے اثرات مرتب کیے، ان

سے انکار نہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ان کی دینی فکر کا آغاز اس واقعہ سے قبل ہو چکا تھا۔ بالفاظ دیگر سر سید احمد کی زندگی کی ابتدائی چار دہائیاں اس سے زیادہ توجہ کا تقاضا کرتی ہیں، جتنی اب تک ان پر کی گئی ہے۔ دینی فکر و عمل کی ایک وسیع اسلامی روایت میں سر سید کی نشو و نما اور روایتی مذہبی علوم کے مطالعہ کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافے کی خود ان کی کوششوں پر مزید غور و خوض کرنا چاہیے۔

سر سید کی دینی تصنیفات کے بنیادی محرک کی جستجو غیر ضروری ہے۔ سر سید احمد خاں اپنے مذہبی کام کو اپنی تمام اصلاحی کوششوں کا ایک ناگزیر جزو تصور کرتے تھے۔ مصنفہ کے خیال میں ان کی زندگی، معاشی، سیاسی یا سماجی تبدیلیوں کی صرف ظاہری یا ضمنی علامت نہیں بل کہ ان کی پوری حیات فکر کی سطح پر بنیادی تبدیلیوں کی تجسیم ہے، جو تبدیلی کی مذکورہ تمام انواع سے مربوط ہے۔

سی۔ ڈبلیو ٹرال نے آٹھ ابواب میں اس کتاب کو تقسیم کیا ہے۔ ابواب اور ان کے مندرجات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱۰) پندرہ اصول (جو سید احمد خاں نے علمائے سہارن پور کو پیش کیے) (۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۴ء)

(۱۱) وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت (۱۸۸۰ء)

(۱۲) وحی والہام کے متعلق ایک صاحب کے خیالات اور ان پر سرسید کا تبصرہ (۱۸۸۰ء)

(۱۳) مسلمان رفارمر

(۱۴) اسلام (۱۸۸۴ء)

(۱۵) ہوالموجود (۱۸۹۵ء)

(۱۶) خدا کا کلام (۱۸۹۷ء)

ماخذ

چند انگریزی تحریریں

وہ کتب جن کا سرسید نے 'تبیین الکلام' میں حوالہ دیا

تصانیف سرسید

حیات وافکار سرسید (اردو و انگریزی)

شاریہ

ٹرول میسحیت سمیت مختلف ادیان پر عالمانہ نظر رکھتے ہیں بالخصوص وہ مکالمہ بین المذاہب کے فروغ میں کوشاں ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کی دینی فکر کے جدید رجحانات ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اب تک وہ کئی بڑے بڑے مصلحین اور ان تحریکات پر علمی مضامین قلم بند کر چکے ہیں۔ سرسید احمد خاں کی ابتدائی اور مذہبی تحریروں کے بارے میں ٹرول کا کہنا ہے:

> ''سرسید کی ابتدائی مذہبی تحریروں سے دو خاص موضوعات سامنے آتے ہیں پیغمبر ﷺ کی فرد اور معاشرے کی مذہبی زندگی میں مرکزی حیثیت کا از سر نو تعین اور ان بدعتوں کا پردہ فاش کرنے کی خواہش جو مسلمانوں کی زندگی

میں غیر اسلامی ماحول کے باعث سرایت کر چکی ہے۔''[۱]

سر سید کی ابتدائی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ٹرول اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

''سید احمد خاں کی ابتدائی تحریروں میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کے شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں اور تعلیمات اور مجاہدین کی تحریک کے اثر سے فروغ پذیر ہم عصر ہندوستانی اسلامی افکار کی تمام جہات کا عکس اور اظہار ملتا ہے۔ان تحریروں کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت، شریعت اور طریقت کا امتزاج ہے، جو صوفیا اور علما کی روایت ہے۔''[۲]

صحائف میں تحریف کے مسئلہ کو شعوری طور پر بحث کا مرکز بنایا اور رحمت اللہ کیرانوی نے 'اعجازِ عیسوی' میں اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔سر سید لفظ تحریف کا استعمال تبدیلی، تغیر یا کسی چیز کا اپنی اصل حالت سے بدل جانا کے معنی میں نہیں کرتے بل کہ وہ تکنیکی اور اصطلاحی معنی مراد لیتے ہیں، جس کی تعریف الہامی الفاظ کو اس کے خلقی مفہوم اور اصل مقصد سے کسی اور طرف شعوری طور پر منحرف کرتا ہے۔اس لفظ سے جس عمل کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ شعوری ہے کہ قرآن نے تحریف کو گناہ کبیرہ گردانا ہے۔گناہ کبیرہ کے لیے علم ضروری ہے۔یہ شعوری ہے، ورنہ قرآن میں ان لوگوں کا ذکر نہ ہوتا، جنھوں نے یہ جرم کیا اور نہ ہی قرآن اسے گناہ کہتا۔سر سید کے نزدیک اس تعریف کی روشنی میں آٹھ طرح کی تحریف ممکن ہے۔

اس حوالے سے ٹرول کہتے ہیں:

''سید احمد خاں تسلیم کرتے ہیں کہ صحائف کے متن میں بہت سی غلطیاں اور تضادات ہیں۔کوئی کتاب اصل متن کے مطابق نہیں رہی۔یہاں ان کا اور رحمت اللہ کیرانوی کا نقطۂ نظر یکساں ہے، لیکن جہاں رحمت اللہ کیرانوی انجیل کے متن میں اغلاط اور تضادات کو تحریف لفظی کا ثبوت سمجھتے ہیں اور اس بنیاد پر انجیل کو غیر معتبر کہہ کر رد کرتے ہیں۔سید احمد کا خیال ہے کہ ان کمیوں کی توضیح، سہو یا فروگذاشت کی حیثیت سے کی جا سکتی ہے، بل کہ کی جانی

چاہیے، جو متن کے ہم تک پہنچنے کی طویل تاریخ میں سرزد ہوئیں۔''[۱۳]

قانون فطرت کا تصور بھی سرسید کی تحریروں میں پہلی مرتبہ تبیین الکلام ہی میں آیا ہے۔ یہ سرسید کا ایسا شاہ کار ہے جس میں تعقل اور قانونِ فطرت دونوں تصورات جمع ہو گئے ہیں۔ ان کی تبیین الکلام کے بعد کی تحریروں کا خلاصہ پیش کیا جائے تو کچھ یوں ہوگا:

> ''ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نیچر خدا کا کام ہے اور وحی اس کا کلام ہے اور اس کے کام اور اس کے کلام میں کبھی اختلاف ہونا نہیں چاہیے کیوں کہ ن کا ماخذ ایک ہی ہے۔''[۱۴]

سلامی دینیات کے احیا میں سرسید کی خدمات کا موازنہ ان کے نوجوان مصری معاصر محمد عبدہٗ سے کیا جائے۔ ۱۹۲۰ء میں اسلامی تجدد پر اپنی کتاب میں گولٹ تسیر (Ignaz Goldziher) نے قرآن کی اسلامی تفسیر کے طریقوں اور رجحانات پر جو اشارے کیے تھے، ان کی وجہ سے یہ خیال عام ہوگیا کہ مصر میں عبدہٗ کی اصلاحی تحریک کا بنیادی مزاج دینی تھا، جب کہ ہندوستان میں سرسید کی اصلاحی تحریک اصلاً تہذیبی تھی۔ موجودہ مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ سرسید احمد خاں کی زندگی، ان کی تصنیفات ورخطبات سے فراہم کردہ شواہد کے بعد اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اصلاح کی فکر اور دین سے تعلق ان کی زندگی میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ نیز وہ اسلامی دینیات کی اہم فصلوں کو چند اصولوں کی روشنی میں دوبارہ مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ وہ اصول تھے، جو انھوں نے کئی دہائیوں میں مرتب کیے۔ سید احمد خاں نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ توحید کو ہم عصر صورت حال میں صحیح ثابت کرنا ان کا مقصود ہے اور یہ اسلامی عقائد کو صرف یورپی فکر وعلوم کی جدید دریافتوں کے درمیان تطابق کے ذریعے ہی نہیں بل کہ ماقبل کی اسلامی تاریخ میں کی گئی کوششوں کے نمونے پر اصولوں کے مرتب نظام کے مطابق ازسرنو معقول طور پر بیان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ اپنے نمایاں طور پر نئے خیالات کی ترتیب اور اشاعت میں سرسید احمد خاں محمد عبدہٗ سے جنھیں اکثر اسلامی مذہبی فکر کا مجدد کہا جاتا ہے، تیس برس سے زیادہ آگے ہیں۔ اس وقت تک سرسید کی فکر باقاعدہ ایک صورت اختیار کر چکی تھی۔ جب ۱۸۸۵ء۔۸۸۸ ء کے دوران میں بیروت میں دیے گئے خطبات میں محمد عبدہٗ نے اپنی دینیات مرتب کی، جس کا خاکہ ان کی کتاب رسالۃ التوحید میں بیان ہوا ہے۔ یہ کتاب لیکچرز کے دس سال بعد ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ سرسید احمد خاں نے واضح مذہبی اور تفسیری اصولوں کے تحت اپنی تفسیر حقیقتاً ۱۸۷۰ء کے اواخر میں لکھنا شروع کی۔ یہ معلوم نہیں کہ محمد عبدہٗ اپنے تشکیلی دور یا کسی اور وقت، سرسید کے بنیادی مذہبی تصورات یا ان کے کسی اور اہم کام سے واقف ہوئے یا نہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے دوست جمال الدین افغانی کے مقابلے میں سرسید کی فکر سے زیادہ بہتر طور پر واقف تھے یا نہیں۔ سرسید کی تحریروں سے جمال الدین افغانی کی ناقص اطلاع کا اندازہ ان کے رسالے ہندوستان میں مادیت پرست سے ہوتا ہے، جس میں سرسید کی فکر کی مسخ شدہ شکل اور ان کی بنیاد پر عمومی فیصلے بہت نمایاں ہیں۔ یہ مضمون عربی میں العروۃ الوثقیٰ میں ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔

ٹرول اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”سرسید احمد خاں، محمد عبدہٗ کی طرح کسی بھی خدا پرست دینیات کے بنیادی سوال کے متعلق ہماری فہم میں اضافہ کرنے میں ناکام رہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کی مطلق ماورایت کی تعلیم اور اس حقیقت کے درمیان کہ اس نے پیغمبروں کے ذریعے کلام کیا، کیسے مطابقت پیدا کی جائے اور اس تطابق کی بنیاد پر ایک بامعنی دینیات کیسے مرتب کی جا سکتی ہے؟ لیکن سرسید نے پنی روایت کی حدود میں یہ نکتہ بہت موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ ہمارے زمانے میں خدا کی طرف سے الہام اور انکشاف میں عقیدہ قائم رکھنے اور یک نئی اور زیادہ برمحل دینیات مرتب کرنے کے لیے، مزید یہ کہ عظیم

وحدانیت پرست روایات کو یہ کام ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر علاحدہ علاحدہ نہیں کرنا چاہیے۔"۵!

سی ڈبلیو ٹرول کی یہ کتاب سرسید کے مذہبی افکار کا جائزہ لیتی ہے۔ انھوں نے تقابل ادیان سے سرسید کے مذہبی نظریات کو دیکھا ہے۔ ان کی یہ کتاب سرسید شناسی میں انفرادیت کی حامل ہے کہ غیر جانب دارانہ انداز میں سرسید کے مذہبی افکار پیش کرنے کسی اور کے بس کا کام نہ تھا۔

روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سرسید احمد خاں، زاہد چودھری (۱۹۹۹ء)

ادارہ مطالعۂ تاریخ کے زیر اہتمام یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب کی تکمیل و ترتیب میں زاہد چودھری کا ساتھ حسن جعفر زیدی اور خالد محبوب نے دیا۔ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

باب ۱ ۱۸۵۷ء کا آشوب اور مسلمانوں کا نجات دہندہ
باب ۲۔ سرسید کا دورہ انگلستان اور علی گڑھ تحریک کا آغاز
باب ۳۔ زبوں حال مسلم اشرافیہ اور سرسید بہ طور ممبر وائسرائے کونسل
باب ۴۔ وسیع المشرب (سیکولر) سرسید اور ہندو مسلم تضاد
باب ۵: انڈین نیشنل کانگرس کی سیاسی تحریک سے سرسید کا اختلاف
باب ۶: کیا سرسید انگریز نواز تھا؟
باب ۷۔ کیا سرسید تحریک پاکستان کا قائد اول تھ؟
باب ۸۔ سرسید کا علی گڑھ کالج سے لگاؤ اور نظریہ تعلیم
باب ۹۔ سرسید کی جانب سے کثیر الاقوام برصغیر میں پارلیمانی نظام کی مخالفت
باب ۱۰: قومی یک جہتی اور بے داری سے مایوس سرسید کے آخری سال
باب ۱ : مسلمانوں کا محسن اعظم سرسید، روایتی مذہبی نظریہ کا مخالف

اس کے علاوہ حوالہ جات، کتابیات، فرہنگ اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ دیباچہ مصنف کے رفیق کار حسن جعفر زیدی نے تحریر کیا ہے۔ زاہد چودھری ایک مورخ ہیں انھوں نے ۱۹۷۷ء میں تاریخ نویسی کا آغاز کیا۔ پاکستان کے اوائل برسوں کی سیاسی تاریخ رقم کی۔ ان کی ان تھک کوشش اور محنت جاری تھی کہ ۱۹۸۴ء میں ان کی بینائی جواب دے گئی۔ اس کے بعد وہ صرف ایک سال زندہ رہا لیکن تخلیقی قوت ایک سال بہ دستور قائم رہی۔ اس مختصر عرصے میں کم و بیش دو سو غزلیں کہیں جو اس عہد کے استبداد اور ظلم و جور کے خلاف زبردست مزاحمتی ادب کا درجہ رکھتی ہیں۔ زاہد چودھری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مطالعہ، تاریخ کو ایک سائنس کے طور پر متعارف کروایا۔ وہ ہر قسم کی عقیدہ پرستی کے خلاف تھے۔ خواہ وہ دائیں بازو کی ہوں یا بائیں بازو کی۔ اس سے بیشتر یہاں کے ترقی پسند حلقوں میں فقط طبقاتی تضاد کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ زاہد چودھری نے قومیتی تضاد اور قومی تضاد کی اہمیت کو اپنے منفرد انداز میں اُجاگر کیا۔ ان سے کسب فیض کرنے والے نامور سیاست دانوں، دانش وروں اور صحافیوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے سر سید کی تحریک کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک روشن خیال، ترقی پسند اور وسیع المشرب شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ مصنف نے سر سید کے مذہبی افکار جو سب سے زیادہ قابل اعتراض ہیں انھیں چھوا تک نہیں اور سر سید کے انگریز نواز ہونے یا نہ ہونے کی قابل اعتراض بحث خوب کی ہے۔ اس کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس جیسی سیاسی تحریک سے سر سید کے اختلافات کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے اور اپنی رائے قائم کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سر سید احمد خاں کو اس نصب العین سے اتفاق تھا لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ اس نصب العین کو پورا کرنے سے پہلے مسلمانوں کو ترقی کی اس سطح پر لایا جائے جس سطح پر ہندو پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہ قبل ازیں اپنے سفر پنجاب

کے دوران بارہا کہہ چکا تھا کہ اگر ترقی کے معاملے میں مسلمانوں اور
ہندوؤں میں یکسانیت پیدا نہ کی گئی تو ان دونوں کے درمیان بے گانگی قائم
رہے گی اور یہ بات ہندوستان کی بھلائی کے راستے میں رکاوٹ بنے گی وہ
پہلی ۱۶ جنوری ۱۸۸۳ء کی تقریر میں بھی یہی بات کہہ چکا تھا۔''۷۶

ملک کے رئیسوں کے بارے میں حکومت ہند کی پالیسی پر ابتدائی تبصرہ کے بعد سر سید احمد خان نے اپنی تقریر میں برطانوی راج کی برکتوں کا ذکر کرتے ہوئے انڈین نیشنل کانگرس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مطالبات پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لیے گئے تو پورے ہندوستان میں ہندوؤں، بالخصوص بنگالیوں کا غلبہ قائم ہو جائے گا جسے مسلمان اور دوسری اقوام برداشت نہیں کریں گی۔

زاہد چودھری اس بارے میں کہتے ہیں:

''ادنیٰ اور اعلیٰ کے درمیان امتیاز کا یہ نظریہ سر سید احمد خان کے جاگیردارانہ نظریے کا آئینہ دار تھا لیکن یہ اس وقت کے ہندوستانی پس ماندہ معاشرے کی معروضی حقیقت کا بھی مظہر تھا۔ اس نے اپنا یہ نظریہ پیش کرنے کے بعد ہندوستان کی مختلف اقوام کے باہمی تضادات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص اس اصول کو سمجھ سکتا ہے کہ سب سے اوّل وہ ملک مقابلے (Compitition) کے امتحان کے لیے مناسب ہے جس ملک میں ایک قوم بستی ہے اور تمام لوگ موچی سے لے کر ڈیوک تک ایک قوم کے ہیں۔ ان میں مقابلے کا امتحان جاری کرنا کچھ مشکلات پیدا نہیں کرتا کیوں کہ کوئی مستغیث بنے یا حاکم بنے، کسی شخص کو اس سے ناراضی نہیں ہو سکتی۔''۷۷

سر سید احمد خاں کی لکھنؤ اور میرٹھ کی تقریروں اور اس کے ان دونوں بیانات پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کے اس وقت کے سیاسی خیالات و نظریات کے جو نقوش دکھائی دیتے ہیں ان میں سے نمایاں ترین نقش یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اس عظیم لیڈر کو اپنے ہم مذہبوں کے ہمہ جہت زوال و پس ماندگی، نکبت و ادبار اور افلاس و

جہالت کا بہت دکھ تھا۔ زاہد چودھری کا کہنا ہے:

"وہ ہنگامہ غدر میں اضلاع شمال مغرب کے مسلمان نوابوں، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور دوسرے رئیسوں کی تباہی و بربادی پر آنسو بہاتا تھا اور پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی من حیث القوم خیر خواہی کے بے پناہ جذبے سے سرشار تھا۔ وہ مسلمانوں کو بنگالیوں اور مرہٹوں کی قوموں کی طرح کی ایک قوم تصور کرتا تھا۔ اگرچہ اس کا یہ نظریہ قومیت اس کے ۱۸۸۴ء کے نظریہ وطنی قومیت سے بالکل مختلف تھا تاہم اس کی بنیاد مذہب پر نہیں تھی۔ وہ ملاؤں کے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کے تصور کو نہیں مانتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ برصغیر میں کبھی اسلامی نظام رائج نہیں ہوا تھا کبھی کوئی اسلامی سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی آئندہ کبھی ایسا ہونے کی کوئی امید تھی۔"[۱۸]

سرسید کی جانب سے کثیر الاقوام برصغیر میں پارلیمانی نظام کی مخالفت کے عنوان سے قائم کردہ عنوان میں زاہد چودھری سرسید کی سیاسی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ سرسید نے دنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ کے حوالے دے کر اپنے اس موقف کی مزید وضاحت کی کہ جس ملک میں مختلف مذہبی، نسلی اور ثقافتی قومیتیں آباد ہوں اور جہاں مختلف مفادات میں زبردست ٹکراؤ ہو وہاں خالص پارلیمانی نظام حکومت رائج کرنا ممکن نہیں۔ اس نے لکھا کہ یونان اور روم کی قدیم جمہوری سلطنتوں کی شان و شوکت باوجود ان عظیم فتوحات کے جو مسلمانوں کو نیم جمہوری سلطنت میں پہلے خلفا کے عہد خلافت میں حاصل ہوئیں لیکن زمانہ حال میں سوائے اینگلوسیکسن یا برٹش اقوام کے جن میں یونائیٹڈ اسٹیٹ امریکہ اور آسٹریلیا و نیوزی لینڈ کی کالونیاں شامل ہیں کسی اور قوم کی جمہوری سلطنت میں کامیابی نہیں ہوئی۔

قومی یک جہتی اور بے داری سے مایوس، سرسید کے آخری سال کے عنوان سے قائم کردہ باب میں زاہد چودھری نے سرسید کی قومی بیداری کی کاوشوں کو موضوع بنا کر

انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''وہ کہتا تھا کہ انسان کے قویٰ جب ضعیف ہو جاتے ہیں اور اعتدال مزاج درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم کا ہوتا ہے۔ جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بل کہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، دیانت داری، سویلیزیشن، دولت، تمکنت، متانت سب چیزوں میں تنزل ہوتا ہے اور جو لوگ اس کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس کس چیز کا علاج کریں۔'' ۱۹

قیام پاکستان کے بعد سرسید کی تحریک کے اس ترقی پسندانہ پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جاگیردار، حکمرانوں، رجعت پسند سول و فوجی بیوروکریسی اور دقیانوسیت کا شکار درمیانہ طبقہ اپنے عارضی مفادات کے پیش نظر فرسودگی، دقیانوسیت اور ملائیت کو فروغ دینے لگ گیا۔ لیاقت علی خاں سے لے کر نواز شریف تک تمام حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر یہی لائحہ عمل اختیار کیا۔ جدت فکر، آزادیٔ فکر و اظہار، روشن خیالات اور افکار تازہ پر پہرے بٹھائے گئے۔ تعلیمی ادارے، ابلاغ عامہ کے ادارے، عدالتی ادارے، سیاسی ادارے، غرض یہ کہ ملک کے ہر ادارے میں رجعت اور دقیانوسیت کو مسلط کر دیا گیا۔ سرسید کے ساتھ یہ ظلم تو حکمران طبقوں نے کیا لیکن اس کے ساتھ دوسرا ظلم یہاں کے نام نہاد ترقی پسند حلقوں نے کیا جنھوں نے کانگرسی مورخین کے پروپیگنڈے کے زیر اثر سرسید کو انگریزوں کا پٹھو قرار دے کر اسے یکسر بھلا دیا۔ اس پر کوئی کام نہیں کیا اور اس کے روشن اور ترقی پسندانہ خیالات کو عوام کی فکری تعلیم کے لیے استعمال نہیں کیا۔ سرسید نے قریباً سو سال قبل دقیانوسیت اور ملائیت کے خلاف جس نڈر، بے باک اور دلیر رویے کا مظاہرہ کیا، آج کے نام نہاد ترقی پسند اور اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ اس نے اپنے مقالات اور تفسیر قرآن مجید میں دقیانوسیت اور کٹر ملائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس پر نیچری کافر، زندیق اور ملحد ہونے کا الزام لگا لیکن چوں کہ اس نے مسلم عوام کی مادی ترقی کے لیے خلوص دل سے

کام لیا اس لیے مسلم رائے عامہ نے فتویٰ فروش ملاؤں کی پرواہ نہ کی اور سرسید کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ کم و بیش یہی طرزِ عمل قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں بھی دہرایا گیا اور پھر ۷۰۔۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک میں ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستانی پیپلز پارٹی کے حوالے سے بھی عوام کے اس طرزِ عمل کا مظاہرہ ہوا۔ اگرچہ جلد ہی ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کو دھوکہ دیا اور جاگیرداروں اور ملاؤں کو سر پر چڑھا کر عوام الناس کی امنگوں کا خون کیا لیکن علمۃ الناس کا یہ رویہ تاریخ میں بار بار اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی ترقی پسندانہ قیادت ان کے دکھ درد کا مداوا لے کر آگے آئے تو وہ فتویٰ فروش ملاؤں کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتے۔ آج کے زوال پذیر پاکستان کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایسی ہی ترقی پسندانہ قیادت کی ضرورت ہے جو سرسید اور قائداعظم محمد علی جناح کی روشن خیالی، ترقی پسندی اور جدتِ فکر کے لائحہ عمل کو لے کر آگے بڑھے۔ زیرِ نظر کتاب میں زاہد چودھری نے سرسید کی تحریک کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ ایک روشن خیال، ترقی پسند اور وسیع المشرب شخصیت کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

مسلمانانِ برصغیر کے محسن اعظم سرسید احمد خان، جمیل یوسف (۲۰۰۲ء)

یہ کتاب کتاب ورثہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا انتساب مصنف نے تحریک پاکستان کے نام کیا ہے۔ بیرونی عقبی صفحہ پر جمیل یوسف نے مختار مسعود کی کتاب ''حرفِ شوق'' سے ایک اقتباس تحریر کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں سرسید تحریک پاکستان کا معمارِ اوّل قرار دیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر تحسین افروز ہے۔ سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خان تحریک پاکستان کا وہ اہم موڑ اور وہ نمایاں ترین سنگ میل ہیں جو نہ صرف راستے کا تعین کرتا ہے بل کہ منزل کا سراغ بھی دیتا ہے۔

سرسید ہی نے اس راستے کی صورت گری کی جس پر چل کر بعد میں آنے والے قائدین، قیام پاکستان کی منزل تک پہنچے، بل کہ انھوں نے دل شکستہ ،ور ہمت ہارے ہوئے بے یار و مددگار مسلمانوں کو اس کٹھن راستے پر سرگرم سفر ہونے کے لیے بھی تیار کیا۔ علی گڑھ کی عظیم درس گاہ دراصل تحریک پاکستان کے ہراول دستے کی تربیت گاہ تھی۔ یوں محمد علی جناح اگر برصغیر کے مسلمانوں کے قائداعظم تھے تو سرسید احمد خان کو بجا طور محسن اعظم کہنا چاہیے۔'' [۲۰]

اس کتاب میں جمیل یوسف نے مولانا حالی کی کتاب ''حیاتِ جاوید'' کو بنیادی مآخذ ،نا ہے۔ جگہ جگہ ''حیاتِ جاوید'' سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مطالعۂ سرسید احمد خاں از مولوی عبدالحق سے استفادہ کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جمیل یوسف نے مذکورہ بالا کتب کو سامنے رکھ کر انتخابات شامل کر کے ایک نئی کتاب تشکیل دے دی ہے۔ وہ سرسید کالج واہ کینٹ میں پرنسپل رہے ہیں۔ اس لیے سرسید اور ان کے افکار کی تحسین کو ضروری سمجھا اور صرف وہی واقعات پیش کیے جن سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سرسید پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں انگریزی سیکھے بغیر مسلمانوں کے لیے ترقی کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھانا بھی ناممکن تھا، مگر مسلمان انگریزی کا نام تک سننے کو تیار نہ تھے۔ اس گہری نفرت اور اندھے تعصب کے خلاف آواز بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سرسید احمد خان نے اس انتہائی مشکل بل کہ قریب قریب ناممکن کام کا بیڑا اٹھایا۔'' [۲۱]

جمیل یوسف کی تالیف پڑھ کر یہ گماں ہوتا ہے کہ انھوں نے تاثراتی اور تحسینی انداز اختیار کیا ہے۔ تبیین الکلام کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''ان کو خیال آیا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس سے ثابت ہو کہ بائبل

ور قرآن، دونوں آسمانی کتابیں، بیشتر معاملات اور اکثر نکات میں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ خود بائبل سے قرآن حکیم کے آسمانی کتاب ہونے کی تائید ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی بہت سی آیات بائبل کے حق میں گواہی دیتی ہیں۔ یہ جو مسلمان علما تحریفِ لفظی کی بنیاد پر موجودہ بائبل کو سراسر غلط سمجھتے ہیں یا عیسائی علما جو قرآن حکیم کو سرے سے آسمانی کتاب ماننے سے ہی انکاری ہیں سرسید چاہتے تھے کہ ان دونوں کی گمراہی کی صلاح کی جائے۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیے سرسید نے بڑی محنت سے بائبل کا تفصیلی مطالعہ کیا، بائبل پر لکھی ہوئی کئی تفسیریں پڑھیں۔ اس سلسلے میں سرسید کے شوق اور محنت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے عبرانی زبان سے بھی واقفیت پیدا کی تا کہ بائبل کو اصل عبرانی زبان میں پڑھیں اور یہ دیکھیں کہ عیسائیوں نے اس کی تفہیم میں کہاں کہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔"[۲۲]

غرض یہ کہ مصنف کے ہاں ایک سادہ سا اندازِ تحریر نظر آتا ہے۔ ناقدانہ نظر کی کمی اور ستائشی اسلوب غالب ہو گیا ہے۔ ان کی یہ کاوش ایک لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے سرسید کو اپنے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے تحسینی انداز اپنایا ہے۔

علی گڑھ تحریک کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، مظہر حسین، (۲۰۰۲ء)

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) نے نئی دہلی سے کیا۔ ۳۰۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اس کے اثرات اور ردِ عمل، اس کتاب کے غالب موضوعات ہیں۔ علی گڑھ تحریک کا مطالعہ ۵۸-۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ بغاوت روایتی اور زوال آمادہ مشرقی معاشرہ اور سائنسی ایجادات پر مبنی ترقی یافتہ اور سرمایہ دارانہ مغربی تہذیب کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس میں مغرب کی فتح نے

مشرق کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا اور سرسید اور دیگر ہندوستانی دانش وروں کی نظر میں مغرب کی برتری ثابت کر دی اور انھوں نے سنجیدگی سے یہ محسوس کیا کہ ہندستانی عوام کی نجات اسی میں ہے کہ وہ تعلیم اور تہذیب کے بارے میں ایسا موقف اختیار کریں جو جدید، مغربی اور سائنسی ہو۔ اس تحریک کے روح رواں سرسید کے ذہن میں تبدیلی یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں انھوں نے مسلم معاشرے کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہا اور انھی خطوط پر اس کی اصلاح کا ارادہ کیا۔ اس لیے پہلے باب میں ان امور سے بحث کی گئی ہے کہ اس بغاوت کی نوعیت کیا تھی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت کیسی تھی۔ اس کے بعد انگریزوں نے ہندستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی جانب کیا پالیسی اختیار کی۔ مسلمان اس کے نتیجے میں کس طرح متاثر ہوئے اور وہ کن علاقوں کے مسلمان تھے۔ دوسرا باب سرسید کی ان کوششوں سے متعلق ہے جو انھوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کے سلسلے میں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ترقی تب ہی ممکن ہو سکتی ہے جب وہ انگریز عیسائی حکام سے دوستی اور مصالحت پیدا کریں۔ سرسید کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ انھوں نے ہر انگریزی چیز کی حمایت کی اور اسی کو مسلم معاشرت، تہذیب اور ترقی کا معیار قرار دیا۔ تیسرے باب میں بنیادی مواخذ کی روشنی میں اسی خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کا معیار دراصل اسلامی شرع کو قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں وہ معاشرے کی اصلاح چاہتے تھے۔ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر بنیادی طور پر سرسید اور ان کے چند رفقا نے مذہب اسلام کو عقلی، فطری اور حقیقی ثابت کرنے کی غرض سے اس کی تطبیق عقل، فطرت اور کبھی کبھی کچھ حد تک سائنس سے کی، جس کا مقصد تھا اسلام میں تعلیم یافتہ روشن خیال مسلم نوجوان کے یقین کو برقرار رکھنا اور یہ ثابت کرنا کہ یہ مذہب ترقی کا مخالف نہیں ہے بل کہ اس کے عین موافق ہے۔ ان کے مذہبی خیالات کا تجزیہ چوتھے باب میں پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب بنیادی طور پر دو امور پر محیط ہے۔ اول اس میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ سرسید، سلیکٹ کمیٹی کے ممبران اور مسلم دانش وروں کے نزدیک مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کے کیا اسباب تھے۔ دوم، مختلف صوبوں کے انگریز تعلیمی افسران نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق اعداد و شمار کی روشنی میں کس طرح سے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

چھٹے باب میں مسلمانوں کی تعلیم سے علی گڑھ تحریک کے منصوبے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ان امور سے بھی بحث کی گئی ہے کہ عورتوں کی تعلیم کی جانب اس کا رویہ کے ساتھ اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اس تحریک نے جس قسم کا شان دار تعلیمی منصوبہ بنایا تھا اس کا متحمل کون سا طبقہ ہوسکتا تھا۔ اس باب میں علی گڑھ سے فارغ مسلم گریجوایٹوں کی تعداد کا دیگر سیکولر تعلیمی اداروں سے فررغ مسلم گریجوایٹوں کی تعداد سے بھی موازنہ کیا گیا ہے۔ اسی باب میں حالی، شبلی اور نذیر احمد جیسے پائے کے ادیبوں کے تعلیمی نظریات کا بھی بہت ہی مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور یہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم عورتوں اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ان شاعروں اور ادیبوں کے کیسے خیالات تھے۔

ساتویں اور آخری باب میں ان اُمور پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے نزدیک قوم کی کیا بنیاد تھی، کیا ہندوستان میں بسنے والے مختلف مذہبی فرقوں کے لوگ ایک قوم تھے، علی گڑھ تحریک نے جتنی بھی تدابیر اختیار کیں ان کا واحد مقصد تھا مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور ترقی۔ اسی مقصد کے پیش نظر سرسید نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار بنانے کی پالیسی اختیار کی کیوں کہ ان کے خیال میں یہی پالیسی مسلمانوں کی ترقی کی ضامن تھی لیکن جب کانگریس کی سیاسی سرگرمی بڑھی تو سرسید کو یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان برطانوی حکومت کی وفاداری چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ اس لیے سیاست کے میدان میں سرسید اور ان کے رفیقوں اور جانشینوں نے کانگریس مخالف اور علاحدگی پسند پالیسی اختیار کی۔ لیکن حالی، شبلی اور نذیر احمد کے سیاسی میلانات پر غور کرنے سے علی گڑھ تحریک کی سیاسی تصویر

کا ایک مختلف اور تابناک رخ بھی سامنے آتا ہے۔ اس باب میں ان ادیبوں اور شاعروں کے سیاسی رویوں کو مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ادیبوں اور شاعروں کے سماجی اور سیاسی میلانات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے ور سرسید کے افکار سے ان کا موازنہ کیا جائے۔ نتائج یا خلاصہ بحث کے لیے دانستہ طور پر الگ سے کوئی باب قائم نہیں کیا گیا ہے، کیوں کہ بحث و مباحثہ اور تجزیے کے عمل میں اور ہر باب کے آخر میں یہ باتیں لکھی جا چکی ہیں اس لیے ان چند جملوں یا چند صفحات میں انھی باتوں کی تکرار غیر ضروری تھی۔

سرسید کی انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کی مصالحت اور وفاداری کے باب میں مظہر حسین لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی بغاوت نے سرسید کی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ آج جس سرسید کی باتیں کی جاتی ہیں اس کا ظہور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پس منظر میں ہوا۔ گر یہ بغاوت نہ ہوتی تو ان کی علمی اور فکری سرگرمیوں کا رُخ کسی اور سمت بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ محض تاریخ اور تحقیق کے میدان میں ہی رہتے ہیں جس سے ان کی گہری دل چسپی کا پتہ آثار الصنادید اور آئین اکبری کے ترجمے سے چلتا ہے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کی قلب ماہیت کر دی۔''[۲۳]

مظہر حسین نے زیادہ حیاتِ جاوید، سیرت فریدیہ اور تاریخ سرکشی ضلع بجنور کو ابتدائی ماخذ مانا ہے۔ حوالے کے طور پر انھی کتب سے اقتباسات پیش کر دیے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی پسماندگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی پسماندگی کی ایک اور وجہ ان میں رائج تعصب تھا۔ ان کے نزدیک تعصب ہی وہ سبب تھا جو ان کو پنے پرانے روایتی رسم و رواج کے بندھن میں جکڑے ہوئے تھا اور یہی مذہب قوموں کے رسم و رواج کو اپنانے میں اس کے مانع آتا تھا۔ سرسید کا

خیال تھا کہ ہندستان کے مسلمان تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔۔۔‘‘[۲۴]

علی گڑھ تحریک سے کسی نہ کسی صورت سے وابستہ نذیر احمد، حالی اور شبلی جیسے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں نے بھی اپنے طور پر مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ پیش کیا۔ سرسید کی طرح ان شاعروں اور ادیبوں میں ایک شے جو مشترک نظر آتی ہے وہ ہے ان کا یہ عقیدہ کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں اور سماجی طور سے پس ماندہ ہیں، مسلمانوں میں رائج روایتی نظام تعلیم بدلے ہوئے حالات میں فرسودہ ہو چکا ہے اور وقت کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی تعلیم دی جائے جو وقت اور حالات کے مطابق ہو کیوں کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی پسماندگی سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

مظہر حسین نے انگریزی حکومت کے قیام کے نتیجے میں ہندستانی معاشرے کو جن تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا ان کے بارے میں ان الفاظ میں رائے دی ہے:

’’انگریزی حکومت کے قیام کے نتیجہ میں ہندستانی معاشرے کو مختلف قسم کی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا، جو اس کے لیے بالکل نئی تھیں۔ رسل اور رسائل کے میدان میں ریل، ڈاک اور تار کے رواج نے وقت اور فاصلے کے فرق کو بڑی حد تک کم کر دیا۔ زراعت اور صنعت وحرفت کے میدان میں نئے مشینی ذرائع پیداوار کے رواج دینے سے سماجی رشتوں میں تبدیلی پیدا ہوئی، جس نے سائنس اور مشینوں کی برتری ثابت کر دی۔ سائنسی تحقیقات، مشینی ایجادات اور نو ایجاد مشینوں کی آمد نے یہاں کے دانش دروں پر اپنی عظمت کا نقش چھوڑا اور ان کو بھی غور وفکر کی دعوت دی۔‘‘[۲۵]

سرسید نے دراصل عبوری دور میں پرورش پائی تھی۔ اس دور میں جاگیردارانہ

اقدار شکست و ریخت سے دوچار تھیں اور سرمایہ دارانہ جمہوری نظام اور اقدار اپنا سر اٹھا رہی تھیں۔ اس لیے سرسید کی شخصیت میں دونوں نظام کی اقدار کے عناصر نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اقدار کی سطح پر اپنے ماضی سے مکمل طور پر الگ نہیں ہو سکے تھے اور دوسری طرف وہ جدید اقدار کو بھی پورے طور پر اپنے اندر داخل نہیں کر سکے تھے لیکن چوں کہ ان کا بنیادی سروکار مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی ترقی سے تھا اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ان کی تعلیمی پس ماندگی اور مروجہ مذہبی عقائد بھی آڑے آتے تھے اس لیے انھوں نے چاہا کہ تعلیم اور مذہب کے میدان میں مسلمان زمانے کی رفتار کا ساتھ دیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی یہی تعلیمی پسماندگی سیاست اور سرکاری نوکری کے میدان میں ان کی نااہلی کا باعث تھی۔ اس لیے سرسید نے اشرافیہ طبقے کے مفاد کے پیش نظر سیاست کے میدان میں جمہوری اداروں کی ناقدری اور نسلی برتری جیسی پرانی اور دقیانوسی قدروں کو افضل ٹھہرایا اور سرکاری نوکری کے لیے ہندستان میں امتحان کے رواج کی مخالفت کی۔ نھوں نے کہا کہ جیسا کہ کانگریس کا مطالبہ ہے کہ سول سروس کا امتحان ہندستان میں بھی شروع کیا جائے اگر ایسا ہوا تو ادنی ذات کے بی۔اے، ایم۔اے، بھی حاکم بن سکتے ہیں جسے ہندستان کے امرا اور شرفا پسند نہیں کر سکتے۔

مظہر حسین نے اس حوالے سے سرسید کی جو رائے رقم کی ہے، ملاحظہ ہو۔

> ’’کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گو وہ لائق بھی ہو اُن پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو، کبھی نہیں۔ کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔۔۔ مگر غور کیجیے کہ مقابے کے امتحان کا اصول جو ولایت میں ہے اس کا نتیجہ کیا ہے۔۔۔ ولایت میں ہر شخص اعلیٰ و ادنیٰ ڈیوک اور اَرل یا کسی جنٹلمین و شریف خاندان کا بیٹا اور ایک درزی یا کسی ادنی درجہ کے خاندان کا بیٹا برابر امتحان دے سکتا ہے۔۔۔ لیکن

نگلستان سے جو آتے ہیں وہ ہماری آنکھ سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ لارڈ کے بیٹے یا ڈیوک کے یا ایک درزی کے۔۔۔لیکن ہندستان میں یہ خیال نہیں ہے۔ ہندستان کی شریف قومیں ہندستان کے ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گے۔"۲۶

بالغرض مظہر حسین نے علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو پوری طرح سمجھا ہے اور انیسویں صدی کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تناظر میں سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کو پیش کر کے ہمارے عہد میں سرسید کی معنویت کو اُجاگر کیا ہے۔ سرسید پر شائع ہونے والی کتابوں میں موضوعات کے اعتبار سے اپنی طرز کی اکیلی کتاب ہے۔

سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، ڈاکٹر ظفر حسین (۲۰۰۳ء)

نھوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں سرسید اور حالی کے تصورِ فطرت کو موضوع بنایا ہے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے اس مقالے کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر حسن کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کی سرسید شناسی کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت ہے۔ سرسید شناسی کے حوالے سے اس مقالے میں باب چہارم کے ذیلی عنوان سرسید احمد خاں سرسید کی شخصیت اور ذہنی ارتقا پر بحث کی ہے۔ باب پنجم سرسید نے فطرت کا مغربی تصور کیوں اختیار کیا کے عنوان کی ذیل میں سرسید کے تصورِ فطرت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ باب ششم سرسید کی تحریروں سے اقتباسات لے کر ان کے نظریہ فطرت کی تعبیر، فقہ اور معاشرے میں استعمال کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ باب ہفتم میں سرسید کے نظریہ فطرت کے دیگر تحریکوں پر اثرات کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سرسید کی شخصیت اور تحریروں میں نظریہ فطرت کی کارگزاری اور تضادات کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ سرسید کے نظریہ

فطرت کی حقیقت ڈاکٹر صاحب کے تصور کے مطابق درج ذیل نکات کی صورت میں واضح کی جاسکتی ہے:۔

۱۔ برصغیر میں مغربی افکار (تصورِ فطرت) کی مقبولیت کے محرکات

۲۔ سر سید کا نظریہ فطرت

۳۔ تفسیر، فقہ، معاشرے اور ادب میں نظریہ فطرت کا استعمال

۴۔ سر سید کے تصورِ فطرت کے تسامح کے اسباب [۲۷]

مؤلف نے، سر سید کے نظریہ فطرت کو اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے نظریات اور رجحانات کے اثرات کا عکاس قرار دیا ہے۔ مذکورہ صدیوں کے رجحانات کا احاطہ مؤلف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۔ میانہ روی، عقل پسندی، خرد دوستی اور جدید تعلیم پر زور دیا گیا۔

۲۔ تمام فلسفے کی بنیاد عقل اور استدلال پر رکھی گئی۔

۳۔ نئی اور مثالی دنیا کی تلاش شروع ہوئی۔

۴۔ نظریہ حیات کا آلۂ کار تحلیلی طریقہ کار کو قرار دیا گیا۔

۵۔ روایت کو ٹھکرا دیا گیا۔

۶۔ مذہب کی بنیاد اخلاقی قوانین پر رکھی گئی۔[۲۸]

ڈاکٹر ظفر حسن نے سر سید کے نظریہ فطرت کی پیش کش میں چند لغزشوں کی نشان دہی بھی کی ہے:

۱۔ سر سید کے نظریہ فطرت نے وحی کو غیر ضروری قرار دیا۔

۲۔ اس کے ساتھ ہی معلومات کو علم کے مساوی کر دیا۔

۳۔ سر سید نے نیکی اور بدی کو نیچر کا تقاضا کہا ہے۔

۴۔ سر سید نے اللہ تعالیٰ کے احکامات، قرآن اور شریعت کو مظاہر کائنات اور موجوداتِ عالم کا مساوی ٹھہرایا اور اس طرح مادیت پرستی کی ترغیب دی۔

۵۔ اسلام کے احکامات کو سرسید نے فطرت سے ہم آہنگ کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسلام کے احکامات اور واجبات جو کہ واضح اور صریح ہیں انھیں ''فطرت'' سے ہم آہنگ اور وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو نہ صرف غلط ہے ورغیر ضروری بھی۔ اسلام کے وجود یا پرچار کے لیے کسی خارجی کمک یا سہارے کی ضرورت پہلے نہ تھی۔'' [۲۹]

۶۔ سرسید نے مذہب کو اخلاقیات سے گڈمڈ کر دیا۔

۷۔ جب سرسید پر اعتراض کیا گیا اور نیچری کہا گیا تو سرسید نے فخر محسوس کرنا شروع کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب بعض لوگوں نے سرسید کے افکار کو قبول کرنا شروع کر دیا اور ان کے مقلدوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تو علما نے ان کی غلط تفسیروں پر اعتراض شروع کیا۔ معترضین یہ کہتے تھے کہ سرسید اسلام سے الگ ایک مذہب ایجاد کر رہے ہیں۔ مخالفین نے سرسید اور ان کے مقلدوں کو ''نیچری'' کہنا شروع کیا۔ سرسید نے یہ لقب بڑے فخر کے ساتھ قبول کر لیا۔'' [۳۰]

۸۔ نیچر کا درجہ انبیا سے بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ خدا کو بھی نیچری قرار دے دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سرسید کے تصورِ فطرت کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ ان اسباب کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی تالیف میں مختلف مقامات پر بیان کیا ہے جنھیں شق وار تحریر کیا جا رہا ہے:

۱۔ ان کا تحصیلِ علم کا رسمی سلسلہ ادھورا رہ گیا۔

۲۔ سرسید نے قیامِ انگلستان میں نہ صرف مغربی تہذیب اور معاشرے سے گہرا اثر قبول کیا بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت ہی بدل گئی۔

۳۔ سرسید کی زندگی میں کئی ایسے واقعات بھی ہیں جن کے سمجھنے سے فہم قاصر ہے۔

۴۔ ان کے ذہن میں مغرب و مشرق کی فکر نے گڈمڈ ہو کر تضاد پیدا کر دیا ہے۔

۵۔ سرسید نے علما کو جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتویٰ کو جائز جانا انھیں ''پاجی'' اور ''جاہلوں'' کے نام سے منسوب کیا۔

۶۔ سرسید کی تمام ادبی، مذہبی اور ایک حد تک سیاسی اور سماجی موضوعات پر جو تحریریں ہیں ان میں کئی قسم کی دقتیں اور الجھنیں پائی جاتی ہیں۔

۷۔ جن حوالوں کا وہ ذکر کرتے ہیں ان کی ہر وقت سند نہیں ہوتی۔طرز تحریر میں پائیداری نہیں ملتی۔

۸۔ مذہبی مقالات میں معقولات پر انحصار سرسید کے مضامین کی خاص صفت ہے۔

۹۔ جذبات کی رو میں انھیں اکثر عام عقائد اور روایت کا پاس نہ رہا۔

۱۰۔ ان کے مضامین کا طرز تحریر ایڈیسن اور سٹیل سے ماخوذ ہے۔

۱۱۔ ''فطرت'' کو سرسید نے رفتہ رفتہ سماجی، اخلاقی اور دینی مسائل میں داخل کر کے ایک ایسی روش اختیار کی کہ اسلام کے مخلص بندے حیران اور پریشان رہ گئے۔

۱۲۔ سرسید نیچری تھے اور نیچر پرستی کے تصور کو انھوں نے اس وقت اپنایا تھا، جب یورپ کی قومیں اسے خیرباد کہنے لگی تھیں۔

۱۳۔ سرسید کی تحریریں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی صحت، تعداد اور استناد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل کام ہے۔ بہت سی کتابیں، مضامین اور رسائل جو ان کے نام سے منسوب ہیں، ان کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ انھی کی ہیں یا کسی اور کی۔

۱۴۔ وہ موجودہ دور کی اشتہار بازی کے اس اصول پر عمل کر رہے ہیں کہ بات چاہے جھوٹی ہو، لیکن بار بار دہرائی جائے تو لوگوں کو یقین آنے ہی لگتا ہے۔

۱۵۔ سرسید ہر وقت مغربی اقوام کے معاشرے سے اتنا مرعوب رہا کرتے تھے کہ انھیں یقیناً ایک طرح کا احساس کمتری تھا۔[۳۱]

مؤلف نے ڈاکٹر ظفر حسن کے مقالہ کا تجزیہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی

ہے، ملاحظہ کیجیے:

''ڈاکٹر ظفر حسن نے سر سید شناسی کی روایت میں اپنے منفرد انداز میں اضافہ کیا ہے اور ان کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ سر سید کے نظریہ فطرت کی وضعیت کا عملی ثبوت ہے جس سے سر سید شناسی کی روایت ہمیشہ معنوی طور پر زرخیز رہے گی۔'' ۳۲

ڈاکٹر ظفر حسین کا انداز تحریر جامع ہے۔ وہ تصور فطرت کو مشرق و مغرب کے دانش وروں کی آرا سے پیش کرتے ہیں۔ Thesis اس کے بعد Anti Thesis کا اسلوب اپناتے ہیں اور بالآخر Synthesis پیش کرتے ہیں۔ وہ مختلف کتب سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ''سر سید کا نیا طرز فکر'' کو بنیادی ماخذ بنایا ہے۔ یہ کتاب ان کا مقالہ تھا اس لیے مختلف کتب سے خوشہ چینی کر کے انھوں نے اپنی رائے دی ہے۔

سر سید شناسی کے چند اہم زاویے (۲۰۱۱ء) از نسیم عباس احمر

سر سید شناسی کے چند اہم زاویے نسیم عباس احمر کی تالیف ہے جسے ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔ یہ تالیف ۱۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تالیف آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ فہرست میں ۱۔ چند سطریں مزید ۲۔ اردو میں سر سید شناسی کی روایت ۳۔ پروفیسر عمر الدین۔ بطور سر سید شناس ۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ بطور سر سید شناس ۵۔ ڈاکٹر ظفر حسن۔ بطور سر سید شناس ۶۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ بطور سر سید شناس ۷۔ ناقدین سر سید کا مقام و مرتبہ ۸۔ ضمیمہ جات۔ (الف) سر سید احمد خاں (سوانحی خاکہ) (ب) تصانیف سر سید احمد خان (ج) سر سید کے بارے میں تنقیدی کتب (د) ناقدین سر سید کا مختصر تعارف ۹۔ کتابیات: (الف) کتب (ب) رسائل، شامل ہیں۔

پہلے حصے میں مؤلف نے اپنی تالیف کا دائرہ متعین کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''سرسید شناسی، اردو تنقید کا ایک اہم موضوع بن کر ابھرا ہے۔ سرسید پر براہِ راست لکھی جانے والی کتب کی تعداد سو کے قریب ہے جو کسی بھی شخصیت کے حوالے سے تنقیدی کتب کی ایک معتبر تعداد ہے۔ پہلے باب میں ردو میں سرسید شناسی کی روایت کی مختلف رجحانات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مابعد چار ابواب میں چار سرسید شناسوں کے تنقیدی کام کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ان کے خصائص، لغزشوں اور انفرادیت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چھٹا باب اردو میں سرسید شناسی کی روایت میں ان چار سرسید شناسوں کا مقام متعین کرنے اور ان کے اثرات سے مخصوص ہے۔ ضمیمہ جات میں (الف) سرسید احمد خاں کا سوانحی خاکہ (ب) تصنیف۔ سرسید حمد خاں (ج) سرسید کے بارے میں تنقیدی کتب کا اشاریہ (د) چار سرسید شناسوں کے سوانحی خاکے شامل ہیں۔''۳۳

دوسرے حصے میں ''اردو میں سرسید شناسی کی روایت۔ مختلف رجحانات کا مطالعہ'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے بیان کیا ہے کہ سرسید کی تصنیفات و تالیفات کے مختلف پہلو جیسے مذہب، عقلیت پسندی، نظریہ فطرت، انگریزی طرف داری، اصلاح قوم، مغرب کے اثرات اور تقاضے، ادبی اور تاریخی شعور ہمیشہ موضوع بحث رہے ہیں۔ اردو میں سرسید شناسی کی روایت کے رجحانات میں تین اہم رجحانات شامل ہیں۔

۱۔ سرسید کی موافقت، محبت اور عقیدت کے ساتھ

۲۔ سرسید کی مخالفت برائے مخالفت

۳۔ معروضی انداز میں فکرِ سرسید کا مطالعہ

سرسید کے اولین معتقدین میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام شاید سرفہرست رہے گا۔ حیاتِ جاوید حالی کی سرسید کے ساتھ عقیدت اور مداحی کا منہ بولتا ثبوت ہے جس میں سرسید کے نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کی نجی زندگی سے ثبوت فراہم کیے گئے ہیں۔ جامع محاکمہ، سرسید کی سوانح، تجدید اسلام اور اصلاح قوم کے بارے میں ان کی

تعبیرات بہت وسیع ہیں۔ سرسید کے اعمال واقعات، عملی، سیاسی اور سماجی خدمات کے بیان میں حالی نے ہمدردانہ حسن ظن اور خوش آئند تاویل کا انداز اختیار کیا ہے۔

سرسید کی ادبی خدمات کے اعتراف میں موافقت کا رجحان، آل احمد سرور، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ابواللیث صدیقی اور سید احتشام حسین کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ ابواللیث صدیقی نے سرسید کو جدید اردو ادب کا بانی قرار دیا۔ شبلی نعمانی نے سرسید سے مذہبی ونظریاتی اختلافات کے باوجود سرسید کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔

سرسید کے مذہبی نظریات سے شوکت سبزواری اور خلیق احمد نظامی متفق دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید کو بہ طور مصلح قوم سراہنے والوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی شامل ہیں۔ بہ طور مؤرخ خلیق انجم نے سرسید کو سراہا ہے۔

سرسید کی مبالغہ آمیز مدح سرائی میں مولانا غلام رسول مہر اور صلاح الدین محمود کا نام آتا ہے۔

سرسید شناسی کی روایت میں دوسرا رجحان سرسید کی مخالفت کا ہے۔ س رجحان کے حامل طبقے نے سرسید کو کافر، لادین، ملحد، نیچری اور دہریہ قرار دیا۔ اس مخالف رجحان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی سمیع اللہ، مولانا عبدالحیٔ، مولوی علی بخش خاں، مولوی امداد اللہ العلی، مولانا عبدالحق حقانی اور سید جمال الدین افغانی کے اسما شامل ہیں۔ سرسید مخالف رجحان میں ''اودھ پنچ'' کا کردار بہت نمایاں ہے۔ دیگر مخالفین میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، شمیم احمد، طفیل احمد منگلوری شامل ہیں۔ سرسید کے بعض نظریات سے اختلاف کے باوجود ان کی علمی، ادبی اور اصلاحی خدمات کا اعتراف شبلی، سید سلیمان ندوی، محسن املک، وقار الملک نے کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے سرسید کی مغربی تقلید کے باعث مخالفت کے باوجود اخیر عمر میں اسے اپنی غلطی سے تعبیر کیا ہے۔

سرسید شناسی کا تیسرا رجحان، معروضی انداز میں فکر سرسید کا مطالعہ ہے جس میں وسیع النظری، روشن پہلو، برداشت اور احترام کے باوجود اختلافی عناصر شامل ہیں۔

اس رجحان کے حامل ناقدین میں پروفیسر عمرالدین، عتیق احمد عزیز احمد، فضل الرحمن، شیخ محمد اکرام، بشیر احمد ڈار، انتظار حسین، قاضی جاوید، ابوالکلام قاسمی، محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر اہم نام ہیں۔ مؤلف سرسید شناسی کی روایت کے تسلسل اور مستقبل کے بارے میں پرامید دکھائی دیتے ہیں:

> ''سرسید شناسی کی روایت یہیں پر ختم نہیں ہوتی بل کہ یہ روزافزوں جاری ہے اور نئے علمی تناظر میں اس کا تجزیہ جاری رہے گا کیوں کہ سرسید، ماضی، حال اور مستقبل کے نقیب ہیں اور برصغیر کی علمی، ادبی اور مذہبی فکری آزادی کا نقطۂ آغاز بھی۔ اور کوئی صاحب ادراک اپنی تاریخی اور مستقبل بیں شخصیات سے بے بہرہ نہیں ہوسکتا، بہذا وہ حالات و وقعات کے جدلیاتی مظاہر کے پیش نظر، سرسید کے فکری سمندر میں غوطہ زن ہو کر شناور کا جویا رہے گا اور سرسید شناسی کی روایت میں نئے ابواب اور مدارج کا اضافہ کرتا رہے گا۔ حالی نے جو بات آج سے ایک صدی قبل کی تھی وہ آج اس لمحے سے بھی زیادہ صداقت کی حامل نظر آتی ہے۔''[۳۴]

تیسرے حصے ''پروفیسر عمرالدین۔۔ ۔بطور سرسید شناس'' میں مؤلف نے بیان کیا ہے کہ پروفیسر صاحب نے سرسید کی دینی فکر پر ایک مقالہ ''سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر'' ۱۹۵۴ء میں لکھا جو پہلی بار علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر (مارچ ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں اختصار و جامعیت کے ساتھ ساتھ تجزیاتی اسلوب بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ تیئس (۲۳) ابواب پر مشتمل ہے جسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سرسید کی شخصیت اور کارنامے

۲۔ سرسید کی کوششوں کا تاریخی پس منظر

۳۔ سرسید کے مذہبی افکار کی بنیادیں

۴۔ سرسید کے بنیادی عقائد

۵۔ سرسید کے مقام کا تعین

''سر سید کی کوششوں کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان کے تحت دوسرے باب سے چھٹے باب تک سر سید سے قبل اسلام کے نئے حالات و واقعات کے تقاضوں کے تحت دینی و مذہبی ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کو بہ طور آئین کے عمل میں لانے کے لیے اور نئے لوگوں کو ان کے فرسودہ خیالات میں صحیح راستہ دکھانے کے لیے چار تحریکات نے جنم لیا:

۱۔ تحریکِ فقہ: امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی

۲۔ تحریک و تدوینِ حدیث: عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ ابن سعید۔ احمد بن حنبل

۳۔ تصحیح حدیث امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی

۴۔ فقہ اور تدوین حدیث کا امتزاج نئے اصولِ فقہ

دوسری صدی ہجری فلسفہ کے عروج کی صدی شمار کی جاتی ہے۔ فلسفے کے مقابلے کے طور پر اسلام کے لیے پھر چار تحریکوں کا آغاز ہوا:

۱۔ معتزلہ: واصل بن عطا، ابوالہذیل، نظام وغیرہ

۲۔ فلاسفۂ اسلام: کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرہ

۳۔ اخوان الصفا: جماعت اخوان الصفاء

۴۔ اسماعیلیہ: محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق، حسن بن صباح، ناصر خسرو وغیرہ

یک اور تحریک بھی اسی عہد میں دکھائی دیتی ہے جسے ''اشاعرہ'' کہا جاتا تھا۔ ''اشاعرہ'' نے عقل اور فلسفہ کے دلائل سے معتزلہ کے نظریات کا جواب دیا اور فلسفہ کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ پروفیسر عمرالدین نے ان دونوں کی مماثلت اور مخالفت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر عمرالدین نے دیگر علما کی مانند کتب کے انبار لگانے کی بجائے ایجاز و اختصار سے کام لیا۔ انھوں نے سر سید کی نشو و نما میں ان کے ددھیال کی پرانی اقدار اور ننھیال کے نئے زمانے کی خوبیوں کے امتزاج، والدہ کی انسانی ہمدردی، بے نفسی، والد کے درویشانہ طرز حیات کو پیش خیمہ قرار دیا

ہے۔ پروفیسر صاحب کے مقالہ کا مرکزی نقطہ ہے جس کا اظہار مقالے میں پر زور دلائل کے اثبات کی شکل میں ملتا ہے۔ اکثر اصحاب نے سر سید کو قومی ترقی کا علم بردار کہا ہے لیکن اس کے برعکس پروفیسر صاحب کے نزدیک سر سید مذہبی پہلے تھے اور قومی مصلح بعد میں۔

مؤلف نے حالی اور پروفیسر عمر الدین میں مماثلت اور اختلافی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے:

> ''حالی نے سر سید کے معاصر حالات کے حوالے سے ان کو درپیش تین خطرات کا حوالہ حیاتِ جاوید میں دیا ہے۔ پروفیسر عمر الدین نے بھی تین خطرات کا ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن حالی اور ان کے انداز بیان میں واضح فرق موجود ہے۔ پروفیسر عمر الدین نے ان تینوں خطروں کے بیان میں سر سید کو بہ طور حقیقت پسند پیش کیا ہے اور ان کی خدمات اور کارناموں اور ان خطروں میں تطبیق کا رشتہ قائم کیا ہے اور ایک بڑے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ خود فلسفے کے پروفیسر تھے۔ اس لیے اپنے مخصوص فلسفیانہ نداز میں انھوں نے اسباب و علل، عملی ثبوت اور نتائج کو یکجا کر دیا ہے۔ یہی طریقہ استدلال، ان کی پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔''[۳۵]

س حصے میں ''سر سید کے مذہبی افکار کی بنیادیں'' کے عنوان کی ذیل میں مؤلف نے سر سید کو خالص مذہبی شخصیت قرار دیا ہے اور سر سید کے مذہبی تصور کے مرکزی عقیدے کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ ان کے خیال میں سر سید دو انتہاؤں کے مسائل سے دو چار تھے۔ ایک مذہب اور دوسری سائنس اور عقل۔ سائنسی ترقی کرنے والوں نے مذہب کو خیرباد کہ دیا تو روایت پسند مذہب کے جامد تصور سے چپٹے رہے۔ سر سید مذہب کو ترک کیے بغیر حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کے خواہاں تھے۔ یہی امران کے تصور مذہب اور نئے علم الکلام کی اساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید نے اسلام کے لیے سائنٹیفک نظریہ اپنایا۔ پروفیسر عمر الدین سے قبل دیگر ناقدین نے بھی سر سید کے

اسلامی سائنٹیفک نظریے کی تعبیر وتشریح کی ہے جن میں حالی، شوکت سبزواری، نورالرحمٰن جیسے ناقدین شامل ہیں۔ حالی نے باون (۵۲) ایسے مسائل کی نشان دہی کی جن میں سرسید نے تمام علما سے اختلاف کیا۔

سرسید کے اسلامی سائنٹیفک نظریے کی بنیادوں کے چندایک پہلوؤں پر ناقدین نے زور دیا ہے لیکن پروفیسر عمرالدین نے ان سب کو یک جا کر کے ایک منفرد انداز اختیار کیا ہے:

۱۔ سرسید کے خیالات ان کی ذاتی تحقیق اور غور وفکر کے مطابق تھے۔

۲۔ سرسید عقل کو دوسرے تمام مآخذات پر مقدم جانتے تھے۔

۳۔ وہ قرآن وحدیث کو مانتے تھے اور تمام فقہ، تفاسیر کو وقتی اور وصفی سمجھتے تھے۔

۴۔ ان کا مقصد کوئی فرقہ پیدا کرنا نہیں تھا۔

تشبیہی انداز میں لکھتے ہیں:

> سرسید کی کوششوں کو ہمیں ایسی دوا کے طور پر سمجھنا چاہیے جو ایک خاص قسم کے مریضوں کے لیے تجویز کی گئی تھی۔ ۳۶

۵۔ سرسید کے خیالات بھی وقتی اور ہنگامی ضرورت کے مطابق تھے۔

۶۔ سرسید کے اکثر خیالات مختلف فقہا اور مفسرین سے ہم آہنگ ہیں۔

پروفیسر عمرالدین نے سرسید کے تصور نیچر کی توضیح بھی کی ہے۔

۱۔ نیچر کے قوانین اور ضابطے اٹل ہیں۔ خدا بھی ان کو نہیں توڑتا۔

۲۔ اسلام اور شریعت کا کوئی حکم فطرت کے خلاف نہیں ہے۔

۳۔ اسلام نے جن باتوں کو اچھا کہا ہے وہ فطرتاً اچھی ہیں۔ جن کو برا کہا ہے وہ فطرتاً بری ہیں۔

۴۔ اسلام اور نیچر میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ ۳۷

عزیز احمد نے اسے مغربی تصور قرار دیا ہے۔ پروفیسر عمرالدین اسے سیدھے سادھے انداز میں بیان کرتے ہیں اور عزیز احمد اسے اصطلاحات کے وسعت میں

لے گئے ہیں۔ پروفیسر عمرالدین نے سرسید کے تصورِ نیچر کے مآخذات کی نشاندہی نہیں کی۔ وہ اسے سرسید کی ذاتی تحقیق اور غور و فکر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن دیگر ناقدین نے ان مآخذات تک رسائی حاصل کی ہے۔

پروفیسر عمرالدین نے سرسید کے تصورِ عقل کی توضیحات پیش کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ سرسید تجرباتی عقل کے قائل ہیں۔ اس طرح ان کا سلسلہ بیکن، لاک اور مل جیسے تجربیین تک پہنچتا ہے۔
۲۔ سرسید استخراجی استدلال سے بھی کام لیتے ہیں۔
۳۔ علم یقین اور ایمان کا ذریعہ، عقل کو ہی گردانتے ہیں۔
۴۔ فلسفۂ عقلیین کے برعکس عقل کی محدودیت کے قائل ہیں۔
۵۔ لیکن ان کے نزدیک عقل کے سوا کوئی دوسرا ذریعۂ تعلیم بھی قابل یقین نہیں۔
۶۔ عقل اور مذہب میں مطابقت ہے جس طرح اسلام اور نیچر ہم آہنگ ہیں۔ ؎۳۸

پروفیسر عمرالدین نے سرسید کے تصورِ عقل کا عمدہ انداز میں تجزیہ کیا ہے جو دیگر ناقدین سے منفرد ہے۔ مختصر جملوں اور سادہ اسلوب میں قاری سمجھا دیتے ہیں۔ سرسید کے تصورِ عقل کے بارے میں عمدہ مباحث چھیڑے ہیں جن تک دیگر ناقدین کی رسائی دیر سے ہو سکی اور بعض نے انھی سے استفادہ کیا۔ دوسروں کے اس نظریے سے وہ اختلاف کرتے ہیں کہ سرسید نے فرقہ معتزلہ کی تقلید کی ہے۔

اس حصے میں ''سرسید کے بنیادی عقائد'' کے عنوان کے تحت ''ہستی و صفاتِ باری'' کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ سرسید عقل کی محدودیت کے قائل ہیں اسی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی پہچان کے لیے نیچر اور عقل کے قائل تو ہیں لیکن اس کی حقیقت اور ماہیت کی پہچان کے لیے ان ذرائع کو محدود خیال کرتے ہیں۔ سرسید کی

تحقیق کو ذاتی تصور کرتے ہیں اس سلسلے میں دیگر اکابر، معتزلہ فلاسفہ، عقلیین، فلاسفہ اسلام کے نظریات کی تردید کی ہے اور سرسید کے مادے کی قدامت کی تردید کو فزکس کی جدید تحقیقات سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

''عقیدۂ روح'' میں وہ سرسید کے روح کے فنا ہونے بل کہ تبدیل ہونے کو سائنس اور مادیت کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ''مسئلہ جبر قدر'' کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ بنو امیہ کے عہد میں ایک گروہ ''جبریہ'' کہلایا اور دوسرا فرقہ معتزلہ ''قدریہ'' کہلانے لگا اور اشاعرہ انظریہ بین الجبر والاختیار تھا۔ ان کا خیال ہے کہ سرسید معتزلہ سے متفق تو ضرور تھے لیکن وہ اپنی ذاتی فکر، سائنس اور فلسفہ فطرت کے تحت اس مسئلے کی توضیح کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سرسید فرقہ معتزلہ کے حسن و قبح کے عقلی تصور کے باعث ان سے متفق ہیں لیکن ان کی پیروی نہیں کرتے۔

سرسید کے ''وحی و اہام'' کے نظریے کو پروفیسر صاحب نے تجزیاتی اور تدریجی انداز میں پیش کیا ہے.

۱۔ سرسید کے نزدیک وحی اور الہام میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲۔ سرسید تمام انسانوں کی طرح مدارج کی تفریق کے اعتبار سے چرند، پرند کیسے مکھی میں بھی وحی اور الہام کے قائل ہیں۔

۳۔ نبی کی وحی، روح کی تربیت، اخلاقی اور انسانی اقدار کی ترویج کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔

۴۔ وحی، نبی کے قلب پر القا نہیں ہوتی بل کہ اوپر جا کر واپس قلب پر پہنچتی ہے۔

۵۔ وحی ایک مکمل کتابی شکل میں نہیں آتی بل کہ بہ مقتضائے امر بتدریج نازل ہوتی ہے۔

۶۔ سرسید اپنے نظریے میں غلط فہمی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ کہیں کوئی ضمیر کی آواز کو ہی وحی نہ سمجھ بیٹھے اس لیے وہ وحی کا ایک معیار قائم کرتے ہیں اور وہ وحی کی کسوٹی، فطرت یا نیچر ہے۔[۳۹]

پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ سرسید معجزہ کے نظریات کے حوالے سے علما اور مفکرین سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے اس سلسلے میں مختصر، جامع اور مدلل انداز میں سرسید کے دلائل تحریر کیے ہیں اور سرسید کے نظریہ معجزات کے ماخذات اور اختلافات کی وجوہات پیش کی ہیں۔

۱۔ معجزات کو ماننا، عقل اور فطرت کے خلاف ہے۔

۲۔ قرآن کی آیات سے معجزات کی تردید ہوتی ہے اور وہ رسول اللہؐ کے کسی معجزے کے قائل نہیں بل کہ ان کے نزدیک وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہؐ کے معجزات سے ماورا ہونے کو ان کی سچائی کی دلیل مانا ہے۔

۳۔ معجزات، اللہ تعالیٰ کی صفت کی یکتائی پر ایمان میں کمزوری کا باعث ہیں اور معجزات اوہام پرستی کو تقویت دیتے ہیں۔

۴۔ اگر معجزہ دلیل نبوت ہے تو عقل اور شرع سے جو رسالت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کے لیے معجزہ بے معنی چیز ہے۔

۵۔ نظریہ معجزات میں سرسید نے ابن رشد کے نظریات کی تقلید کی ہے۔

۶۔ سرسید، ابن رشد کے مطابق ایسے معجزت کے قائل تو ہیں جو تابع قانون قدرت ہوں، مگر نظروں سے پوشیدہ بھی ہوں۔

۷۔ سرسید شاہ ولی اللہ کے معجزات کے نظریات سے جزوی اختلاف کرتے ہیں۔[۴۰]

''ملائکہ اور شیطان'' کے حوالے سرسید کا عقیدہ ابن عربی اور شیخ صدرالدین کے نظریات کی توسیع ہے جن کے مطابق ملائکہ اور شیطان انسان کے اندر موجود قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمہ کی ذریات ہیں، الگ سے ان کا کوئی وجود نہیں۔ سرسید کے ان نظریات کے ناقدین میں حبیب اللہ غضنفر شامل ہیں۔

''قصہ آدمؑ'' میں مولف نے بیان کیا ہے کہ سرسید نے قصہ آدم کو تمثیلی انداز میں

تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غلامی، تعداد زدواج، طلاق، جہاد کے حوالے سے پروفیسر صاحب نے سرسید کا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔

سرسید کے مقام و مرتبے کا تعین میں پروفیسر عمرالدین نے کون سا انداز اختیار کیا ہے؟

مؤلف اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''سرسید کے مقام کے تعین میں پروفیسر عمرالدین نے سرسید کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا ہے اور تفکیری عمل سے گزارا ہے۔ ایک ایک جملہ، اختصار کا منفرد نمونہ اور اثر آفرینی کا حامل ہے سرسید کے اثرات کی عالم گیریت کے ثبات کے لیے اقبالؒ اور مودودیؒ کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ان کے نزدیک سرسید کی بعض چیزیں وقتی اہمیت کی حامل بھی ہیں اور سرسید کا معیار تفسیر، فطرت و عقل، معاشرتی احکام اور دنیاوی معاملات میں صحیح رخ متعین کرتا ہے لیکن الٰہیات کے مسائل مثلاً خدا کی ہستی، روح کا وجود، حیات بعد الممات کا لزوم وغیرہ میں منطقی دلائل اپنا اعتبار کھوئے ہوئے ہیں۔

پروفیسر عمرالدین نے سرسید کی تجربیت کو ان کے منطقی استدلال کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ وہ سرسید کے نظریہ عقل و فطرت میں کچھ سقم واضح کرتے ہیں اور سرسید کی علمی نوعیت کو ذوقی و وجدانی سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک سلامی مسائل کا جدید تحقیق کے تناظر میں جائزہ لینا چاہیے۔کیوں کہ سرسید نے بھی اسی خطرے کے تحت اسلامی جائزہ لیا تھا اور اجتہاد کا راستہ کھلا رکھتے ہیں اور تاریخی حقائق اور سائنس کے مسائل کو قرآن سے ماخوذ کرنا بھی صحیح نہیں سمجھتے بل کہ ان کے نزدیک قرآن اخلاقی اور مذہبی احکامات کا ماخذ ہے۔انھوں نے سرسید کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے کہ انھیں

کافر اور نیچری کہنے والے ہی ان کے نظریہ ''اسلام دین فطرت ہے۔''
کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔''[۱۴]

اس حصے میں ''ڈاکٹر سید عبداللہ بطور سرسید شناس'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے ایک تو ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقام و مرتبے کا تعین کیا ہے اور دوسرے ڈاکٹر صاحب کی تالیف ''سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ'' کے حوالے سے ان کی سرسید شناسی کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس تصنیف کا پہلا باب اور ضمیمہ (ب) سرسید شناسی کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سرسید کے افکار اور فن نثر نگاری کے جائزے کے لیے بعض راہیں متعین کی ہیں:

۱۔ سرسید کے تصنیفی ادوار

۲۔ سرسید کے افکار و نظریات

۳۔ سرسید کے مختلف اصنافی رجحانات

۴۔ سرسید کا اسلوب

۵۔ اہم کارنامہ (علی گڑھ تحریک)

۶۔ سرسید کے اردو ادب پر اثرات

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سرسید کی تصنیفی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم تو کیا ہے لیکن وہ یہ واضح نہیں کر سکے کہ کن خصوصیات کی بنا پر انھوں نے روایتی ادوار کی تقسیم میں تبدیلی کر کے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ادوار کی تقسیم میں پہلا دور (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۷ء)، دوسرا دور (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء)، تیسرا دور (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۶ء) اور چوتھا دور (۱۸۶۶ء تا ۱۸۹۸ء) پر محیط ہے۔ جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جن میں پہلا دور (شروع سے لے کر ۱۸۵۷ء تک)، دوسرا دور (۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان ۱۸۶۹ء تک) اور تیسرا دور (سفر انگلستان سے وفات تک) پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے سرسید کی ادبی زندگی کے تینوں ادوار کے تعین کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کی سرسید شناسی کا معیار قائم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایلیٹ نے کہا تھا کہ تنقید، تقابل، تجربے اور احتساب کا عمل ہے۔ اس رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید شناسی میں تینوں مراحل سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مابعد ناقدین نے زیادہ تر ان کی قائم کردہ نہج پر سرسید کا فکری و فنی تجزیہ کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں مباحث کی تکرار، تفہیم میں رکاوٹ بنتی ہے۔ سرسید پر تنقید کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں کو بھی نرم الفاظ میں بیان کرتے ہوئے وہی تہذیبی وضع داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایسا کئی مواقع پر ہوا ہے۔ سرسید کی مذہبی خدمات کے جائزے اور شبلی اور سرسید کے موازنے کے وقت یہ بات زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے اس نقطے سے بھی انحراف کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کی تمام خدمات کی بنیاد، سیاسی ہے۔ شاید اس کی نسبت یہ کہنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ سرسید جیسی ہمہ گیر شخصیت، زمانہ شناس ضرور ہے لیکن ان کی سوچ کا تدریجی ارتقا سیاسی کم ہے اور وسیع اسلامی اجتہادی روایت میں حقیقت پسندانہ زیادہ ہے جس پر ان کا اصلاح کا عنصر غالب آیا ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ کا سرسید شناسی میں ایک منفرد نام ہے۔ سرسید شناسی کی روایت، ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ سرسید پر ان کا کام ہمہ جہت ہے سرسید شناسوں کی طویل فہرست میں ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے کام اور اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ایک نمایاں مقام کے حامل ہوجاتے ہیں۔ بسا اوقات یہ ضرور لگتا ہے کہ ان کا دل شبلی کے ساتھ دھڑک رہا ہے لیکن ان کا دماغ سرسید کی ہم نوائی پر خود کو مجبور کرتا ہے۔ [۲۴]

اُردو صحافت اور سر سید احمد خاں، عبدالحیٔ، (۲۰۱۱ء)

ہندوستان میں دیگر زبانوں کی صحافت کی طرح اردو صحافت کا بھی اپنا مقام ہے اور اپنا کردار ہے۔ اردو صحافت نے بھی ہندوستان کے تمام سیاسی انقلابات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو صحافت کی بھی اپنی ایک تاریخ رہی ہے اور اپنا وجود رہا ہے۔ اردو صحافت جو جام جہاں نما سے شروع ہوکر راشٹریہ سہارا اور اعتماد تک نہ جانے ترقی کی کتنی منازل طے کر چکی ہے۔ اردو صحافت کو آج عالمی سطح پر لانے میں مختلف صحافیوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں مولوی محمد باقر، ماسٹر رام چندر، منشی نول کشور، سر سید احمد خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، حیات اللہ انصاری، مولانا عبدالوحید صدیقی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی ملک کی صحافت ہو، وہ ملک کی سیاسی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو صحافت نے بھی ہر دور میں ملک کی سیاسی اتھل پتھل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد جب کہ ہندوستانی عوام بے حسی و بے بسی کی زندگی جینے پر مجبور تھے۔ چاروں طرف جاہیت اور انگریزی حکومت کا سیاہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے وقت میں سر سید احمد خاں نے ہندوستانی عوام خاص طور سے مسلمانوں کی پس ماندگی کو دیکھ کر اندازہ لگا لے گا کہ اگر وہ وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تو مفلوج ہو جائیں گے اور پورا مسلم طبقہ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔ یہی سب سوچ کر انھوں نے صحافت کو ذریعہ بنایا اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے کی کوشش شروع کی۔ آج مسلمان جہاں بھی ہیں جس مقام پر ہیں اس میں سر سید کی کوششوں کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ سر سید احمد خاں نے اردو صحافت کو نئی سمت عطا کی اور اردو صحافت جو اس سے پہلے گھٹنوں کے بل چل رہی تھی وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر دوڑنے لگی۔ انھوں نے اردو صحافت کو جدید اصولوں سے روشناس کرایا اور اپنے اخبارات انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعہ معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا۔

عبدالحیٔ نے اپنی کتاب اردو صحافت اور سرسید احمد خاں میں سرسید کی صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۱ء پر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے ۱۹۲ صفحات ہیں۔ فکشن ہاؤس نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب میں صحافت کی تاریخ و تنقید، سرسید احمد کی صحافتی خدمات اور سرسید احمد خاں کے اہم رسالے تہذیب الاخلاق پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ سرسید نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں بسر کی۔ ان کے کارناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا قیام ان کا ایک ایسا تاریخی اور شان دار کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی صحافتی خدمات میں سب سے بڑا کارنامہ تہذیب الاخلاق کا اجرا ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے مختلف سماجی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر بھی مضامین لکھے جو خاصے بحث انگیز ثابت ہوئے۔ توہم پسندی، اندھی تقلید، کورانہ پیروی کی انھوں نے نفی کی ہے۔ عبدالحیٔ نے سرسید کی صحافت اور ان کی فکر پر زیر نظر کتاب میں بھرپور روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں سے مجھے ابتدائی تعلیم کے دوران سے ہی عقیدت ہے اور مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میں نے ایسی عہد ساز شخصیت کی صحافت بالخصوص رسالۂ تہذیب الاخلاق کے تعلق سے قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔''[۳۴]

سرسید کی صحافت پر اصغر عباس کی کتاب ہے لیکن اس میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے کام کیا گیا ہے۔

دوسری کتاب ڈاکٹر نفیس بانو کی ہے جس میں انھوں نے تہذیب الاخلاق کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں اُردو صحافت اور سرسید کا مقام پیش کیا گیا ہو۔ عبدالحیٔ کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں بڑی تفصیل سے سرسید احمد خاں کی صحافت کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ انھوں نے پہلے ہندوستان میں اُردو صحافت کی تاریخ بیان کی ہے۔ صحافت کے معنی و مفاہیم پر تفصیلی

بحث کی ہے اس کے بعد سرسید احمد خان کی سائنٹیفک اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پر قلم اٹھایا ہے۔ تہذیب الاخلاق پر عبدالحیٔ نے آخر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ تہذیب الاخلاق میں لکھنے والے ان کے موضوعات اور ان کے اثرات بیان کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''سرسید نے صحافتی زندگی کی شروعات اپنے بھائی سید محمد خاں کے اخبار سید الاخبار سے کی تھی۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کی قیمت دو آنہ ماہوار تھی۔ اس خبار کے مالک سرسید کے بڑے بھائی سید محمد تھے۔ اس اخبار کی شروعات کی تاریخ میں تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق یہ خبار ۱۸۳۷ء میں شروع ہوا تھا جب کہ نادر علی خاں نے اس کا سن اشاعت ۱۸۴۱ء لکھا ہے۔''۴۴

سرسید کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں عبدالحیٔ لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں نے اردو صحافت کو ایک نیا رُخ اور نئی زمین عطا کی اور صحافت کو ایک مشن کی طرح استعمال کیا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے پنے اس مشن کی وجہ سے صحافت کے فن سے کبھی روگردانی کی ہو۔ ان کا صحافت سے متعلق ایک تعمیری نظریہ تھا ایک خاص مقصد تھا اور اپنے اس مقصد کی تکمیل میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہوئے۔ ان کی اخبار نویسی کی بعد کے اخبار نویسوں نے تجدید کی اور اردو اخبار نویسی کو صحافت میں ایک اہم مقام عطا کیا۔''۴۵

بہ قول عبدالحیٔ سرسید کی صحافت کے تین ادوار ہیں ان کے نزدیک دوسرے دور کی اہمیت سرسید کی صحافت میں سب سے زیادہ ہے، لکھتے ہیں:

''سرسید کی صحافت کے دوسرے دور کو ہم دورِ زرّیں یا ان کی صحافت کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔ سرسید پہلے بھائی کے اخبار میں بھی طبع آزمائی کر رہے تھے ور دوسرے اخبارات میں لکھ رہے تھے لیکن پھر انھوں نے اپنا اخبار شروع

کیا اور صحافت کے میدان میں اپنی فتح کا نشان لہرا دیا۔ ان کی اخبار نویسی نے بعد میں اخباروں کو صحافت کے رُخ متعین کرنے میں بھی مدد دی۔[۶]

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی پسماندگی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک منظم تحریک یا مشن کی شکل میں کوشش نہ کی جائے اور ایسا کرنے کے لیے عوام کے خیالات میں، ان کے احساسات میں تبدیلی لانا لازمی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نئے خیالات اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہی توہم پرستی اور جہالت کے اندھیرے سے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں پر چھائے ہوئے پس ماندگی کے گہرے کہرے کو دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک انجمن قائم کی جائے۔ چناں چہ انھیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کی شروعات کی۔ اس سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۹ جنوری کو غازی پور میں ہوا تھا۔ جلسے کا انعقاد سرسید نے اپنے ہی مکان پر کیا تھا۔ اس بارے میں انھوں نے ایک تحریر التماس بہ خدمت ساکنان ہندوستان درباب تعلیم اہل ہند میں بھی اشارہ کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ عملی اقدامات کیے جائیں۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بارے عبدالحیٔ کہتے ہیں:

> ''سرسید نے اپنی کوششوں سے سوسائٹی کو کامیاب بنایا۔ ہر مہینہ جلسوں کا اہتمام کرنا، مضامین جن پر لیکچر ہوتے تھے وہ خاص طور سے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے ہوتے تھے۔ سائنس کے موضوع پر لیکچر کے لیے ایک انگریز ڈاکٹر متعین کیے گئے تھے۔ ایک پورا عملہ تھا جو سوسائٹی کا کام کرتا تھا۔ مترجم، مولوی، پریس مین، چپڑاسی، مالی وغیرہ اور انھیں باضابطہ تنخواہیں دی جاتی تھیں۔''[۷]

سرسید نے سوسائٹی اخبار کا اجرا بھی کیا جو بہت کامیاب رہے۔

''۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے اخبار کی شروعات ہوئی۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ اس اخبار کا اداریہ سرسید خود

ہی لکھا کرتے تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں ایک نیا تعمیری نظریہ پیش کیا۔ اس اخبار میں سوشل، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ ساتھ ہی خبروں کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔"۳۸

عبدالحئی عملی طور پر صحافی ہیں ان کا علمی ذوق بے حد بالیدہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان کی صحافت سے فطری وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سر سید کی صحافت پر ان کی یہ کتاب سر سید شناسی میں اہم اضافہ ہے۔ انھوں نے بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

سر سید اور جدیدیت، پروفیسر افتخار عالم صدیقی (۲۰۱۴ء)

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام سیونتھ سکائی پبلی کیشنز نے کیا ہے۔ افتخار عالم خاں نے اس کتاب کا انتساب اپنے تین اساتذہ کے نام کیا ہے۔ پیش لفظ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب کو ذیلی عنوانات دیے ہیں جس سے تفہیم میں آسانی ہو گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں زندگی کے جدید تقاضوں سے سر سید کی وابستگی اور منطقی نقطۂ نظر اختیار کرنے کو مختلف دستاویزی شواہد کی مدد سے سامنے لایا گیا ہے۔ سر سید کے بارے میں افتخار عالم خاں نے ان مؤرخین کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے جو سر سید کو انگریزوں کے محض وفادار کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس نوع کے مؤرخین کی نگاہوں سے بعض حقائق چشم پوشی کی حد تک مخفی ہیں، جن کی روشنی میں سر سید کے ایک مابعد نوآبادیاتی Post-Colonial مصنف اور مفکر ہونے کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

افتخار عالم خاں نے سر سید کی جدیدیت اور اپنی معاصر صورت حال میں سماجی اور ثقافتی رویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض مقامات پر اشتراکی اور ترقی پسند زاویۂ نظر بھی اختیار کیا ہے اور ہندوستانی سماج میں طبقات کی معاشی اور اقتصادی خانہ بندی کو ذاتوں

اور برادریوں کی تقسیم کے حوالے سے سمجھا جاتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سر سید کے وقت تک لوگ ہندوستانی سماج میں ہر مسئلے کو ذات پات ،اعلیٰ اور ارزل کی اصطلاحوں میں سوچنے کے عادی تھے۔اعلی ذات ان لوگوں کی تسلیم کی جاتی تھی جن کے آباواجداد باہر سے آئے تھے۔مسلمانوں میں اعلیٰ ذات کا معیار زیادہ تر یہی تھا۔حد یہ تھی کہ جن اعلیٰ ہندو ذاتوں کے لوگ تبدیلی مذہب کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے ان کو بھی پرانی سماجی برتری مثلاً راجپوت، کپور اور رانا کے ناموں سے حاصل رہی۔تاہم مصنف نے جو اہم نکتہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ صنعت وحرفت سے وابستہ ذاتوں اور برادریوں کے لوگ ملک کی سماجی اور معاشی ضرورت ہونے کے باوجود ادنیٰ یا اس وقت کی کم تر ذاتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔انھوں نے انصاری برادری کی مثال کو اس ضمن میں بہت اہم پایا ہے اور وضاحت کی ہے کہ یوں تو انصاریوں کو پست ذاتوں میں شمار کیا جاتا تھا مگر ان کے ہینڈلوم اور دست کاری کی صنعت کے طفیل کپڑوں کی تیاری کا پورا نظام چلتا تھا۔اتفاق سے انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد جب برطانوی مصنوعات کی درآمد بڑے پیمانے پر شروع ہوئی تو ہندوستان میں موجود کپڑے کی صنعت تباہی کے دہانے پر جا پہنچی۔یہی سبب تھا کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں اس نوع کی برادریوں بالخصوص انصاریوں نے برٹش سامراج کے خلاف موت اور زیست کی لڑائی لڑی تھی۔ظاہر ہے کہ اس کا خمیازہ بھی انھیں کو بھگتنے پر مجبور کیا گیا۔افتخار عالم نے اس ضمن میں بروک کی کتاب ہندوستان کے قبائل اور ذات پات کے جائزے پر بجا طور پر انحصار کیا ہے اور اس جائزے سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریزوں کے تفریقی رویے اور ڈھائے جانے والے مظالم پر خاموشی، مجرمانہ خاموشی کے مترادف کیوں تھی۔چناں چہ انھوں نے ظاہری طور پر انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ اختیار کرتے اور ان کی تہذیبی برتری کا اعتراف کرنے کے باوجود ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ انگریز حکم رانوں کی پالیسیوں کے نقائص کی نشان دہی کریں، نسلی اور تہذیبی برتری کے ان کے زعم کو تشت

ازبام کریں اور ہندوستان کے مظلوم عوام یا طبقات کی عزت نفس کی بازیافت کرائے۔

سرسید احمد خاں کو جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایک ممتاز دانش ور اور ملک کے فکری معماروں میں شمار کیا جاتا ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں جب ان کی حیثیت کے تعین کا سوال آتا ہے تو انھیں اپنی ملت کی نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے نقیب اور محرک کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ان کو کسی بھی طرح امام غزالی اور محمد بن عبدہ سے کم تر درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ مگر ان اعترافات کے ساتھ ہی سرسید کے بعض ناقدین نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ملت کی فلاح کی خاطر انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ اختیار کر رکھا تھا یا یہ کہ انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پہلے اجلاس (منعقدہ ۱۸۸۵ء) میں شرکت کو اپنے ملی مفاد کے خلاف تصور کیا تھا۔ مؤلف نے بھی سرسید کی عبقریت اور ہمہ جہت فکری اور عملی کاوشوں کے اعتراف کے باوجود ان کے انداز فکر اور طریق کار کو اپنی بعض تحریروں میں نوآبادیاتی مقاصد اور مفادات سے متاثر اور انگریز حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے اپنی تہذیب اور اپنے سماج کو کم تر محسوس کرنے والوں میں شمار کرنے کی غلطی کی ہے۔ افتخار عالم کی زیر بحث کتاب اس نقطۂ نظر کے برخلاف سرسید کو، بعد نوآبادیاتی (Post Colonial) انداز فکر اور طریق کار کا نہ صرف حامل اور نمائندہ قرار دیتی ہے بل کہ ہم جیسے قلم کاروں کو اس کتاب میں شامل دستاویزی ثبوت اور دلائل، اپنی سابقہ آرا پر نظر ثانی پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ مصنف نے اپنے مفروضات کو پایۂ تصدیق تک پہنچانے اور معتبر ترین شواہد فراہم کرنے کے سلسلے میں بعض معلوم حقائق تک کو بالکل نئے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ سرسید کی تحریروں اور انگریزوں سے ان کے روابط کی نوعیت کی خاصی نئی تفہیم و تعبیر مصنف کی اس کتاب کے وسیلے سے سامنے آنے جارہی ہے۔

سرسید کی کاوشوں اور انداز فکر کی جو مثالیں افتخار عالم خاں نے پیش کی ہیں ان کے پس منظر میں سرسید فہمی کا ایک بالکل نیا سیاق و سباق سامنے آتا ہے۔ اس لیے اس

کتاب کو مطالعاتِ سرسید میں پیراڈائم شفٹ کا نام دیا جا سکتا ہے اور ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ انگریز حکم رانوں کے تئیں ہم سری کے انداز اور مساویانہ طرزِ تخاطب کو ہم سوائے اس کے اور کیا نام دے سکتے ہیں کہ سرسید کی کاوشوں نے نوآبادیاتی اندازِ فکر کو چیلنج کرنے کا طریق کار اختیار کیے رکھا تا کہ وہ اپنی اور اپنی ملت ہی نہیں بل کہ تمام ہندوستانیوں کی عزتِ نفس کی بھرپور ترجمانی کر سکیں۔

پہلے باب میں سرسید اور جدیدیت کے عنوان سے پروفیسر افتخار عالم خاں نے لکھا ہے:

''سماجیات کے عالم جدیدیت کو سماج میں موجود عقلیت پسندی کے رجحان کی مقبولیت سے بھی منسلک کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تقلید کے بہ طور، روایتی رسم و رواج کی پابندی کا عمل سماجی ترقی کے لیے ہمیشہ مضر رساں ثابت ہوتا ہے۔''[۴۹]

سرسید نے مغربیت کے بجائے جدیدیت کے افکار اپنانے کی کوشش کی تھی جس میں سب سے اہم ان کا جدید علوم کی تعلیم و تحصیل کے ذریعے عقلیت پسندی اور سائنسی طرزِ فکر کو فروغ دینے کا مشن تھا۔ پروفیسر افتخار عالم خاں کہتے ہیں:

''چوں کہ جدیدیت انگریزوں اور ان کی معاشرت کے ذریعہ (یعنی مغربیت کے ذریعہ) ہندوستان پہنچی تھی۔ اسی وجہ سے سرسید کوشاں تھے کہ کلونیل کمپنی سرکار کی معاشی لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ نظم و نسق کی وجہ سے جو نفرت ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں اور ان کی معاشرت کی طرف سے (یعنی مغربیت کی طرف سے) گھر کر گئی ہے اور جس کی وجہ سے مغربیت اور اس سے منسلک تمام تر جدیدیت کے حامل افکار و خیالات سے وہ منحرف اور منکر ہو رہے تھے۔ اس انکار و انحراف کی کیفیت سے انھیں باہر نکالا جائے اور کس طرح ان کو مغربیت کے توسل سے آنے والی 'جدیدیت' سے روشناس کروایا جائے۔''[۵۰]

سرسید کی جدیدیت کے ارتقا کے حوالے سے پروفیسر افتخار عالم خاں کا کہنا ہے:

''۱۹۵۰ء تک سرسید کی سائنسی فکر و فہم میں بھی عہدِ وسطیٰ کی روایتی نہج سے آگے یعنی جدیدیت کی طرف کوئی پیش رفت نظر نہیں آتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی سائنسی استعداد کا اندازہ ان کی تصنیف بہ عنوان ''قول متین در بطال حرکت زمین'' سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے جو ۱۸۵۰ء میں شائع کی گئی تھی اور جس میں زمین کے گرد، سورج کے گردش کرنے کی تائید میں مختلف ثبوت و اسناد پیش کی گئی تھیں۔ غرض ۱۸۵۰ء کے بعد جب کہ آثار الصنادید کے انگریزی ترجمے کے سلسلہ کی کوششیں کی گئی تھیں، سرسید کے اس عبوری دور کی ابتدا ہوئی تھی جس کے دوران سرسید کا مغربی فکر اور جدید علوم سے متعارف ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔''[۵۱]

انگریزی لفظ ماڈرن کے لیے اردو میں جدید کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور اسی کی مناسبت سے ماڈرن ازم کے لیے جدیدیت کی اصطلاح مستعمل ہوئی ہے۔ موڈرن کے لفظی معنی حالیہ وقت سے متعلق یا مطابق ہونا، ہم عصر ہونا، ہم عصر طرز سے متعلق یا مطابق ہونا وغیرہ قرار دیے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ، عہد وسطیٰ کے خاتمے سے حالیہ وقت تک کے تاریخی دور، یا اس دور سے متعلق اہم شخصیات اور ان کی دانش ورانہ فکر و فہم کے لیے بھی ماڈرن لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جدید میلانات یا رجحانات وغیرہ یا ان کی کوئی مخصوص خصوصیت یا فکر جو عصری زندگی کی عکاسی کرتی ہو، جدیدیت کے زمرے میں رکھی جاتی ہے۔

افتخار عالم لکھتے ہیں:

''سماجیات میں جدیدیت سے وہ ارتقائی عمل مراد ہوتا ہے جس کے توسل سے قدیم سماج، جدید سماج میں منتقل ہوتا ہے لیکن یہ مفروضہ وقت کے حوالے سے توضیح ہو سکتا ہے کہ جو کل تھا وہ قدیم تھا اور جو آج ہے وہ جدید ہے۔ لیکن انسانی سماج اور اس کی دانش ورانہ فہم و فراست کے حوالے سے یہ

نہیں کہا جاسکتا کہ جو ہمارا ورثہ ہے (یعنی ماضی ہے) وہ آج کے مقابلے میں قدیم ہے اور آج جو کچھ بھی موجود ہے وہ سب جدید (یعنی بہتر) ہے۔''۵۲

آج ہم سرسید کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دور میں ان لوگوں کی صف اوّل میں موجود نظر آتے ہیں جو اپنے زمانے کے سماج اور معاشرت کو وقت کے جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے، ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے کوشاں رہے تھے۔

افتخار عالم نے اپنی مختلف کتابوں میں سرسید کو ان کی ہمہ جہتی میں دیکھنے پر زور دیا ہے ان کی بالیدہ فکر اور روشن خیالی کے اَن گنت شواہد پیش کیے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر سرسید سے عقیدت برتنے اور ان کا دفاع کرنے کا کم اور ایک غیر جانب دار مؤرخ اور ماہر آثارِ قدیمہ کے طور پر معروضیت کے ساتھ سمجھنے کا زیادہ نمایاں رہا ہے۔ ایک نقاد اور محقق کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے افتخار عالم نے سرسید کی جدیدیت کو موضوع بنایا۔

سرسیّد اور اقبال (۲۰۱۸ء) از ڈاکٹر محمد افضل حمید

سرسیّد و راقبال کے مؤلف ڈاکٹر محمد افضل حمید ہیں۔ اسے روہی بکس فیصل آباد نے ۲۰۱۸ء کو شائع کیا۔ یہ تالیف ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تالیف سولہ حصوں پر مشتمل ہے۔ فہرست میں حرف آغاز، سرسید اور اقبال کی فکری مماثلت، جداگانہ مسلم تشخص کا تصور، تصورِ احیائے اسلام، مذہب اور سیاست کی اکائی، اصلاح معاشرہ، سرسید اور اقبال کا فکری تفاوت، پیروئ فرنگ اور ترک فرنگ، تعلیمی افکار، مذہبی خیالات، اہم رفقائے سرسید اور اقبال، اکبرالہ آبادی اور اقبال، حالی کا اقبال پر اثر، شبلی نعمانی اور اقبال، اقبال کے سیاسی افکار کے علی گڑھ تحریک پر اثرات، جماعت مجاہدین علی گڑھ، حرف آخر اور مآخذ، شامل ہیں۔

مؤلف سرسید احمد خاں کو دو قومی نظریہ کا بہت بڑا داعی خیال کرتے ہیں۔ یہی

نظریہ اقبالؒ کے افکار کا بھی بنیادی نکتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے ان دو بڑے راہنماؤں میں سب سے بڑی مشترک قدر یہی ہے کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے کبھی بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مؤلف نے اس تالیف کی وجہ ان الفاظ میں تحریر کی ہے:

> ''زیرِ نظر کتاب میں میرے پیشِ نظر یہ بات رہی ہے کہ ان دنوں رجالِ عظیم کی ذہنی اور فکری مماثلتوں کا جائزہ لوں۔ بلاشبہ علامہ اقبال نے وہ راستہ چنا جس پر سرسید احمد خان چلے تھے۔ علامہ محمد اقبال کو سرسید احمد خان کے تہذیبی و تعلیمی افکار سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر بطور سیاست دان علامہ اقبال نے سرسید کی تقلید کی۔ اور دو قومی نظریے کو جداگانہ مسلم تشخص کی اساس سمجھا ہے۔''۵۳

''سرسید اور اقبال کی فکری مماثلت'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے سرسید اور اقبال کے فکری عناصر میں مماثلتوں کی کھوج لگائی ہے۔ علامہ اقبال سرسید احمد خاں اور ان کی تعلیمی و اصلاحی تحریک سے کتنا متاثر تھے؟ اس بات کا اندازہ اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت'' سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نظم بانگِ درا میں شائع ہوئی۔ نظم ''طلبا علی گڑھ کالج کے نام'' میں اقبال نے دراصل علی گڑھ کالج کے طلبہ کے توسط سے نسلِ نو کو مخاطب کیا ہے۔ ناقدین میں ایک طبقہ اقبال کو سرسید کا مقلد سمجھتا ہے، دوسرا طبقہ سرسید مخالف اشعار کا حوالہ دے کر اقبال کو اکبر کی توسیع قرار دیتا ہے۔ مؤلف کے خیال میں اقبال سرسید کے کلی طور پر مداح تھے اور نہ مخالف۔ اقبال نے سرسید کے ان افکار و اعمال کی تعریف کی ہے جنھیں قوم کے لیے مفید جانا اور ان کی مخالفت کی جنھیں قوم کے لیے مضر جانا۔

''جداگانہ مسلم تشخص کا تصور'' کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے کہ سرسید اپنی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے آغاز میں ہندو مسلم اتحاد اور بین المذاہب رواداری کے دعویٰ دار تھے۔ اس ضمن میں مؤلف نے سرسید کے بعض خطوط اور بعض تقاریر کا حوالہ دیا

ہے۔گائے کی قربانی مسلمانوں اور ہندوؤں میں وجہ نزع بنی، جو آج بھی ہے،اس ضمن میں سرسید دوستی کو برقرار رکھنے کے لیے قربانی کو ترک کرنے کے حامی ہیں اور اس پر اصرار کو مسلمانوں کی جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔اسی ضمن میں کالج کے طلبا کی کالج کے اندر قربانی کے کوشش کو ناکام بنادیا اور آئندہ اس طرح کے اقدام کی سختی سے ممانعت کردی۔لیکن جب ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہندی اردو تنازع شروع ہوا تو سرسید کو یقین ہو گیا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں اور ان میں اتحاد ممکن نہیں۔یہی سرسید کے دوقومی نظریہ کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔مؤلف بھی اسی بات سے متفق دکھائی دیتے ہیں:

> ”عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے دوقومی نظریہ کی ابتدا انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے ہوئی لیکن سرسید کے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید کے دوقومی نظریہ کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ہی ہو گیا تھا۔سرسید کی زندگی کے آخری ایام میں ۱۸۹۸ء میں جب ہندوؤں نے دوبارہ اردو ہندی تنازعہ کو ہوا دی تب بھی سرسید نے اپنے بیانات اور اس موقع پر لکھے گئے مضمون میں ہندوؤں کے اس اقدام کو قومی تعصب قرار دیا۔“[۴۵]

قبالؒ کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغرب کے جدید تصور قومیت کو رد کرتے ہیں اور اسلام کے تصور قومیت کو عین فطرت مانتے ہیں۔جس کے مطابق دنیا کے کسی بھی کونے میں بسنے والا مسلمان ملت اسلامیہ کا فرد ہے۔وہ نسلی، قومی یا جغرافیائی سرحدوں میں رہنے والوں کو ایک قوم خیال نہیں کرتے۔۱۲ء۔۱۹۱۱ء میں عرب ممالک کی ترکی سے علیحدگی کی تحریک کے نتیجے میں مکمل علاحدگی کو ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے سے تعبیر کیا۔تحریک خلافت،تحریک ترک موالات، شفیع لیگ کی جناح لیگ سے علاحدگی، سائمن کمیشن کی آمد کے مواقع پر علامہ اقبال نے اپنے اشعار، بیانات، خطبات اور کردار کے ذریعے اپنے نظریہ کی پائیداری

کا ثبوت فراہم کیا۔ اس طرح اقبال نے سر سید کے تصور قومیت کو ٹھوس فلسفیانہ بنیادوں پر استوار کیا۔

''تصور احیائے اسلام'' میں مؤلف نے بیان کیا ہے کہ سر سید احمد خاں اور اقبالؒ دونوں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواہاں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید کی تمام تر مساعی، خواہ وہ سیاسی تھیں یا تہذیبی، ادبی تھیں یا معاشرتی، ان کا مقصد صرف اور صرف قوم کی اصلاح تھا۔ سر سید رجائیت پسند تھے اور قوم کی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے مدد کے خواست گار تھے۔

مؤلف نے ملت اسلامیہ کی ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کی کڑیاں ملاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سر سید احمد خاں تک احیائے ملت کی یہ تحریک شاہ ولی اللہ کے توسط سے پہنچی تھی۔ سر سید احمد خاں کے بعد یہ تحریک شبلی، حالی، نذیر، آزاد وغیرہ سے ہوتی ہوئی اقبال تک آ پہنچی۔ اقبال کے عہد میں مایوسی کا عالم وہ نہ رہا تھا جو سر سید کے عہد میں تھا۔ اقبال کا عہد، جدوجہد کا عہد تھا۔ اقبال نے اپنی شاعری اور اپنے افکار سے قوم کے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ وہ اس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے جانا چاہتے تھے۔ اقبال کی شاعری عظمت رفتہ کی یاد سے بھری پڑی ہے لیکن عظمتِ رفتہ کی یاد میں اقبال محض نوحہ گر بن کر رک نہیں جاتے ہیں بل کہ امید و فتح کے پیام بر بن کر اپنی قوم کی راہ نمائی کرتے ہیں۔''[۵۵]

قبال کی شاعری رجائیت اور امید سے لب ریز ہے۔ مؤلف نے اقبال کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے[۵۶]

''مذہب اور سیاست کی اکائی'' کے عنوان کی ذیل میں سر سید احمد خاں کے تعقل محض کی پیداوار مذہبی نظریات سے اقبال کو اختلاف ہے لیکن مذہب اور سیاست کی ایک اکائی ہونے پر اقبال سر سید سے متفق دکھائی دیتے ہیں۔ سر سید کا مذہب اور مذہبی عقائد کی تشریحات کا مقصد مسلمانوں کو اس احساس کم تری سے نکالنا تھا جو عیسائی پادریوں کے اسلام پر کیے گئے اعتراضات کے بعد عام طور پر جمہور پر طاری ہو گیا تھا۔ عقیدۂ توحید کے زیر اثر، اقبال، حیات انفرادی اور اجتماعی دونوں کے جملہ متعلقات و مظاہر کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنے، سمجھنے کی کوشش میں سیاست، مذہب، معیشت اور ثقافت کو بھی ایک اکائی کی صورت میں دیکھتے، سمجھتے اور بیان کرتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کو لوتھر اور روسو کے نظریت سے اختلاف کرتے ہیں کہ انھوں نے سیاست کو مذہب سے الگ کر کے اہل مغرب کو ملک گیری کی ہوس میں مبتلا کر دیا۔ اقبال کے نظریہ کی بنیاد توحید اور رسالت ہیں۔

''اصلاحِ معاشرہ'' کے تحت مؤلف نے بیان کیا ہے کہ سر سید احمد خاں نے معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ مغربی تہذیب و ثقافت کا تتبع، جدید تعلیم، اردو ادب کو نئی جہت سے متعارف کرانا، مذہبی عقائد کی نئی تعبیرات و تشریحات اور مختلف تنظیموں اور اداروں کا قیام، سب معاشرتی اصلاح کے خاطر تھا۔ سر سید کی مانند اقبال بھی امت کے غم میں اللہ کے حضور رونے، گڑگڑانے اور فریاد کرنے کی سنت نبویؐ

پرعمل کیا۔ دونوں راہ نماؤں نے ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے نظریے پرعمل کیا۔

''سرسید اور اقبال کا فکری تفاوت'' کے زیرعنوان مؤلف نے بتایا ہے کہ اقبال نے بلاشبہ سرسید کے نظریات کا اتباع کیا لیکن صرف ان نظریات کا، جنھیں وہ قوم کے لیے مفید سمجھتے تھے اور جنھیں قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے ان کی مخالفت بھی کی۔ سرسید مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید کے قائل تھے، اکبرالہ آبادی ایسے طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے جو مشرقی تہذیب وتمدن اور روایات واقدار کو کسی صورت قربان کرنے کو تیار نہ تھے۔۔ اقبال نے مغربی تہذیب وتمدن کا مطالعہ یورپ میں بیٹھ کر کیا اور وہ اسلام کے اصولوں کو ترک کرنے کے سخت مخالف تھے مغربی تہذیب کو اپنانا تو دور کی بات ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اقبال کی مغرب پر تنقید کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں مغربی سیاست، مغربی معاشرت اور مغربی فکریات شامل ہیں۔ اقبال نے مغربی سیاسیات کو انسانیت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز تصور کیا ہے۔

''تعلیمی افکار'' کے عنوان کے تحت مؤلف نے بیان کیا ہے کہ اقبال سرسید کے تعلیمی افکار اور مغربی طرزِ تعلیم کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ سرسید کے تعلیمی نظریات سے اختلاف کیا ہے جس کا ثبوت اقبال کی نظم ''فردوس میں ایک مکالمہ'' ہے۔ اقبال اسلام کے تعلیمی نظریات سے مکمل طور پر متفق ہیں۔ سعدی شیرازی، ان سے بڑھ کر مولانا جلال الدین رومی کی تعلیمات سے اقبال بہت زیادہ متاثر تھے۔ اقبال نے اسلام کے متعلق اعتراضات کا جواب دینے اور ان کے موجودہ سائنس کے عین مطابق ہونے کی بجائے اسلام کو اس اصول پر پرکھا ہے کہ کیا اسلام انسان کو انسانیت کی معراج پر پہنچانے کے لیے مفید ہے یا نہیں۔

''اہم رفقائے سرسید اور اقبال'' کے ذیلی عنوان ''اکبرالہ آبادی اور اقبال'' کے تحت مؤلف نے بیان کیا ہے کہ سید اکبر حسین رضوی اکبرالہ آبادی (۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء)

سرسید تحریک کے ردعمل میں ابھرنے والی شخصیات میں نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی کو ان کے سیاسی افکار کے باعث اقبال انھیں اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ اکبر سرسید کی مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید کے خلاف تھے اور ان کا ٹھٹھہ اڑاتے تھے۔ اکبر کے تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی افکار کا اقبال پر بہت اثر ہوا۔ اکبر، چکبست اور اقبال ایسے شعرا ہیں جنھوں نے بالخصوص ہندوستانی سیاسیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مؤلف نے اکبر اور اقبال میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اکبر قدیم رسم و رواج اور روایات کے دل دادہ ہیں جب کہ اقبال اجتہادی سوچ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمیں احیائے ملتِ اسلامیہ کے لیے تجدید فکار کرنا ہوگی۔ اکبر تمدن و معاشرت میں "مشرقیت" کو روا رکھنے کے قائل تھے، جب کہ اقبال مشرقیت اور مغربیت کی بجائے آفاقیت کے قائل تھے اور تمام نوع انسانی اور تمدن ہائے انسانی کو اسلامی تمدن کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔"[۵۷]

سی طرح اکبر کے اقبال پر اثرات کا جائزہ مؤلف نے اںفاظ میں پیش کیا ہے:

"..... اقبال بلا شبہ اتنے بڑے مفکر تھے کہ آنے والے زمانے کو بھانپ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود یہ واضح حقیقت ہے کہ اگر اکبرالہ آبادی قوم کے احساسِ خودنظری کو بیدار نہ کرتے تو علامہ اقبال اتنی جلدی مقبول ہوتے، نہ موثر جب اقبال کے فکر و فلسفہ نے شہرت پانا شروع کی اور ن کے افکار میں زیادہ وسعت، گہرائی اور گیرائی آئی تو اکبر (۱۹۲۱ء میں) نتقال کر جاتے ہیں۔ مولانا گرامی کے نام خط میں اقبال نے اکبر کے متعلق جو رائے دی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کی اکبر سے عقیدت و محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔"[۵۸]

"حالی کا اقبال پر اثر" کے عنوان کے تحت مؤلف بیان کرتا ہے کہ قومی و ملی شاعری کے طرح ڈالنے والے شاعر بلاشبہ مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ سرسید کا یہ تصور کہ

ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے استعمال ہونا چاہیے، کے سب سے بڑے مقلد حالی اور شبلی تھے۔ حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری' میں پہلی بار اردو شاعری کے لیے مغربی معیار کے تنقیدی اصول وضع کیے اور گل و بلبل کی شاعری کے دور میں نئے عصری تقاضوں کے مطابق جدید موضوعات کو اردو شاعری میں جگہ دی۔ اردو میں سوانح نگاری کے علاوہ اپنے مضامین کے ذریعے اردو زبان کو سنوارتے رہے۔ حالی کی مثنوی مدوجزر اسلام جو بعد میں مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہوئی، نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ اقبال نے اس عہد میں جنم لیا جس میں حالی کی مسدس کا شہرہ تھا۔ جب اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کا آغاز کیا، اس عہد میں حالی، نذیر اور شبلی وغیرہ بھی ان جلسوں کی شان ہوتے تھے۔

۱۹۰۳ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اپنی نظم ''تصویرِ درد'' پڑھی جو اپنے موضوع، اسلوب اور طرزِ ادا کی بنا پر اس قدر پسند کی گئی کہ انجمن کے لیے چندے کی بارش شروع ہوگئی۔ ایک شعر سے متاثر ہوکر حالی نے گراں قدر رقم انجمن کو چندے میں دے دی۔ یہ نظم سننے والوں میں، حالی، مولانا ارشد گورکانی، سر عبدالقادر، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی اور سر محمد شفیع نمایاں تھے۔ جب اقبال نے اپنی نظم ختم کی تو خواجہ حسن نظامی نے اپنا عمامہ اتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا۔ ۱۹۰۳۔۰۴ء کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال حالی سے کس قدر عقیدت رکھتے تھے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اپنے مقالہ ''حالی کا اثر اقبال پر'' میں مسدسِ حالی کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے اشعار میں مسدس سے مناسبت کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی مناسبت والے اشعار بھی درج کردیے ہیں۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے حالی ور اقبال کے شعری تقابل کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حالی اور اقبال میں فرق بس اتنا سا ہے کہ حالی کے کلام میں یاس کا عنصر نمایاں ہے جب کہ اقبال کا کلام سراسر آس ہے اور یہی آس کا پہلو اقبال کی شاعری کو حالی کی

شاعری سے نمایاں اور ممتاز کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی حالؔی پر اقبالؔ کو ترجیح دی ہے۔

"شبلی نعمانی اور اقبالؔ" کے عنوان کی ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ شبلی نعمانی، حالؔی کے طرح سرسید کے عقیدت مند تھے اور نہ اکبؔر کی طرح مخالف۔ لیکن بہت سے امور میں علی گڑھ تحریک سے فیض یافتہ تھے اور سوچ ان کی مختلف تھی۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی خالی ہوئی تو شبلی نے عرضی دی اور ۱۸۸۳ء میں کالج میں آگئے۔ علی گڑھ کالج نے شبلی نعمانی کو اردو ادب میں اس عظیم مقام تک پہنچا دیا جو شاید انھیں کہیں اور سے نہ ملتا۔ مؤلف نے شبلی کے علی گڑھ تحریک سے علاحدگی کی وجوہات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> "۱۹۱۲ء کے بعد شبلی نعمانی علی گڑھ تحریک کے بالکل خلاف ہو گئے اور اپنے راستے یکسر جدا کر لیے۔ علی گڑھ کی مخالفت ایک بڑا سبب شبلی پر جمال الدین افغانی کے اثرات بھی تھے۔ شبلی جب مصر گئے تو افغانی کے شاگرد خاص محمد عبدہ سے ملے۔ افغانی کے اس شاگرد نے بھی شبلی کو علی گڑھ کے نظریات کے خلاف بہت اکسایا۔ شبلی کی علی گڑھ کے سیاسی افکار سے اختلاف کی وجہ عطیہ فیضی کی محبت بھی تھی۔ عطیہ فیضی جو کانگریس کے مسلمان کے پریزیڈنٹ بدرالدین طیب جی کی ایک قریبی عزیز تھیں اور علی گڑھ کے سخت خلاف تھیں۔" ۵۹

شبلی نعمانی اور اقبال کے درمیان اچھے مراسم قائم تھے۔ چوں کہ شبلی اور اقبال دونوں سید جمال الدین افغانی سے متاثر تھے اسی لیے پروفیسر افتخار حسین شاہ نے اقبال اور پیروی شبلی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اقبال، شبلی اور ابوالکلام آزاد کے سیاسی نظریات کے خلاف تھے۔ اس کی بنیادی وجہ شبلی اور آزاد کا کانگریس کا حمایتی ہونا ہے۔

"اقبال کے سیاسی افکار کے علی گڑھ تحریک پر اثرات" کے عنوان کی ذیل میں

بیان کیا گیا ہے کہ اقبال علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوئے تو سرسید سے دوقومی نظریہ، اصلاح معاشرہ اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا تصور پایا۔ ان کے رفقا حالی، شبلی، نذیر کے اثرات قبول کیے۔ سرسید کے جانشینوں میں سے محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں سے بہت کچھ سیکھا۔ سرسید کے ہم عصر اکبر سے متاثر ہوئے۔ اپنے اساتذہ میر حسن اور ٹامس آرنلڈ کے سرسید نواز افکار سے اثرات قبول کیے۔ سرسید تحریک بھی اقبال کے افکار سے فیض یاب ہوئی۔ اس ضمن میں مؤلف رقم طراز ہیں:

> "جس طرح اقبال علی گڑھ تحریک سے متاثر ہوئے اور سرسیّد احمد خاں سے دوقومی نظریہ، اصلاح معاشرہ اور نشأۃ ثانیہ کے تصور کی تحریک پکڑی ان کے رفقا حالی، شبلی، نذیر، سے اثرات قبول کیے۔ ان کے ہم عصر اکبر کی رائے سے متاثر ہوئے اور سرسید کے جانشینوں محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں سے بہت کچھ سیکھا، اپنے اساتذہ میر حسن اور ٹامس آرنلڈ کے سرسید نواز افکار سے متاثر ہوئے، بعینہٖ اسی طرح اقبال کے افکار نے علی گڑھ تحریک کو متاثر کیا اور وابستگانِ علی گڑھ کی ذہنی اور سیاسی رہنمائی کی۔"[۱۰]

۱۹۰۷ء میں اقبال نے یورپ میں ایک نظم "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" تحریر کی۔ سرسید کی وفات کے بعد جب علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے کی تحریک چلی تو اقبال نے اس تحریک میں حتی المقدور حصہ لیا۔ اقبال، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اردو، فارسی اور فلسفہ کے شعبہ جات کے ایک عرصے تک اکسٹرنل ممبر رہے۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "علی گڑھ میگزین" میں اقبال کے مضامین اور تخلیقات تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔

مؤلف بیان کرتے ہیں:

> "جس طرح علی گڑھ کی عظیم شخصیات سرسیّد احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، سر ٹامس آرنلڈ، نذیر احمد وغیرہ نے اقبال کی ذہن سازی میں بڑا اہم کردار ادا کیا بعینہٖ اسی طرح علامہ اقبال نے اپنے افکار سے علی

گڑھ کی نئی پود کو، جنھیں وہ نسلِ نو کے نمائندگان سمجھتے تھے، بہت متاثر کیا۔
سیاسی سطح پر اقبال کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افکار سے ''آل انڈیا مسلم لیگ'' اور دیگر قائدین تحریک پاکستان کی رہ نمائی فرمائی۔
عامۃ الناس کی اجتماعی ذہن سازی میں بھی اقبال کا کردار دیگر قائدین سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی شاعری نے لوگوں میں جوش اور ولولہ بھر دیا۔ علامہ نے سر سیّد احمد خان اور ان کے رفقا کے سیاسی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی شاعری کو استعمال کیا۔''[۱۶]

''جماعتِ مجاہدین علی گڑھ'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ عوام کے ساتھ ساتھ نئی نسل میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ جنھوں نے تحریکِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا، اقبال کے افکار سے خاص طور پر متاثر رہے ہیں۔ جب مسلم یونیوسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر سید ظفر الحق کی سربراہی میں ۱۹۳۲ء میں ''جماعتِ مجاہدین علی گڑھ'' قائم کی گئی تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی منشوری دستاویز تیار کرنے کے بعد اقبال سے ملاقات کی اور ان سے آرا طلب کیں۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان خط کتابت بھی ہوئی۔ اقبال کے افکار سے متاثر ہونے والوں میں پروفیسر اصغر عباس نے اپنے مقالہ ''سرسید اقبال اور علی گڑھ'' میں، سجاد حیدر یلدرم، ڈاکٹر ظفر الحسن، پروفیسر ہادی حسین، رشید احمد صدیقی، پنڈت جبیب الرحمٰن شاستری، ممنون حسن خاں، اسرار جعفری، آل احمد سرور، خواجہ منظور حسین، اسلوب انصاری، مسعود حسین خاں، ذاکر حسین اور شیخ عطاء اللہ کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے خواجہ غلام السیدین (حالی کے پڑنواسے)، عشرت حسین انور، ظفر احمد صدیقی، سر راس مسعود، پروفیسر کبیر احمد جائیسی، ڈاکٹر حیات عامر، عبدالغفار شکیل، قاضی افضال حسین، ابوالکلام قاسمی، پروفیسر نور الحسن نقوی، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر منظر عباس اور دیگر شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔

''حرفِ آخر'' میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ علامہ اقبال، سرسید اور ان کی تحریک کے

سیاسی پہلو سے بہت متاثر تھے۔ اس تحریک کے سلسلے کی توسیع ان کے افکار سے ہوئی۔ تہذیبی سطح پر سرسید اور اقبال دونوں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریکِ احیا سے متاثر تھے۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر محمد افضل حمید نے جس انداز میں سرسید، اکبر، حالی، شبلی، نذیر کے اقبال پر اثرات۔ ان کی مماثلت اور اختلافی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور پھر سرسید تحریک کے اقبال اور اقبال کے سرسید تحریک پر اثرات کا جس طرح استدلال کے ساتھ مطالعہ پیش کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ جس مقصد کے تحت انھوں نے ''سرسیّد اور اقبال'' تحریر کی، اس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

سرسید احمد خاں کا مقدمہ: اہلِ علم و دانش کی عدالت میں، (س۔ن)

از رعایت اللہ فاروقی

رعایت اللہ فاروقی کی تالیف سرسید احمد خاں کا مقدمہ: اہلِ علم و دانش کی عدالت میں (س۔ن) میں سوادِ اعظم اہلِ سنت چترال پاکستان سے شائع ہوئی۔ یہ کتابچہ کل پندرہ (۱۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب بچہ کی وجہِ تالیف بیان کرتے ہوئے مؤلف رقم طراز ہے۔

> ''پاک و ہند کے باسیوں کا یہ مشترکہ مزاج ہے کہ اگر ان کے سامنے کسی شخصیت کا ہوا کھڑ کر دیا جائے تو یہ آنکھیں بند کر کے اس کے پرستار ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے میں اس شخصیت کی مکمل جانچ پڑتال تو درکنار بعض بالکل سامنے کی ایسی باتوں کو بھی نظر نداز کر دیا جاتا ہے کہ جن بنیادوں پر ہلہ بولا جا سکتا ہے شخصی سحر کے ہوتے جاہلوں کے ''کنویں والی سرکار'' سے لے کر پڑھے لکھے طبقے کے سرسید سید احمد خان تک پہنچتے ہیں۔ جاہل طبقہ اگر مجاوروں اور زائروں کے چوغے پہن کر شخصیت پرستی کا فریضہ ادا کر رہا ہے تو پڑھا لکھا طبقہ اکیڈمیاں اور کونسلیں بنا کر اس میدان میں پیش قدمی کرتے

ہوئے کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے چوں کہ سرسید احمد خاں کی شخصیت کو
ماہتاب بنا کر پیش کرنے کے لیے باقاعدہ ادارے کام کر رہے ہیں اور
بڑے بڑے محققین سرسید کی شخصیت کے نئے نئے گوشوں سے پرانے
پرانے پردے سرکا کر اپنے ایک دعوے (سرسید احمد خاں برصغیر کے
مسلمانوں کے عظیم محسن ہیں) کے بیے دلیلوں کا بندوبست کر رہے ہیں تو
میں سوچنے لگا کہ کیوں نہ اس تحقیقی کام میں بھی حصہ لے لوں اور پھر مجھ میں
اس کام کے لیے اس لیے بھی تحریک پیدا ہوئی کہ ان اداروں میں سے ایک
دارے کے ایک محقق صاحب کی مجھ سے اکثر و بیشتر ملاقات رہتی ہے اور
پنی اکثر ملاقاتوں میں وہ دعا سلام کے بعد سرسید احمد خاں کی حمد و ثنا شروع
کر دیا کرتے ہیں اور ان کا اصرار ہوتا ہے کہ میں بھی سرسید کا مطالعہ کروں،
چناں چہ اس تحقیق کے نتیجے میں جو حقیقت مجھ پر کھلی اس نے مجھے مجبور کیا کہ
سطح قرطاس پر سرسید احمد خاں کی شخصیت کے کچھ گوشوں سے بھی پردے
سرکا دوں اور یوں کہ اس نقاب کشائی کے لیے ڈوری بھی سرسید احمد
خاں، نامور مفکرین اور قد آور مؤرخین کی تحریروں کی استعمال کی جا رہی ہے
اس بیے ان سطور کو دیوانے کی بڑ قرار دے کر نظر انداز کرنا قدرے دشوار ہوگا
ورنہ ہی یہ کہہ کر اس کی وقعت کم کی جا سکے گی کہ چھوڑ دجی یہ تو ملاؤں کی،
باتیں ہیں ... !''[۶۲]

مسلمانانِ ہند کے بہترین سیاسی اور تعلیمی نظام کے اعتبار سے سر ولیم ہنٹر کی تین
آرا شامل کی گئی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتنے عمدہ تھے لیکن ان میں
انگریزوں نے جس طرح بگاڑ پیدا کیا اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مؤلف تحریر کرتے ہیں:

''چناں چہ مسلمانوں کا زور توڑنے کے لیے فرنگی نے ان کا یہ زیور چھین لینے
کی پالیسی اختیار کی تاکہ جہالت کے اندھیروں میں گر کر یہ لوگ نظریاتی
عتبار سے بھٹک جائیں اور اسے سکون سے حکمرانی کرنے کا موقع مل

جائے۔ یہ حقیقت خود سر ولیم ہنٹر کی زبانی سنیے: ''اپنی عملداری کے اول پچھتر سال میں یعنی ۱۸۳۲ء میں ہم نے اپنے انتظامی عہدے دار تیار کرنے کے لیے مسلمانوں کے اسی سابقہ نظامِ تعلیم کو جاری رکھا اس دوران میں ہم نے اپنا سر رشتہ قائم کر دیا تھا اور جونہی اس سے ایک نئی نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو اکھاڑ کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں کی ملازمت کے عام راستے بند ہو گئے۔''۶۳

سر ولیم ہنٹر کی آرا کے ساتھ ساتھ جن مغربی شخصیات کی آرا کو شاملِ کتابچہ کیا گیا ہے ان میں میجر باسو، ہنری ہیر نگٹن، لارڈ میکالے، مسٹر گلیبون، الیگزینڈر ہملٹن وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ نیز سر سید احمد خاں کا نقطۂ نظر شامل کر کے اس کو رد کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی، حضرت علامہ ابوالحسن ندوی، علامہ محمد اقبال کی آرا بھی شامل کی گئی ہیں۔

سر سید کی آرا کے شانہ بہ شانہ اس کتابچہ میں تفسیر القرآن اور تبیین الکلام میں سے مثالیں پیش کر کے اور ساتھ ہی ساتھ علمائے حق کے فتوے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سر سید دراصل اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلم دشمنی میں اس حد تک آگے نکل گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی سچی خیر خواہی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ اس حوالے سے مؤلف بیان کرتے ہیں:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرعون کی فرعونیت کا مقابلہ کرنے کے لیے موسوی صفات ترک کر کے فرعونی قبائح کو اختیار کرنا کہاں کی منطق ہے؟ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کی ذلت جو علاج سر سید نے دریافت کیا تھا یعنی مغربی تہذیب کا اختیار کیا جانا کیا اس علاج کے بعد مسلمان یورپین قوام کی نگاہوں میں باعزت مقام پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟ کیا مغربی تہذیب کے اختیار کر لینے کے باوجود مشرق کا مسلمانانِ مغرب کی سڑکوں پر ذلیل نہیں کیا جا رہا؟ لندن میں پاکستانیوں کو ایسا کرنے کے لیے

منجملہ دیگر الفاظ کے ایک جملہ "پاکی" بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ یہ لفظ "پاکی" ہمارے ملک "پاکستان" کے نام کا مخفف ہے۔اب سر سید پرست مجھے بتائیں کہ سویلائزیشن اختیار کرنے کے بعد وہ سویلائزڈ قوموں کی نظروں میں حقیر کیوں ہیں؟ سر سید احمد خاں نے جہاں مغربی تعلیم دتمدن پر زور دیا وہیں برصغیر کے ان تعلیمی اداروں کی ڈٹ کر مخالفت بھی کی جو اسلامی تعلیم کی نشاۃ ثانیہ کی جدو جہد کر رہے تھے۔چناں چہ سر سید احمد خاں تہذیب الاخلاق میں رقم طراز ہیں: "اس زمانے میں پرانے طریق پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے یہیے علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی اور لاہور میں جاری کیے ہیں مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور لغو ہیں۔" ۹۴

مصنف نے بہت مختصر مگر جامع لکھا ہے۔انھوں نے سر سید کو بڑے احسن انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ان کا اسلوب معروضی ہے، حقائق کے بھرپور ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد حسین رزاقی، سر سید اور اصلاح معاشرہ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۵۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۶۔ ثریا حسین، سر سید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۱

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۹

۹۔ ایضاً، ص ۴

۱۰۔ سی ڈبلیو ٹرال، سر سید احمد خاں. فکر اسلامی کی تعبیر نو، مترجمین ڈاکٹر قاضی افضال حسین، محمد اکرام چغتائی، لاہور: اے این اے پرنٹرز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۔۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۱۶۔ زاہد چودھری، روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سر سید احمد خان، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۹ء، ص ۹۶

۱۷۔ ایضاً،ص ۱۰۶
۱۸۔ ایضاً،ص ۱۳۰
۱۹۔ ایضاً،ص ۸۵
۲۰۔ جمیل یوسف، مسلمانان برصغیر کے محسن اعظم سرسید احمد خان، لاہور: کتاب ورثہ،۲۰۰۲ء،ص ا
۲۱۔ ایضاً،ص ۱٦
۲۲۔ ایضاً،ص ۸۳،۸۴
۲۳۔ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)،۲۰۰۲ء،ص ۳۵
۲۴۔ ایضاً،ص ۷۹
۲۵۔ ایضاً،ص ۱۹۵
۲٦۔ ایضاً،ص ۲۴۹
۲۷۔ ڈاکٹر ظفر حسین، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ،۲۰۰۳،ص ۱۲۰
۲۸۔ ایضاً،ص ۱۴۲
۲۹۔ ایضاً،ص ۱۵۹
۳۰۔ ایضاً،ص ۲۹۷
۳۱۔ ایضاً،ص ۳۱۹
۳۲۔ ایضاً،ص ۲۳۰
۳۳۔ نسیم عباس، احمر، سرسید شناسی کے چند اہم زاویے، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۲۰۱۱ء،ص ۷
۳۴۔ ایضاً،ص ۱۸
۳۵۔ ایضاً،ص ۲۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۸
۳۷۔ ایضاً، ص ۲۸۔۲۹
۳۸۔ ایضاً، ص ۳۰
۳۹۔ ایضاً، ص ۳۳
۴۰۔ ایضاً، ص ۳۴
۴۱۔ ایضاً، ص ۳۷
۴۲۔ ایضاً، ص ۶۸۔۶۹
۴۳۔ عبدالحیٔ، اردو صحافت اور سر سید احمد خاں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰
۴۴۔ ایضاً، ص ۶۵
۴۵۔ ایضاً، ص ۶۹
۴۶۔ ایضاً، ص ۷۵
۴۷۔ ایضاً، ص ۸۰
۴۸۔ ایضاً، ص ۸۱
۴۹۔ پروفیسر افتخار عالم خاں، سر سید اور جدیدیت، لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱
۵۰۔ ایضاً، ص ۵۲
۵۱۔ ایضاً، ص ۸۷
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۴۵
۵۳۔ ڈاکٹر محمد افضل حمید، سر سید اور اقبال، فیصل آباد: روہی بکس، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰
۵۴۔ ایضاً، ص ۲۱۔۲۲
۵۵۔ ایضاً، ص ۴۶
۵۶۔ ایضاً، ص ۴۶۔۴۷
۵۷۔ ایضاً، ص ۷۶

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۶۲۔ رعایت اللہ فاروقی، سرسید احمد خاں کا مقدمہ: اہلِ علم و دانش کی عدالت میں چترال پاکستان، سوادِ اعظم اہلِ سنت، (س۔ن) ص ۳

۶۳۔ ایضاً، ص: ۴

۶۴۔ ایضاً، ص: ۱۲۔۱۳

کتب

☆ آغا اشرف، سر سید احمد خاں: شخصیت و کردار کے آئینے میں، لاہور: تخلیق مرکز، (س۔ن)
☆ آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، 1947ء
☆ آل احمد سرور، نئے اور پرانے چراغ، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1957ء
☆ ڈاکٹر، ابوسفیان اصلاحی، مطالعاتِ سر سید، لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2018ء
☆ ابومحمد عبدالحق حقانی، تفسیر فتح المنان المشہور بہ مقدمہ تفسیر حقانی، دہلی: دارالاشاعت تفسیر حقانی، 1938ء
☆ سید محمد احمد، سر سید احمد خاں، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، س۔ن
☆ اختر الواسع، سر سید کی علمی تحریک، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1991ء
☆ ارشد علی، آثار الصنادید: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، جہلم: آواز عالمگیر ایجوکیشنل پبلشرز، 1908ء
☆ اصغر عباس، سر سید، اقبال و علی گڑھ، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1987ء
☆ ڈاکٹر اصغر عباس، سر سید کی صحافت، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1975ء
☆ اطہر پرویز، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، علی گڑھ: اردو گھر، 2007ء
☆ شاہ محمد اشرف علی تھانوی، افادات لاہور: اصلاح الخیال، کتب خانہ جمیلی، س۔ن
☆ افتخار عالم خاں، سر سید اور جدیدیت، لاہور: سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، 2014ء

☆ افتخار عالم خاں، سرسید اور سین ٹیفک سوسائٹی ایک بازیافت، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 2000ء
☆ افتخار عالم خاں، مسلم یونی ورسٹی کی کہانی، عمارتوں کی زبانی، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005ء
☆ اکبر مسیح، تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن، لاہور: پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، 1959ء
☆ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید،
1۔ لاہور: ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، 1984ء
[کان پور: مطبوعہ نامی پریس، 1901ء
2۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1939ء
3۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1990ء
4۔ لاہور: (پہلا حصہ) ٹرسٹ فار ایجوکیشن، 2000ء
☆ امین زبیری، محمد، تذکرۂ سرسید، لاہور: پبلشرز، 1961ء
☆ انشاء اللہ، مولوی، محمد، سوانح سرسید مرحوم، لاہور: حمیدیہ سٹیم پریس، 1910ء
☆ انیس فاطمہ بریلوی، سیّدہ، کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، 1966ء
☆ ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر، علی گڑھ تحریک تا قیامِ پاکستان، کراچی: الحمد اکادمی، 1998ء
☆ اے۔ ایچ کوثر، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کار کا حصہ، کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، 1984ء
☆ تصدق بخاری، سید، محرّف قرآن، سرسید.....،
1۔ لاہور: ایچ وائی پرنٹرز، س۔ن
2۔ نوشہرہ: ادارہ العلم والتحقیق، 1990ء
☆ ڈاکٹر ثریا حسین، سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ

ہاؤس، 1993ء
☆ جلیل احمد قدوائی، سر سید علیہ الرحمہ، کراچی: راس مسعود سوسائٹی، 1985ء
☆ جمال الدین افغانی، امترجمہ: مولوی عبدالحنان، نیچریت، لاہور: حمیتِ اسلام پریس، 1349ھ مطابق 1930ء
☆ جمیل یوسف، سر سید احمد خاں: شخصیت اور فن، اسلام آباد۔ اکادمی ادبیات پاکستان، 1999ء
☆ خلیق احمد نظامی، سر سید ایک تعارف، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1991ء
☆ خلیق احمد نظامی، سر سید کی فکر اور عصرِ حاضر کے تقاضے، نئی دہلی انجمن ترقی اردو ہند، 1993ء
☆ خلیق احمد نظامی، مترجمہ اصغر عباس، سید احمد خاں، نئی دہلی: وزارتِ اطلاعات حکومتِ ہند، 1994ء
☆ خلیق احمد نظامی علی گڑھ کی علمی خدمت، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1994ء
☆ راشد محمود رضوی، مفتی، سر سید احمد خاں کا اصلی روپ، کراچی. مکتبہ نورِ بصیرت، 2013ء
☆ رعایت اللہ فاروقی، سرِ سید احمد خاں کا مقدمہ اہلِ علم و دانش کی نظر میں، چترال: سوادِ اعظم اہلسنت، س۔ن
☆ ریاض الرحمٰن شروانی، مقالات قومی سر سید سیمینار، علی گڑھ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، 2000ء
☆ ڈاکٹر رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور، ڈاکٹر، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1985ء
☆ زاہد چوہدری، سر سید احمد خاں، لاہور. ادارہ مطالعہ تاریخ، 1999ء

- ☆ سلمہ اللہ، حافظ، محمد، ردّ نیچری، لاہور: گلزارِ محمدی سٹیم پریس، 1926ء
- ☆ سرسید احمد خاں، احکام طعام اہلِ کتاب، لاہور: مطبع مصطفائی، س۔ن
- ☆ سرسید احمد خاں، ازالۃ الغین عن ذی القرنین، لاہور: کسان پریس۔ ن
- ☆ سرسید احمد خاں، الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ، علی گڑھ مطبع فیضِ عام، طبع اول: س۔ن لاہور: مسلم پرنٹنگ پریس، س۔ن
- ☆ سرسید احمد خاں، النظر فی بعض مسائل الامام غزالی، لاہور مصطفائی پریس، س۔ن
- ☆ سرسید احمد خاں، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیٰ ملۃ الاسلام مجروی، غازی پور و علی گڑھ 1863ء/1865
- ☆ سرسید احمد خاں، تحریر فی اصول تفسیر، لاہور: نول کشور، سٹیم پریس، 1913ء پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1995ء
- ☆ سرسید احمد خاں، ترقیم فی اصحاب الکہف والرقیم، آگرہ. مطبع مفیدِ عام، 1307ھ مطابق 1890ء
- ☆ سرسید احمد خاں، تفسیر الجن والجانّ علی ما فی القرآن، لاہور: اسلامیہ سٹیم پریس، س۔ن
- ☆ سرسید احمد خاں، تفسیر السمٰوت، نول کشور سٹیم پریس، لاہور 1909ء
- ☆ سرسید احمد خاں، تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان در "تصانیف احمدیہ"،

. . ایضاً... جلد اول 1۔ علی گڑھ: علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، 1880ء

... ایضاً 2...۔ لاہور: مطبع گلزارِ محمدی، 1891ء

... ایضاً جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم: لاہور: نول کشور پرنٹنگ پریس، س۔ن

... ایضاً... جلد ہفتم: آگرہ: مطبع مفید عام، 1904ء ناقص

... ایضاً... (مکمل) لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، 1994ء

. ایضاً . پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1995ء

☆ س سید احمد خاں، خلق الانسان مافی القرآن، اکبرآباد مطبع مفید عام، 1309ھ مطابق 1891/92ء

☆ سرسید احمد خاں، فضائل الامام من رسائل حجۃ الاسلام، لاہور مصطفائی پریس، س۔ن

☆ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید،

1۔ (مرتبہ: سید معین الحق)، کراچی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، 1966ء

ایضاً 2۔ (مرتبہ: خلیق انجم)، دہلی: اردو اکادمی، 1992ء

☆ سرسید احمد خاں، اسباب بغاوتِ ہند،

1۔ (مقدمہ: ابواللیث صدیقی)، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1957ء

...ایضاً 3...۔ (مقدمہ: فوق کریمی)، علی گڑھ: یونی ورسٹی پبلشرز، 1958ء

ایضاً 2۔ (تعارف: محمد عبداللہ قریشی)، لاہور: آئینۂ ادب، 1969ء

ایضاً 4۔ (مقدمہ فوق کریمی)، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1985ء

ایضاً 5۔ (مقدمہ: فوق کریمی)، لاہور: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ، 1991ء

ایضاً 6۔ (مرتبہ: سلیم الدین قریشی)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1997ء

ایضاً 7۔ (عکسی نقل، طبع اوّل آگرہ)، پٹنہ: خدا بخش لائبریری، 1999ء

☆ سرسید احمد خاں، اسبابِ سرکشی ہندوستان (دو عکسی نقول)، آگرہ: مفصلائٹ پریس، 1859ء

☆ سرسید احمد خاں، تذکرۂ اہلِ دہلی (مرتبہ: قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 1965ء

☆ سرسید احمد خاں، سرکشی ضلع بجنور 1۔ (عکسی نقل، آگرہ: مفصلائٹ پریس، 1858ء

...ایضاً 2...۔ (مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی: سلمان اکیڈمی، 1962ء

ایضاً 3۔ (مرتبہ: شرافت حسین مرزا، دہلی: ندوۃ المصنفین، 1964ء

☆ سید احمد خاں، سر، سیرتِ فریدیہ،
1۔ (عکسی نقل،) آگرہ: مطبع مفید عام، 1892ء
...ایضاً. 2..۔ (مرتبہ: حکیم محمود احمد برکاتی)، کراچی: پاک اکیڈمی، 1964ء
ایضاً3 ۔ (مرتبہ: حکیم محمود احمد برکاتی)، کراچی: قرطاس، 2009ء
☆ سر سید احمد خاں، شکریہ مراد آباد کے مسلمانوں کا عکسی نقل، میرٹھ: مفصلائٹ پریس، 1859ء
☆ سر سید احمد خاں، لائل محمڈنز آف انڈیا رسالہ خیر خواہ مسلمانان، جلد اوّل تا سوم مطابق طبع اول مطبوعہ میرٹھ، 1860-1861ء، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1998ء
☆ سر سید احمد خاں، ہنٹر پر ہنٹر ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں، لاہور: اقبال اکیڈمی، 1949ء
☆ سر سید احمد خاں، فقرات سرسید، (مرتبہ: حکیم محمد حسین خاں شفا)، حیدر آباد، انڈیا: اردو ریسرچ سنٹر، 1988ء
☆ سر سید احمد خاں، قواعد صرف و نحو زبانِ اردو (مرتبہ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)، کراچی: ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، 1990ء
☆ سر سید احمد خاں، کتابِ فقرات عکسی نقل، میرٹھ: مطبع ضیائی، 1871ء
☆ سر سید احمد خاں، آخری مضامین (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی، احمد بابا مخدومی)، لاہور: کوآپریٹو پرنٹنگ پریس، س۔ن
☆ سر سید احمد خاں، انتخابِ مضامینِ سرسید،
1۔ علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، 1927ء
.ایضاً2...۔(تعارف: محمد علیم الدین سالک)، لاہور: ملک ہاؤس، س۔ن
...ایضاً3...۔تعارف: محمد شمیم، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1960ء
☆ سر سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، جلد دوم، (مرتبہ: اصغر عباس)، لکھنؤ: اتر

پردیش اردو اکادمی، 1969ء

☆ سرسید احمد خاں، سرسید کا آئینۂ خانۂ افکار، (مرتبہ: سید ابوالخیر کشفی)، کراچی: فضلی سنز، 1998ء

☆ سرسید احمد خاں، سرسید کی اسلامی بصیرت، (مرتبہ جمال خواجہ)، علی گڑھ: نیو علی گڑھ موومنٹ، 1987ء

☆ سرسید احمد خاں، سرسید کی تعزیتی تحریریں، (مرتبہ: اصغر عباس)، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1989ء

☆ سرسید احمد خاں، مسافران لندن،

1۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، 1961ء

... ایضاً 2 ...۔ (مع پیش لفظ ظلِ احمد نظامی)، کراچی: علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، 1996ء

☆ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، (مرتبہ: ڈاکٹر عبدالروف شیخ)، ملتان: بیکن بکس، 2000ء

☆ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، (مرتبہ: محمد عبداللہ خاں خویشگی)، علی گڑھ: نیشنل پرنٹر کمپنی، 1952ء

☆ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سرسید، (مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، جلد اول 1984ء

...ایضاً... جلد دوم: 1984ء

...ایضاً... جلد سوم: 1984ء

...ایضاً... جلد چہارم: 1988ء

...ایضاً... جلد پنجم: 1990ء

...ایضاً... جلد ششم: 1990ء

...ایضاً... جلد ہفتم: 1991ء

۔۔ایضاً۔۔۔ جلد ہشتم: 1991ء
۔۔۔ایضاً۔۔۔ جلد نہم: 1992ء
۔۔۔ایضاً۔۔۔ جلد دہم: 1992ء
۔۔ایضاً۔۔ جلد یازدہم: 1992ء
۔۔ایضاً۔۔۔ جلد دوازدہم: 1993ء
ایضاً جلد سیزدہم: 1993ء
ایضاً جلد چہاردہم: 2006ء
۔۔ایضاً۔۔ جلد پازدہم: 2007ء
۔۔ایضاً۔۔۔ جلد شانزدہم: 2007ء

☆ سرسید احمد خاں،نظریاتِ سرسید، (مرتبہ: ڈاکٹر شاہد مختار)، لاہور: شاہد پبلشرز،س۔ن

☆ سرسید احمد خاں خطباتِ سرسید، (مرتبہ. شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، اول،1972ء
۔۔ایضاً۔۔۔ جلد دوم1973ء

☆ سرسید احمد خاں، سید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب، (مرتبہ. شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، لاہور. مجلسِ ترقی ادب،1973ء

☆ سرسید حمد خاں، لیکچر اسلام مکمل مجموعۂ لیکچرز و اسپیچز محمد امام دین گجراتی، لاہور مصطفائی پریس،1900ء

☆ سرسید احمد خاں، خطوطِ سرسید، مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور مجلسِ ترقی ادب،1995ء

☆ سرسید احمد خاں، خطوطِ سرسید، مرتبہ: سرراس مسعود، بدایوں. نظامی پریس، 1931ء

☆ سرسید احمد خاں، مکاتیب سرسید احمد خاں، (مرتبہ: مشتاق حسین)، لاہور:

ستار بک ڈپو، س۔ن
☆ سرسید احمد خاں، مکتوباتِ سرسید، (مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، 1959ء
...ایضاً... طبع دوم جلد اول: 1976ء
جلد دوم: 1985ء
☆ سرسید احمد خاں، رسالہ علاج ہیضہ، لاہور: مسعود پبلی کیشنز، س۔ن
☆ سرسید احمد خاں، سرسید احمد خاں بحیثیت ایک ہومیو پیتھ، (مرتبہ: محمد ایاس مسعود)، لاہور: سوسائٹی آف ہومیوپیتھس، 1993ء
☆ سرسید احمد خاں، کانشنس اور نبوت، لاہور: زمیندار اسلیم پریس، س۔ن
☆ سرسید احمد خاں، مضمون نسبت تنزلِ علومِ دینیہ، (عکسی نقل)، آگرہ: مفید عام پریس، 1897ء
☆ سرسید و علی گڑھ تحریک: منتخب کتابیات، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، 2002ء
☆ سلیمان اشرف، سید، السّبیل، لاہور: ادارہ پاکستان شناسی، 2014ء
☆ سی۔ایف اینڈریوز (مترجمہ۔ضیاء الدین احمد برنی)، تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی، کراچی: تعلیمی مرکز، س۔ن
☆ سی۔ڈبلیو۔ٹرول، (مترجمہ: قاضی افضل حسین)، سرسید احمد خاں: مسلم دینیات کی تعبیرِ نو، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، 2015
☆ سی۔ڈبلیو ٹرول (مترجمہ: قاضی افضل حسین، ڈاکٹر/ محمد اکرام چغتائی)، سرسید احمد خاں: فکرِ اسلام کی تعبیرِ نو، لاہور: القمر انٹر پرائزز، 1998ء
☆ شاہد رزاقی، سرسید اور اصلاحِ معاشرہ، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 1963ء
☆ شمیم احمد، زاویۂ نظر، کوئٹہ: روبی پبلشرز، 1987ء

☆ شمیم احمد، ۲+۲=۵، کوئٹہ: زمرد پبلشرز، 1992ء
☆ شمیم حنفی / سہیل فاروقی، سرسید سے اکبر تک، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1995ء
☆ شیر زمان، سرسید، جناح، مشرقی، راولپنڈی: مدنی پبلی کیشنز، 1990ء
☆ صدیقہ ارمان، سرسید تحریک کا ردعمل، کراچی: سرسید یونی ورسٹی پریس، 1999ء
☆ صفدر سلیمی، پاکستان کا معمار اول، لاہور: ادارہ طلوع اسلام، 1967ء
☆ ضیاء الدین لاہوری، سرسید اوران کی تحریک.. نقد و نظر کی میزان میں، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2007ء
☆ صلاح الدین احمد، سرسید پر ایک نظر، لاہور: اکادمی پنجاب، 1960ء
☆ ضیاء الدین انصاری، محمد، مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1992ء
☆ ضیاء الدین لاہوری، آثار سرسید، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2007ء
☆ ضیاء الدین لاہوری، خودنوشت افکارِ سرسید،
1۔ کراچی: فضلی سنز، 1998ء
2۔ لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2010ء
☆ ضیاء الدین لاہوری، خودنوشت حیاتِ سرسید،
1۔ لاہور: جنگ پبلشرز، 1993ء
2۔ کراچی: فضلی سنز، 1998ء
3۔ لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2005ء
4۔ نئی دہلی: عاکف بک ڈپو، 2005ء
☆ ضیاء الدین لاہوری، سرسید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی،
1۔ کراچی: ادارہ تصنیف و تحقیق، 1982ء

2۔ لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2010ء

☆ ضیاء الدین لاہوری، کتابیاتِ سرسید،
1۔ لاہور: مجلسِ ترقی ادب، 2008ء
2۔ لاہور: علم و عرفان پبلشرز، 2015ء

☆ ضیاء الدین لاہوری، نقشِ سرسید،
1۔ کراچی: دار الفکر، 1998ء
2۔ لاہور: دار الکتاب، 2004ء
3۔ لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، 2006ء

☆ طاہر تونسوی، سرسید شناسی، لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، 2002ء

☆ طارق محمود، سرسید احمد خاں، جہلم: بک کارنر، 1988ء

☆ طاہر نسیم، سرسید اور اردو صحافت، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1980ء

☆ ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، 1990ء

☆ عائذہ قریشی، اشاریہ سرسید، لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، 2003ء

☆ مولوی عبدالحق، سرسید احمد خاں: حالات و افکار، کراچی: انجمن ترقی اردو، 1975ء

☆ عبدالحق و دیگر، مطالعہ سرسید احمد خاں، لاہور: لرائیں ٹریڈرز، س۔ن

☆ عبدالحمید قدرت اللہ، تین محسنینِ قوم، مجلہ ''سپوتنک'' لاہور، ستمبر 2003ء

☆ عبدالحیٔ، اردو صحافت اور سرسید احمد خاں، لاہور: فکشن ہاؤس، 2011ء

☆ عبدالسلام خورشید، سرسید احمد خاں، لاہور: قومی کتب خانہ، 1963ء

☆ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی اردو نثر کا فکری اور فنی جائزہ، لاہور: مکتبہ کارواں، 1960ء

☆ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1977ء

☆ عطاء الرحمٰن خاں، سرسید تحریک اور اردو کے نثری زاویے، لاہور: گوہر پبلشرز، 1998ء

☆ علی بخش خاں بدایونی، شہاب ثاقب عکسی نقل، لکھنؤ مطبع نول کشور، 1289ھ مطابق 1873ء

☆ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2003ء

☆ سید علی، النبوۃ حصہ اول، لکھنؤ مفید عام پریس، س۔ن

☆ محمد عمر الدین، سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 1995ء

☆ مرزا غلام احمد قادیانی، برکات الدعا، قادیان: مطبع ریاضِ ہند، 1310ھ مطابق 1892ء

☆ محمد فاروق دیوا، سرسید اور شبلی، سری نگر: گلشن پبلی کیشنز، 1999ء

☆ چوہدری فتح دین، کے۔ایل۔رلیارام، سرسید احمد خاں، لاہور: کریمی پریس، س۔ن

☆ مولوی عبدالعزیز/ تحریر مولوی محمد لدھیانوی، فتویٰ: نصرۃ الابرار، لاہور: مطبع صحافی، 1306ھ، مطابق 1888ء

☆ فقیر احمد فیصل، انتخاب آلِ احمد سرور، لاہور: لاہور اکیڈمی، س۔ن

☆ فقیر احمد فیصل، انتخاب احتشام حسین، لاہور: لاہور اکیڈمی، س۔ن

☆ ڈاکٹر فوق کریمی، سرسید کے سیاسی افکار، لاہور: ایشیا بک سنٹر، 1990ء

☆ قاسم میاں۔حاجی الدلائل القاہرہ الکفرۃ النیاشرہ، بمبئی (ممبئی) مطبع سلطانی، 1942ء

☆ قاسم نانوتوی، محمد، تصفیۃ العقائد، کراچی: دارالاشاعت، 1976ء
☆ قاضی احمد اختر جونا گڑھی، سرسید کا علمی کارنامہ، کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، 1964ء
☆ قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک، لاہور: نگارشات، 1986ء
☆ ڈاکٹر قدسیہ خاتون، سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃِ ثانیہ، الہ آباد، کتابستان، 1981ء
☆ قمرالہدیٰ فریدی، سرسید اور اردو زبان و ادب، لکھنؤ: حکومتِ اتر پردیش، 1989ء
☆ ڈاکٹر کریم الدین احمد، تنقیدی تحریریں، لاہور آئینۂ ادب، 1983ء
☆ ڈاکٹر کلیم صدیقی، مغرب کے زیرِ اثر مسلمانوں کا سیاسی مسلک فکر و عمل، لندن: مسلم انسٹی ٹیوٹ، س۔ن
☆ کلیم نشتر، ہمارے سرسید، لاہور: نیشنل بک ہاؤس، س۔ن
☆ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، یادگارِ سرسید، اسلام آباد: مجلس فروغِ تحقیق، 1996ء
☆ ڈاکٹر مبارک علی، المیہ تاریخ، لاہور: پروگریسو پبلشرز، 1993ء
☆ مجاہد حسین، سرسید شناسی۔ مبالغے اور مغالطے، لاہور، نشریات، 2017ء
☆ ڈاکٹر سید محبوب شاہ، سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، کراچی: سرسید یونی ورسٹی پریس، 2000ء
☆ سید مسعود الحسن زیدی، علی گڑھ کی یادیں علی گڑھ کی باتیں، لاہور: مصنف، 1990ء
☆ ڈاکٹر مشتاق احمد، سرسید کی نثری خدمات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005ء
☆ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک۔ سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، 1993ء

☆ سید مقبول احمد، اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید کا مرتبہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1931ء

☆ منصور احمد بٹ، سرسید احمد خاں: بانی نظریۂ پاکستان، لاہور: روبی پبلی کیشنز، 2005ء

☆ میر ولایت حسین، میرے پچاس سال علی گڑھ میں، کراچی: اورینٹ پبلشرز، 1973ء

☆ میر ناصر علی دہلوی، مرتبہ: سید انصار ناصری، مقاماتِ ناصری، کراچی: انجمن ترقی اردو، 1969ء

☆ نجابت علی، مترجم: سید ابوالحسنات، سرسید احمد خاں، نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، 1979ء

☆ ڈاکٹر نسیم عباس احمر، سرسید شناسی کی چند اہم زاویے، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 2011ء

☆ محمد یسین مظہر صدیقی، سرسید اور علومِ اسلامیہ، علی گڑھ: ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی، 2001ء

English Books:

☆ Abdul Khaliq, Dr., ***Sir Syed Ahmad Khan on Nature***, Lahore: Man and God,Bazm.e Iqbal, 1993

☆ B A Dar, ***Religeous Thoughts of Sir Syed Ahmad Khan***, Lahore: Instt of Islamic Culture, 1970

☆ Baljaon, J. M. S , Jr, ***The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid***, Lahore. Sh. M. Ashraf, 1964

☆ Begum Naz, ***Sir Syed Ahmad Khan***, Islamabad. National Bokk Foundation, 1992

☆ Graham, G F I., ***The Life and the work of Sir Syed***, Karachi: Oxford University Press, 1974

☆ Haali, Altaf Hussain, K.H Qadri & David J Mathews (Translater), ***Hayat e Javed,*** Delhi Idara i Adbiat i Delhi, 1979

☆ Hadi Hussain, M ***Syed Ahmad Khan: Pioneer of Muslim Resurgence***, Lahore: Instt of Islamic Culture, 1970

☆ Hafeez Malik, ***Political Profile of Sir Syed Ahmad Khan***, Islamabad: Islamic University, (2004)

☆ Hafeez Malik, ***Sir sayyid Ahmad Khan's Educational Philosophy***, Islamabad National Instt of History and Cultural Research, 1989

☆ Ismail Panipati, Sh. ***Letters to and from Sir Syed Ahmad Khan***, Lahore. Board of the Advancement of Literature, 1982

☆ Maulana Zafar Ali Khan, ***A Mono graph of Sir Syed Ahmad Khan***, Lahore: Maulana Zafar Ali Khan Trust, 2016

☆ Mubarak Ali, Sh ***Life of Muhammad***, Reweiw on Dr Hunter's ***Indian Muslims***, Lahore. Premier Book House, 1979

☆ Nizami, K A, ***Sayyid Ahmad Khan***, Delhi. Govt of

India, 1980

☆ Nizami, Umar and Arif, ***Reflections of Sir Syed and the Aligadh Movement***, Karachi: Fazlee Sons, 1998

☆ Rehmani Begum, Dr., ***Sir Syed Ahmad Khan:The Politics of Educational Reforms***, Lahore: Vanguard Books, 1985

☆ Sadiq, M. ***The Founder of Aligadh***, Karachi: Oxford University Press, 1968

☆ Salman Al Din Qureshi, ***Correspondece of Sir Syed Amhad Khan and his contempararies***, Lahore: Sang e Meel Pblications, 1988

☆ Shah Din, M. ***The Living Influence of the Dead***, Ilahabad: Imperial Press, 1902

☆ Shamim Anwar, ***Sir Syed Ahmad Khan as an Educationist***, Lahore: Annor Printers and Publishers, 1987

☆ Shan Muhammad, ***Successors of Sir Syed Ahmad Khan***, Dehli: Idarah-i-Adbiyat-i- Delhi, 1981

☆ Shan Muhanmad, ***Sir Syed Ahmad Khan:A Political Biography***, Lahore: Universal Books, 1976

☆ Theodre Beok, ***The Present State of Indian Plitics,*** Lahor: Sang e Meel Pblications, 1982

☆ Yousaf Abbas, Muhammad, ***Muslims Politics and***

Leadership:South Asia 1876-92, Islamabad: Instt of Islamic History,Culture and Civilization, Islamic University, 1981

رسائل و جرائد

☆ آج کل، دہلی، انیس نمبر، 1957ء
☆ اردو، کراچی، جولائی۔ ستمبر 1990ء
☆ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، جون 1910ء
☆ العلم (سہ ماہی)، بمبئی، اگست 1994، 1992ء
☆ العلم، کراچی (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس)، جنوری تا مارچ 1993ء، اپریل تا جون 1998ء
☆ ایوانِ اردو، نئی دہلی، نومبر 1998ء
☆ برگِ گل، کراچی، (کراچی: اردو کالج)،
1۔ نقشِ اوّل: 1955ء
2۔ نقشِ دوم: 1969ء
☆ پیامِ اسلام، لکھنؤ، دسمبر 1956، جون 1998ء
☆ پیامِ عمل، لاہور، انیس نمبر، 1973ء
☆ تہذیب، کراچی، اکتوبر 2017ء
☆ تہذیب، کراچی، (کراچی: مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن)، مارچ 1998ء
☆ تہذیب الاخلاق، لاہور، (لاہور: تہذیب الاخلاق ٹرسٹ)، مارچ 1998ء
☆ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی)
1۔ اکتوبر 1987ء
2۔ اکتوبر 1988ء

3۔اکتوبر 1989ء

4۔مارچ۔اپریل 1998ء

5۔اکتوبر 1998ء

6۔اکتوبر 2008ء

7۔اکتوبر 2012ء

8۔اکتوبر 2013ء

☆ رثائی ادب، (سہ ماہی)، کراچی، اپریل 1996ء

☆ زمانہ، کان پور، اکتوبر 1908ء، جنوری 1978ء

☆ سرفراز، لکھنؤ، انیس نمبر، 1972ء

☆ عالمی سہارا، نئی دہلی، 1۔ 27 اکتوبر 2007ء

2۔ 25 اکتوبر 2008ء

☆ قومی زبان، کراچی، (کراچی: انجمن ترقی اردو)، اپریل 1998ء

☆ ماہِ نو، لاہور، انیس نمبر، 1972ء

☆ مجلہ خیال و فن، لاہور: ادارہ خیال و فن، 2015ء

☆ مجلّہ صحیفہ، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، جنوری تا جون 2015ء

☆ مجلّہ کریسنٹ، لاہور: اسلامیہ کالج، 1969ء

☆ مسلک، ملتان، (ملتان: گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن)، 2000ء

☆ نقوش، لاہور، انیس نمبر 1981ء

☆ نگار، کراچی، حصہ اول: نومبر۔ دسمبر 1970ء

حصہ دوم: جنوری تا فروری 1971ء

☆ نگار، کراچی، انیس نمبر 1971ء

☆ نیا دور، لکھنؤ، جنوری 1963ء، جون 1979ء

☆ ہمایوں، لاہور، نومبر 1940ء

غیر مطبوعہ مقالات Un-Published Thesis

☆ آمنہ۔ ایم۔ صدیقی، سرسید بحیثیت مضمون نگار، مقالہ برائے ایم۔ اے اردو۔ کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، س ن

☆ انور بانو، سرسید احمد خاں کا سوانحی و کتابیاتی مطالعہ، مقالہ برائے ایم۔ اے۔ لائبریری سائنس، کراچی: شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ کراچی، ۱۹۷۲ء

☆ بدر سلطانہ مرزا، سرسید احمد خاں بحیثیت ادیب، مقالہ برائے ایم۔ اے اردو، کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۵۷ء

☆ شاہ، سید محبوب، سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، مقالہ برائے، پی ایچ۔ ڈی، کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۹۰ء

☆ ضیغم یزداں، سید، سرسید کی طنز و ظرافت، مقالہ برائے ایم۔ اے۔ اردو، کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۵۶ء

☆ عائشہ ناز، سرسید اور تعلیم نسواں، مقالہ برائے ایم۔ اے اردو، کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۲۰۰۵ء

☆ کوثر، ڈاکٹر اے ایچ، اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کار کا حصہ، مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، کراچی: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، ۱۹۸۳ء

Websites:

1. www.rekhta.com
2. www.urdupoint.com
3. www.urduweb.com